تخلیق

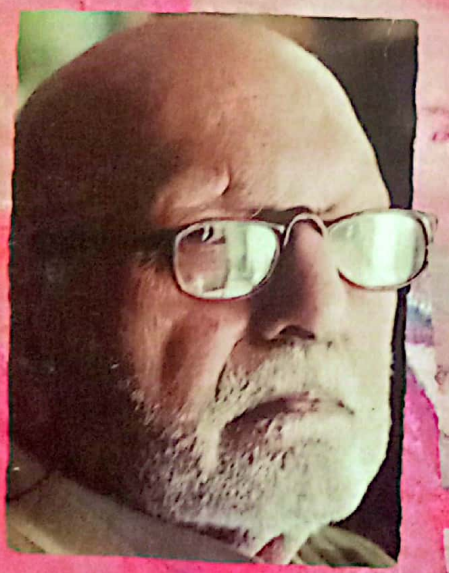

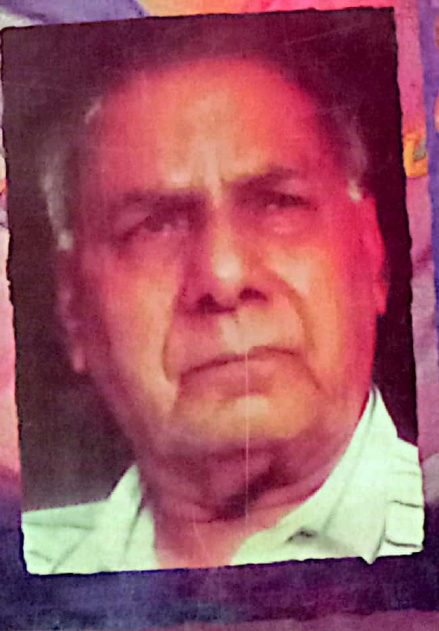

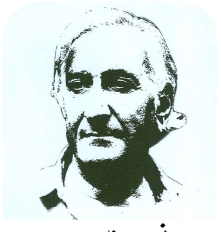

بانی مدیر اظہر جاوید
عرصہ ادارت 2012 - 1969ء
(صدارتی ایوارڈ یافتہ)

مسلسل اشاعت کا 45واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 45 | ستمبر 2014ء | شمارہ : 9 | CPL نمبر 96

قیمت فی پرچہ : 150روپے ..... 750روپے سالانہ (بمعہ ڈاک خرچ)

(سالانہ 100ڈالر بیرون ممالک..... ہندوستان کے لیے 1,200روپے سالانہ) (بمعہ ڈاک خرچ)

نمائندگان خصوصی

نیّر جہاں (امریکہ) ..... تاشی ظہیر (امریکہ) ..... نارنگ ساقی (انڈیا) ..... جاوید منظور (پاکستان)

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236626008۔04236671007.....موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان..... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود..... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔(انشا اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اُسلوبی سے کام کر رہا ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔یورپ اور امریکہ کے لئے زرِتعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِسالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

PAKISTAN
Javed Manoor
76-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: 0423751232
Cell : 0300-8406327
Email:upindustry@hotmail.com

o بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط o

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمدِ باری تعالیٰ — ڈاکٹر علی عباس امید — 7

نعت رسولِ مقبولؐ — محمد سبطین شاہجہانی — 7

ایک شام تخلیق کے ساتھ

ساحر لدھیانوی ایوارڈ — شاہد بخاری — 8

مضامین

مہاپرش۔ کیول دھیر — ڈاکٹر ابدال بیلا — 11

سعید صورتوں کا مصنف..... — منور عثمانی — 18

بیاد اظہر جاوید — ڈاکٹر ناصر مستحسن — 24

منظومات

امین راحت چغتائی، ایوب خاور، مظفر ایرج، منظر ایوبی، بشریٰ رحمٰن، پروین شیر، ظفر علی راجا، طاہر سعید ہارون، جاوید زیدی، فوقیہ مشتاق، شہزاد نیر، عبیرہ احمد — 27 | 32

افسانے

موسمِ بہار میں سوکھی ٹہنیاں — رشید امجد — 33

مِیٹ مال — بشریٰ رحمٰن — 38

عزم — نثار احمد صدیقی — 43

اندیشہ — احمد زین الدین — 46

اُلٹا ناچتے بگولوں کی جل پریاں — ڈاکٹر زین سالک — 50

اپسرا — صائمہ نورین بخاری — 54

شارٹ کٹ — تسنیم کوثر — 60

افسانہ پھاڑ دو — اسلم سحاب ہاشمی — 64

پنشن — جمیل حیات — 68

کتنے اچھے دن تھے — اظہر جاوید — 70

غزلیں

سید مشکور حسین یاد، ناصر زیدی، ڈاکٹر کنول فیروز، حفیظ انجم نگری، شاہین، نثار ترابی، گوہر کریم نگری، ارمان نجمی، ابصار عبدالعلی، محمد ممتاز راشد، کرامت بخاری، اسد بیگ، امتیاز کاظمی، ریاض ندیم نیازی، رشیدہ عیاں، محمد نصیر ہمایوں، پروین سجل، فرحین چودھری، منور سلطانہ، ڈاکٹر مقصودہ حسین، غلام شبیر اسد، قمر علوی، علی اعظم بخاری، احمد حجازی، قاسم خیال، رؤف ایاز — 73 | 85

انٹرویو

ایک مصاحبہ — (ماریہ سہیل) — 86

ڈاکٹر امجد پرویز سے گفتگو — (سحر حفیظ) — 91

انشائیہ

غم — ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش — 97

خاکہ

میرا ہمراز تاشی ظہیر — اظہر جاوید — 99

یادنگاری

عاشقی صبر طلب..... — رشید امجد — 103

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک..... علی سفیان آفاقی 109

سفرنامہ

سورج کے رُخ پر ڈاکٹر ابدال بیلا 115

طنز ومزاح

ٹیئر ولو جی ڈاکٹر معین قریشی 119

جائزے

گوپی چند نارنگ..... محمد متین ندوی 123

سورج کے آس پاس..... حسن عسکری کاظمی 126

تخلیق۔ڈاکٹر نجمہ شاہین..... ڈاکٹر محسن مگھیانہ 128

پُرآشوب شہر گرہن دل نواز دلؔ 130

ساقی ہو تیری خیر تیرے..... حسین احمد شیرازی 133

تنہائی کا ناول نگار..... محمد ساجد 137

پنجاب رنگ

احسان رانا، منزہ شاہد، جاوید احسن، گلفام نقوی 139

تبصرے انور سدید کے

چند سیپیاں سمندروں سے (پروین شیر) 141

آبشارِ ادب (بی ڈی کالیہ ہمدم)

منٹو غالب کا پرستار (پرویز انجم)

سرِ بازاری رقصم (صابر ظفر) 145

چند ادبی رسائل انور سدید کی نظر میں

انتساب (سیفی سرونجی) انڈیا 146

شاداب (کنول فیروز) پاکستان 147

تبصرے آفتاب خان کے

کچھ دیکھے کچھ سُنے (نند کشور وکرم) 148

خدا سب یاد رکھتا ہے (آصفہ نشاط)

شب تاب (حسن عسکری کاظمی)

ورثہ دانش یونان (ظفر سپل) 150

انجمن خیال (خطوط)

عبداللہ حسین، محمود شام، ڈاکٹر انور سدید، آصف ثاقب، بشریٰ رحمان، ڈاکٹر معین قریشی، قیصر نجفی، سلیم آغا قزلباش، کرامت بخاری، ولی عالم شاہین، آصفہ نشاط، سکندر حیات میکن، مظفر حسن منصور، نجیب عمر، رشید آفرین، مشتاق احمد، ابراہیم عدیل 151 167

تخلیق کو موصول رسائل 168

سرورق مصوری

پروین شیر (کینیڈا)

ناشر سونان اظہر جاوید

طابع بیدار سرمدی

قانونی مشاورت لطیف قریشی، سیّد شاہد بخاری

مطبع بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk,
Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

o بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط o

پہلی بات

اپنے والدِ محترم اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کی وفات (فروری 2012ء) کے بعد میں نے ان کی اس ادبی یادگار کو زندہ رکھنے کی کوشش کی تو ان کے دوستوں نے میرے ساتھ بھرپور مخلصانہ تعاون کیا اور ''تخلیق'' کو ارتقا کا اگلا قدم اُٹھانے اور اشاعت کا سلسلہ قائم رکھنے میں میری معاونت کی۔ اب پسِ پردہ اس معنوی تبدیلی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ میں نے ''تخلیق'' میں اللہ تعالیٰ جلیل و کریم کی وحدانیت اور کبریائی اور نبی آخر الزماںؐ کی حیاتِ مبارکہ اور سیرۃ طیبہ کے عقیدت مندانہ اظہار کے لیے حمد و نعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اظہر جاوید کے دینی جذبات و احساسات ''تخلیق'' کے قارئین سے پوشیدہ نہیں، ان کے کئی دوستوں نے لکھا ہے کہ ادبی تقاریب کے دوران نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے اور پہلے فریضۂ نماز ادا کرتے۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ دفترِ ''تخلیق'' میں ادبی بحث کا بازار گرم ہے اور اظہر جاوید نے اُٹھ کر ایک کونے میں مصلیٰ بچھایا اور نماز کا فریضہ ادا کیا۔ میں نے ایک مرتبہ دریافت کیا آپ ''تخلیق'' میں نعت کیوں نہیں چھاپتے؟'' میرا سوال سُن کر ان پر کپکپی طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جب طبیعت بحال ہوئی تو بولے ''ایک ترقی پسند ادبی رسالے کے مدیر نے لکھا تھا کہ انہوں نے نعت چھاپی تو پھر بھجن بھی چھاپنے پڑیں گے۔ میں نے ان کا یہ مؤقف پڑھا تو ''تخلیق'' میں نعتیں پیش کرنے کا پختہ فیصلہ کر لیا لیکن مجھے ایک بڑے شاعر کی جو پہلی نعت ملی اسے پڑھ کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ اشعار وہ کچھ عرصہ پہلے ٹی وی کے مشاعرے میں غزل کے طور پر پیش کر چکے تھے۔ اب اس غزل کو نعت شمار کر رہے تھے۔ شاعر موصوف کی اس جسارت پر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے، اندر سے آواز آئی .....''احتیاط! اظہر جاوید! احتیاط.....'' اور میں نے غلطی کے امکان سے بچنے کی کوشش کی۔'' دوسری طرف میرا احساس یہ تھا کہ میں نے ''تخلیق'' کے ابتدائی صفحات پر حمد و نعت پیش کی تو اسے بے پایاں پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور جب اس گہنگار بندے اور اس کی بیگم سعدیہ سونان کو عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی تو ہم دونوں نے اسے اللہ تعالیٰ کا انعام اور ''تخلیق'' میں حمد و نعت کی اشاعت کا ثمر تسلیم کیا اور اس سلسلے کو ''تخلیق'' میں مزید فروغ دینے کا عہد کر لیا جس پر میں قائم ہوں۔ لیکن اب توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی گئی ہے کہ بعض شاعروں نے نعت نبویؐ کے مقدس تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس لیے ''تخلیق'' کے ادارتی بورڈ نے احتیاط کی روش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اب صرف ایک حمد اور ایک نعتیہ نظم پر اکتفا کیا جائے گا اور انتخاب ملک کے ممتاز نعت نگاروں سے کرایا جائے گا۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ اس اقدام کو شرفِ پذیرائی عطا کریں گے۔ حمد و نعت نگاری میں جو عیوب در آئے ہیں ''تخلیق'' اِن کے تدارک کے لیے ایک تحریک کا آغاز بھی کر رہا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حمد و نعت کے تقدس کو مجروح نہ ہونے دیا جائے اور ان کے روحانی تاثر کو فروغ دیا جائے۔

اہلِ ادب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ میڈیا کے فروغ کے دور میں ادبی رسالہ اب بک سٹال پر بالعموم فروخت نہیں ہوتا۔ غنیمت ہے کہ چند کالم نگار رسالے کی اشاعت پر اس کی خبر ادبی صفحے پر اور اس کا تبصرہ اپنے کالم میں شائع کر دیتے ہیں۔ **جناب ظفر اقبال، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر انور سدید اور جناب ناصر بشیر** یہ خدمت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ **جناب ظفر اقبال اور امجد اسلام امجد** نے گذشتہ دنوں بے شمار رسائل کا ذکر اپنے کالم میں کیا لیکن ''تخلیق'' کو دانستہ نظر انداز کر دیا۔ جب کہ ان کی ادبی پرموشن میں ''تخلیق'' نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور دوسری طرف اب ''تخلیق'' کا شمار اُردو کے ان عہد ساز رسائل میں ہوتا ہے جو گزشتہ 45 برس سے باقاعدگی سے چھپ رہے ہیں۔ اور اُردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان اصحاب کا اغماض ہمارے لیے اور قارئین تخلیق کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ یہ دو نامور شعرا ''تخلیق'' میں ترک و احتشام سے چھپتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ کالم نگار حضرات ''تخلیق'' کی 45 سالہ مسلسل اعلیٰ خدمات کو نظر انداز نہ فرمائیں۔ یہاں اس بات

کا ذکر بھی ضروری ہے کہ میں نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا گروپوں میں بٹے ہوئے ادیبوں کو ''تخلیق'' میں یکجا کرنے اور اس قبیح گروہ بندی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے مجھے کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ پاکستان میں ادب کی فضا کو بہتر بنانے کے لیے ''تخلیق'' کی اس کاوش کی تحسین ہونی چاہیے۔

میں نے گزشتہ پرچے کے اداریے میں **جناب خورشید بیگ میلسوی اور تاشی ظہیر صاحب** کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا تھا کہ انہوں نے ''تخلیق'' کی اشاعت کو وسعت دینے کے لیے دستِ کرم کشادہ کیا اور اسے بہت سے خریدار فراہم کیے۔ ان میں **سکندر حیات میکن صاحب** بھی شامل تھے جن کے نام کی جگہ ایک اور نام درج ہو گیا۔ میں سکندر حیات صاحب سے معذرت خواہ ہوں اور ان کی گراں قدر خدمت کے لئے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ادب کی خدمت کا جداگانہ انداز اختیار کیا۔ جس کی تقلید دوسرے اصحاب بھی کر سکتے ہیں۔

اس تابندہ مثال کو اس ماہ منور کرنے میں **ڈاکٹر جاوید اختر زیدی** نے بھی اہم کردار ادا کیا وہ والد صاحب کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے مجھے ان کے حوالے سے زیادہ علم نہیں تھا اور نہ میرا اُن سے کبھی رابطہ ہو سکا اس کے باوجود اپنے دوست کے نام کو زندہ رکھنے کی کاوش میں میرا ساتھ دینے کے لئے انھوں نے خصوصی طور سے 100 ڈالر کا چیک ارسال کیا جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔ اسی طرح اندرون ملک سے بھی بہت سے ایسے احباب جنہوں نے ''تخلیق'' کے ساتھ بھرپور مالی اور قلمی تعاون کیا ہے۔ **ملک مقبول احمد** (ڈائریکٹر مقبول اکیڈیمی)، **سیّد مشکور حسین یاد، نثار ترابی، اکرام تبسم بریگیڈیئر محمد دین ملک، نجم الحسن رضوی، ڈاکٹر خواجہ ذکریا، جمیلہ شبنم، سیما پیروز، تسنیم منٹو اور بشریٰ اعجاز**۔ بیرون ملک سے **محترم تاشی ظہیر، لطیف قریشی، محترمہ نیّر جہاں، پروین شیر، رشیدہ عیاں، آصفہ نشاط، خالدہ احسان، نجمہ عثمان، فوقیہ مشتاق** اور اشتہارات کے حوالے سے **جاوید منظور** (یو۔پی انڈسٹری)، **ملک محمد جاوید** (سیکا پینٹ)، **چودھری اشفاق** (نیشنل بینک)، **شجاعت علی بیگ** (حبیب بینک)، **علی ساجد** (ہمدرد انڈسٹری) اور **ستّار صاحب** (کوہ نور انڈسٹری) نے سرگرم معاونت کی۔ ان تمام احباب کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے بغیر کسی غرض کے صرف ''تخلیق'' کو مستحکم بنانے کے لیے بھرپور تعاون کیا۔ تصویر کا دوسرا رُخ اس سے بہت مختلف اور تکلیف دہ ہے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اگر سالانہ خریداری کے حوالے سے کہا جائے تو وہ اس بات کو طعنہ سمجھتے ہیں۔ اور اکثر اسے ادب کی فروخت کا نام دیتے ہیں۔ ان کے لئے کسی پرچے کی سالانہ خریداری کا مطلب ان کا ادبی رُتبہ گرانا اور رقم کا ضیاع ہے۔ ہاں اگر ان کا کلام یا کوئی دیگر چیز زیرِ طبع ہو جائے تو وہ صرف وہی شمارہ خریدنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ پرچہ پڑھنے والے اپنی تحریر کے علاوہ کسی دوسری تحریر سے کیوں غرض نہیں رکھتے جبکہ ایک ادیب کے لیے شاعر کے لئے مطالعہ ذہن کی کشادگی اور وسعت کا بہترین وسیلہ ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے!

''تخلیق اشاعت گھر'' کے قیام کو اہلِ ادب نے جو اعتماد عطا کیا ہے اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ متعدد ادیبوں نے اپنی کتابیں ہمارے ادارے سے چھپوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن میں اس کا آغاز اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہو گئی'' کے اُردو ترجمے سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں حنیف باوا صاحب کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے اظہر جاوید کے پنجابی افسانوں کی روح کو قائم رکھتے ہوئے انہیں اُردو کا روپ دیا اور ''تخلیق'' کے قارئین کے وسیع حلقے میں انہیں پسند کیا گیا۔ ساتھ ہی اظہر جاوید کے تحریر کردہ مشہور شخصیات کے خاکوں کی کتاب مرّتب کی جا رہی ہے جو ''تخلیق اشاعت گھر'' سے شائع کی جائے گی۔ **حنیف باوا صاحب** کو رسالہ ''چہارسو'' (راولپنڈی) نے گزشتہ ماہ ''قرطاس اعزاز'' پیش کیا ہے جو ان کی ادبی خدمت کا قیمتی ثمر ہے۔ حنیف باوا صاحب مبارکباد۔ صد مبارکباد۔ یہ ''قرطاسِ اعزاز'' سرکاری ٹین کے تمغے سے کروڑ درجہ بہتر ہے۔

رب راکھا..... **سونان اظہر جاوید**

◆◆◆

ڈاکٹر علی عباس امیدؔ (انڈیا)

حمدِ باری تعالیٰ

سر بہ سجدہ ہے قلم کیسے تمنّا لکھوں
ماوریٰ فکر کی حد سے ہے تجھے کیا لکھوں

ابتدا، وقت کی حد، صبحِ ازل، شامِ ابد
حق تو یہ ہے کہ میں کچھ ان کے علاوہ لکھوں

آسماں، سمت، زمیں، ذہن، خطا اور عطا
پہلے ان سب کو پڑھوں پھر تجھے تنہا لکھوں

حرف بھی تو ہے، عبارت بھی ترے نور کا عکس
پھر بھی گمراہ ہوں گر تجھ کو صحیفہ لکھوں

میں کہ عاصی ہوں طلب آخری منزل میری
تو کہ رحمت ہے تجھے کیسے نہ وعدہ لکھوں

مجھ کو احساس ہے کوتاہیٔ فن کا امیدؔ
اور کچھ لکھ نہیں سکتا ہوں تو سجدہ لکھوں

OOO

محمد سبطین شاہجہانی

نعت رسولِ مقبولؐ

گلزارِ مصطفیٰ سے چلی جب سخی ہوا
تاریکیوں کو دیتی گئی روشنی ہوا
شہرِ نبیؐ سے جلوہ فشاں جب ہوئی ہوا
تابانیوں سے بھر گئی پھر ملگجی ہوا
جب کیسوئے نبیؐ سے مہکنے لگی ہوا
جنت کے واسطے ہوئی پھر کام کی ہوا
دیتی نہیں سکون مجھے آج کی ہوا
اُن کی گلی سے رکھتی نہیں آگہی ہوا
آنکھوں میں آئی گنبدِ خضریٰ کی سبزگی
جب صحنِ دل میں چلنے لگی حیدریؑ ہوا
انعام یافتگان مدینہ کے واسطے
یعنی کبھی چلی تو کبھی رُک گئی ہوا
اے زندگی مَیں کوئے مدینہ کی گرد ہوں
مجھ کو اُڑا سکے گی نہ کوئی کبھی ہوا
سر دے کے سرخرو ہوئے جو اُن کے عشق میں
اُن کے قدوم تک نہ گئی سر پھری ہوا
زخما گئے ہیں لُو کے تھپیڑوں سے جان و دل
اے رحمتِ تمام ذرا شبنمی ہوا
شہرِ کرم سے چلتی ہے جو راحتیں لیے
کرتی ہے دل زدوں کی وہ دل بستگی ہوا
عرفان کی گھٹا سے گھٹے کِبر کے شجر
سبطینؔ تاجدارِ مدینہؐ کے فیض سے
اِس گلستانِ فکر میں تیری بندھی ہوا

OOO

ایک شام تخلیق کے ساتھ

پاکستانی ادیبوں کے لیے ساحر لدھیانوی ایوارڈ

شاہد بخاری

1938ء میں گگو (ساہی وال) میں پیدا ہونے والے کیول دھیر وہ ہمہ جہت شخصیت ہیں جنھوں نے لدھیانہ میں اردو ادب کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ۵ ویں الحمراء انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر وہ پاکستان کے 5 ادیبوں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ساحر ''لدھیانوی ایوارڈ'' پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے انتخاب کی ذمہ داری ادارہ ''تخلیق'' کو ڈال دی تھی لیکن مدیر ''تخلیق'' نے انہیں یہ ذمہ داری خود نبھانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ادیب انٹرنیشنل کے صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے پاکستان کے پانچ ممتاز ادیبوں **محترمہ بانو قدسیہ، محترم عبداللہ حسین، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر اور انتظار حسین کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ** کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ PILAC میں ادارہ ''تخلیق'' نے ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں ایک شام کا اہتمام کیا، جس میں ان پانچوں ادبی شخصیات کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ دیا گیا۔

تقریب کی نظامت پلاک کی ڈائریکٹر ڈاکٹر صغریٰ صدف نے کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر کیول دھیر بھارت کی ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ''ادیب انٹرنیشنل'' اور ''ساحر کلچرل اکیڈمی'' کے زیرِ اہتمام اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کا مشن سنبھال رکھا ہے۔ ہر سال ساحر لدھیانوی کی یاد میں وہ پاک و ہند مشاعرے کا انعقاد کرتے ہیں۔ بشریٰ رحمان، ڈاکٹر کنول فیروز، شوکت علی (گلوکار) شاہد بخاری، صوفیہ بیدار، ڈاکٹر شہناز مزمل، عزیز احمد، کرامت بخاری، ناصر زیدی، حسن عسکری کاظمی اور سرفراز سیّد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر کیول دھیر اُردو افسانے کا بڑا نام ہے۔ وہ اپنی ادبی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کی افزائش بھی کرتے ہیں۔ عصری علوم کو آرٹ بنانا اور اس آرٹ سے قاری کی تربیت کرنے کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے۔ ہر سال ساحر لدھیانوی کی یاد میں وہ ممتاز ادبی شخصیتوں کا اعزاز و استقبال اپنی انجمن ''ادیب انٹرنیشنل'' کے بینر تلے کرتے ہیں۔ ہمارے بھارت جانے اور ان کے پاکستان آنے سے دوستی اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوتی ہے اور نفرت کی تاریکیاں ختم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر نے کہا میں جب بھی لاہور آتا تھا تو اظہر جاوید ایک ادبی محفل کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ وہ روایت اب سونان اظہر جاوید نبھا رہے ہیں۔ ویزہ وغیرہ و دیگر مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ''ساحر لدھیانوی ایوارڈ'' پاکستان کے پانچ ممتاز ادیبوں کو خود لاہور جا کر پیش کروں۔ اس سلسلے میں مسلسل انڈیا سے مدیر ''تخلیق'' سے رابطے میں تھا۔ انھوں نے مختصر وقت میں اس ادبی تقریب کو شاندار طریقے سے کامیاب بنا دیا جو قابلِ قدر ہے اور اظہر جاوید کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ دوسری طرف پاکستان کے ان بڑے ادیبوں نے یہ ایوارڈ قبول کر کے ایوارڈ کی توقیر میں اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کا ذکر بھی کیا جو اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل کلچرل ہسٹری ہے، جس کا کیول دھیر نے ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہندی کی پہلی کتاب ہے جو پاکستان میں

سنگ میل پبلشرز نے شائع کی ہے۔ زبانیں جب ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتی ہیں تو محبت کا پیغام لے کر جاتی ہیں۔''

اس کے بعد محترمہ بشریٰ رحمان، ڈاکٹر کیول دھیر اور سونان اظہر جاوید نے ایوارڈ تقسیم کیے اور ایوارڈ یافتگان کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ جناب عبداللہ حسین نے کہا کہ میں فرسٹ ائیر میں تھا تب ''تلخیاں'' لائبریری سے لے کر پڑھی تھی اور مجھے زبانی یاد ہو گئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے کہا کہ کیول دھیر کئی سال سے ساحر ایوارڈ کا اہتمام کر رہے ہیں۔ 1946ء میں مجھے سرگودہا میں وہ مشاعرہ سننے کا اعزاز حاصل ہوا جس میں ساحر لدھیانوی بھی شامل ہوئے تھے۔ ان کی شاعری کے ادوار میرے سامنے گزرے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایوارڈ میرا اعزاز ہے لیکن مجھے اب حکیم آزاد انصاری کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

آزاد گر کوئی کسی قابل سمجھتا ہے تجھے　　تو اس کا حسنِ ظن ہے، من آنم کہ من دانم

ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ کیول دھیر محبت کے پجاری ہیں۔ ان ایوارڈز کے پیچھے کوئی سرمایہ دار نہیں۔ یہ صرف ان کا خلوص اور ادب سے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کہا کہ کیول دھیر سے 45 سال قبل ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت منضبط ہیں۔ ورسٹائل ہیں۔ ادب کیلئے ان کی خدمات بے لوث اور پرخلوص ہیں۔ اس تقریب میں جن معروف شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ چند نام یہ ہیں **بشریٰ رحمان، سیما پیروز، عطیہ سیّد، سعدیہ سونان، پروین سجل، سلمیٰ اعوان، عاصمہ اصغر، بشریٰ اعجاز، لبنیٰ جاوید، رخسانہ نور، سحر حفیظ، فوزیہ تبسم، فرحت پروین، سفینہ چوہدری، کرامت بخاری، سرفراز سیّد، جاوید منظور، طاہر منظور، آفتاب خان، ڈاکٹر کنول فیروز، مسعود تنہا، محمد جمیل، منصور حسین، شیخ احمد بشیر، احمد عقیل روبی، اسلم کمال، شاہد علی خان، عمران منظور، طفیل اختر، بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر، قاضی منشا، ڈاکٹر ایوب ندیم اور اعجاز رضوی۔** اس تقریب کا اختتام چائے کی میز پر ہوا۔

◆◆◆

ساحر ایوارڈ 2014ء حاصل کرنے والی پانچ شخصیات

محترمہ بانو قدسیہ

محترم انتظار حسین

محترم عبداللہ حسین

محترم ڈاکٹر سلیم اختر

محترم ڈاکٹر انور سدید

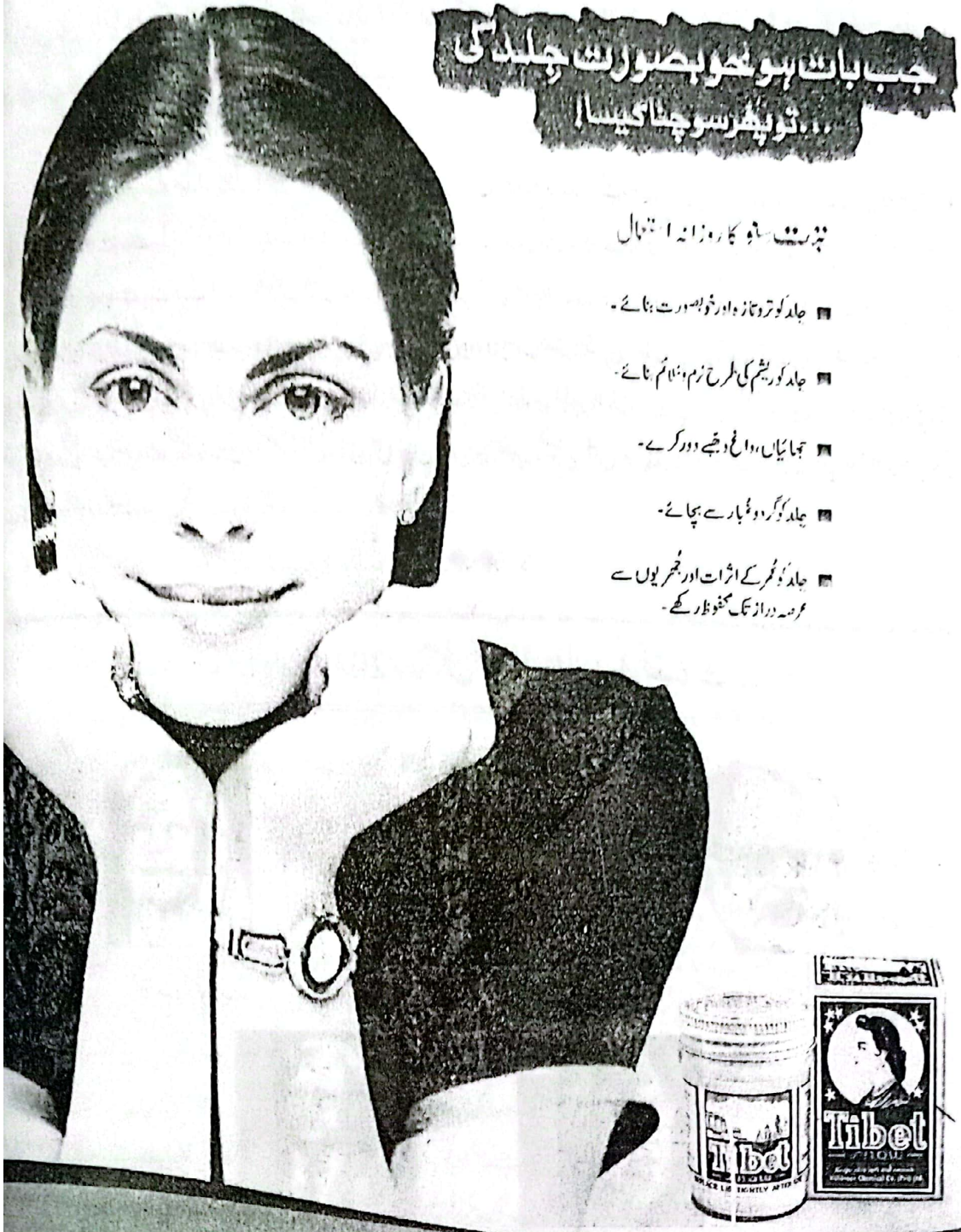

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال
جلد کو تروتازہ اور خوبصورت بنائے۔
جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے۔
چھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
جلد کو گرد و غبار سے بچائے۔
جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے
عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Tibet
Tibet
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
TS/49/2K14

مضامین

مہاپرش.....ڈاکٹر کیول دھیر

ڈاکٹر ابدال بیلا

کہتے ہیں، وہ سقراط کی کہانی ہے، جس کا باپ سنگ تراش تھا۔ وہ پتھر کی چٹان میں اپنے من میں چھائی تصویر کے تصوّر کو ایسی شدت سے سوچتا کہ وہ تصویر اسے پتھر کی سل کے اندر سانس لیتی نظر آتی، زندہ پتھر میں مقیّد، قیدی کی طرح۔ جب وہ یہ دیکھ لیتا تو پھر ہاتھ میں تیشہ لے کر اپنی من موہنی مورت کو پتھر سے چھڑانے میں جُت جاتا۔ اُسے نکال لیتا۔ یہی سبق اس نے نوعمر سقراط کو دیا تھا، کہ بیٹا، ہاتھ میں تیشہ لینے سے پہلے، تیشے سے زیادہ اپنی سوچ کی دھار کو تیز کرنا، اتنا تیز کہ تیرے تیشے سے پتھر سل سے ہر وہ کنکر کٹ کے اتر جائے، جو تیرے من میں چھائی تصویر کے جسم کو باندھے ہوئے پتھر کی چٹان میں موجود ہو۔ سب فالتو پتھر ہٹا دینا۔ اپنی چاہت کی تصویر کا پورا بدن پتھر سے آزاد کروالینا۔ پھر تکنا۔ وہ مجسمہ شاہکار ہوگا، وہی ہوگا جو تم نے سوچا ہوگا۔

سقراط نے باپ کی بات نہیں ٹالی۔

ہاتھ میں تیشے کی جگہ قلم لے لیا، وجدان لے لیا، لفظوں کی حرمت کے چلن کی راہ بنائی اور علم و دانش کو ایسا اوڑھا کہ آنے والے وقتوں میں وہ اس کی سب سے بڑی پہچان بن گیا۔ فہم و دانش کا دوسرا نام سقراط ہوگیا۔

میں کہتا ہوں، یہ خدا کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے بھی جو سوچا ہوتا ہے، جیسا سوچا ہوتا ہے، وہ وہی صورت وہی مورت بنالیتا ہے، سجا دیتا ہے۔ چاہے وہ زمین و آسمان کے بیچ کہیں بھی ہو۔ کہنے کو وہ صورت ہزار پردوں میں چھپی ہو، پہاڑوں کی اوٹ میں ہو یا میدانوں کی رزم گاہوں میں، صحرا کے بیچ وہ کوئی آدھی صدی کے بعد نکلا ہوا انمول پھول ہو یا سمندر کی تہہ سے جڑی پلتی ہوئی کوئی خوش نما سیپی یا اس سیپی کے اندر چھپا ہوا کوئی گراں قدر گوہر۔ وہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے، جہاں چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ کہنے کو صدیوں سے وہ پرش بناتا آیا ہے، مگر جب اُسے کبھی پرشوں کی اس پرجا میں کسی کو مہاپرش کا درجہ دینے کا خیال آتا ہے تو وہ خود وہی کرتا ہے جو اس نے سقراط کے باپ کو سکھایا تھا۔ وہ وقت اور جگہ کی آنکھ پہ اپنی مقدس آنکھ ایسی محبت سے رکھتا ہے کہ جسے اس نے جیسا سوچا ہو وہ عین وہی ہوجاتا ہے، زمانے بھر سے پھر وہ اُسے منوالیتا ہے۔

اب آپ خود کہیں گے کہ یہ تو کیول دھیر کی کہانی ہے جو میں سنانے چلا ہوں۔ جی انہی کی کہانی ہے، ایک پرش سے مہاپرش بننے کی۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی زندگی میں عجیب موڑ آئے۔ وقت اور جگہ کی صلیبوں پہ یہ کئی بار چڑھے۔ ہر بار سرخرو ہو کے اترے۔ اترے بھی ایسے کہ اپنے ساتھ اپنی صلیبوں کو بھی امر کرتے گئے۔ جس سمے پہ ہاتھ رکھا، وہ ٹھہر گیا، جس جگہ کو چھولیا وہی شان والی ہوگئی۔

کوئی پچھتّر سال پہلے، قدیمی ملتان دہلی روڈ پہ واقع ایک چھوٹے سے قصبے گگو میں پیدا ہوئے۔ یہ پانچ اکتوبر 1938ء کی بات

ہے۔کون جانتا تھا کہ ایک قصباتی ہسپتال کے ڈاکٹر ہنس راج دھیر اور شریمتی پدماوتی کے گھر پیدا ہونے والا یہ معصوم بچہ اس برصغیر کا ایک نامور ادیب ہوگا جس کے قلم میں محبت، امن اور بھائی چارے کی خوشبو روشنائی بن کے روشنی دے گی۔ دنیا کو جگ مگ کر دے گی۔ دلوں میں پیار کی جوت جگائے گی۔ جس کہانی کو کہے گی اسے وقت کے کلیجے پہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دے گی۔

وہ قصبہ، گگو آج بھی موجود ہے۔ ملتان سے کوئی سو کلومیٹر لاہور کی طرف یہ قصبہ کہنے کو اس وقت ضلع منٹگمری میں تھا۔ اب یہ وہاڑی ضلع کی تحصیل بورے والا کا حصہ ہے۔ جس وقت ڈاکٹر کیول دھیر وہاں پیدا ہوئے وہ ڈھائی تین سو گھروں کا ایک بڑا سا گاؤں تھا۔ اب وہ جوان ہو کے ایک بھرپور قصبہ بن گیا ہے۔ پتہ نہیں کہ ڈاکٹر کیول دھیر کی جنم بھومی کی وجہ سے ہوا یا انکے مرحوم ڈاکٹر والد کے باعث، کہ آج وہ قصبہ اپنے علاقے کا ایک معروف میڈیکل ٹاؤن بن چکا ہے۔ جدھر کئی ہسپتال ہیں۔ دکھی جسموں کا وہاں علاج ہوتا ہے۔

دکھی روح کی سمجھ پا لینے کے بعد، دکھی جسم کے علاج کا نسخہ تجویز ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے دنوں میں ڈاکٹر کیول دھیر نو برس کے تھے۔ تقسیم کے دنوں میں آگ اور خون کا تماشا انہوں نے بیتا ہے۔ کہتے ہیں انکے والد کے سرکاری ہسپتال سے ملحقہ انکے گھر پہ بلوائیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان بلوائیوں میں اکثر وہ صحت مند لوگ تھے جنہیں طاقت کی دوائیاں کھلا کھلا کے اسی ہسپتال کے مہربان ڈاکٹر نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

مگر وہ پاگل پنے کے دن تھے۔

لوگوں سے اپنے محسن اور مجی کی پہچان نکلی ہوئی تھی۔

انہوں نے محاصرہ کر لیا۔

مگر کچھ نیک لوگ ہر دور میں ہوتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر کا ایک ڈسپنسر دل و جان سے ان سے محبت کرنے والا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پریوار کو اپنے گھر لے گیا۔ بلوائیوں کو خبر ہوگئی۔ وہ ادھر جا حملہ آور ہوئے۔ ڈسپنسر بلوائیوں کے ہی دھرم کا تھا، مسلمان تھا۔ اس نے بتیرے ہاتھ جوڑے، سمجھایا، منع کیا۔ وہ نہ مانے تو ڈسپنسر بولا مجھے مار دو،

میرے ڈاکٹر ہنس راج دھیر کو نہ مارو۔

ان ظالموں نے اُسے مار دیا۔

اس کی بیوی روتی پیٹتی آگے بڑھی، وہ بھی ماری گئی۔ دروازے پہ دو لاشیں گر گئیں۔ گلی خون سے بھر گئی۔ اس خون نے حملہ آوروں کے قدم روک دیے۔ ڈسپنسر اور اس کی بیوی نے تو اپنی جانیں قربان کر دیں۔ انکے بچے بھی انہی کی طرح قول نبھانے والے نکلے۔ جسے پناہ دی تھی اس کی سلامتی کے ضامن بنے رہے۔ وہ اپنے والدین کی خون میں لت پت لاشیں اٹھانے نہیں آئے، گھر کی پچھلی کھڑکی کھول کے ڈاکٹر کیول دھیر کے پورے گھرانے کو محفوظ نکال کے دُور ایک چری کے کھیت میں جا چھپا آئے۔ انہیں خبر بھی نہ دی کہ انہیں بچاتے بچاتے انکے ماں اور باپ دونوں مارے گئے۔ انکے سر سے آسمان اٹھ گیا۔ انکے قدموں سے ان کی زمین نکل گئی۔ یہ تو ایک دو دن بعد جب کھیتوں میں چھپے گھرانے کے لیے وہ چھپ چھپا کے روٹی پانی لے کر آتے رہے تو ان یتیم بچوں کے اجڑے چہرے اور لٹی روحیں دیکھ کے ڈاکٹر کیول دھیر کے والد صاحب کو علم ہوا کہ ان پہ اور ان کے گھرانے پہ ایک مسلمان ڈسپنسر اور اس کی بیوی اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ سوچنے کی

بات ہے ڈاکٹر کیول دھیر کے والد صاحب، ان کی ماتا جی اور انکے بہن بھائیوں کے لیے یہ خبر کیسی ہوگی؟ ڈاکٹر کیول دھیر اس سمے نو سال کے تھے، ساری سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ان پہ اس واقعے کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ اتنی چھوٹی عمر میں انہیں دھرم کی بنا پہ دھرتی پہ کھنچی لکیر کی سمجھ تو شاید نہ آئی ہوگی مگر وہ اتنا سمجھ گئے تھے کہ انکے گھرانے کو بچانے کی تگ و دو میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے محسن ترین لوگ انکے اپنے دھرم کے لوگ نہیں تھے۔

شاید وقت اور جگہ کی چٹانوں سے پرشوں کے خدوخال بنانے اور ان کی پرورش کرنے والے خدا نے ایک پرش کو مہا پرش بنائے جانے والی اپنی سوہنی مورتی کے لیے یہ پہلا سبق رکھا تھا کہ انسان سے محبت اور اسکا پالن، جگہ وقت اور دھرم تینوں سے اونچے درجوں پہ گنا جائے۔ کون جانتا تھا کہ یہی سبق ڈاکٹر کیول دھیر کے لیے ان کی ساری زندگی کا چلن بن جائے گا۔ کہنے کو عام انسانوں کی طرح ساری زندگی وہ جہد مسلسل سے گزاریں گے مگر انکے اندر ہی اندر ایک پیپل یا بوہڑ کا بوٹا تناور ہوتے ہوتے اتنا پھیل جائے گا کہ اسکا سایہ انکے اپنے دیس سے نکل کے چہار سو پورے جنوبی ایشیا میں پھیل جائے گا۔ یہ محبت کی چھتری کھولے خود بیٹھے بٹھائے بندے سے بدھا اور پرش سے مہا پرش ہو جائیں گے۔

ایسا ہی ہوا

کہنے کو ڈاکٹر کیول دھیر کا گھرانہ پاکستان سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی قصبے پھگواڑہ میں لدھیانے کے مضاف میں جا بیٹھا۔ وقت کی بے رحم سختیوں اور زمانے کی دھول نے ڈاکٹر کیول دھیر کو بچپن میں بھی بچپنا نہ دیا۔ لڑکپن میں بھی لڑکھڑانے کی مہلت نہ دی۔ جوانی آئی بھی تو جاڑوں کی منجمد چاندنی کی طرح۔ انکے حساس دل سے گھرانے کی ذمہ داریوں کا بوجھ اوجھل نہ ہوا۔ ڈاکٹر دھیر کم عمری میں ہی ایک بوٹے سے پورا شجر ہو گئے۔ شجر بھی وہ جو سایہ دار بھی تھا، پھل دار بھی۔ مگر انہوں نے اپنے پھل خود نہ کھائے، اپنے سائے تک میں خود نہ بیٹھے، دوسروں کو بٹھایا۔ انکے ذہن میں بچپن میں دیکھی انوکھی وفا کے پالن کا جو سبق انہیں دکھایا گیا تھا وہ انہیں یاد رہا، جب انکے والد کا مسلمان ڈسپنسر اور اس کی بیوی اپنے بچوں کو یتیم چھوڑ کے انکے گھرانے کی سلامتی کے لیے قربان ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کا شعار ایثار اور قربانی بنا لیا۔ صوبہ بہار کے علاقے میں یہ ڈاکٹری پڑھنے گئے مگر اپنا قلم بھی ساتھ لے گئے۔ وہ قلم صرف بیمار جسموں کے لیے نسخے لکھنا نہ سیکھتا تھا، بلکہ بیمار روحوں میں تازگی اور امن کی پیوند کاری بھی کرتا تھا۔ انہی مقدس جذبوں نے انہیں قلم کار بنا دیا۔ کہانیاں تو انہوں نے خود بھی بہت بیتی تھیں مگر اپنے قلم کو انمول کہانی کہنے والا بنا دیا۔ سروس تو انہوں نے کئی جگہ کی۔ آخری ان کی پوسٹنگ نے انکے مستقل قیام کی نشان دہی کر دی۔ یہ ہمیشہ کے لیے میری ماں اور میرے باپ کے شہر لدھیانہ میں جا بسے۔

لدھیانہ سے اجڑ کے میرے والدین پہلے سیالکوٹ اور پھر لاہور آئے تھے۔

لدھیانہ اور اسکے مضاف ماؤ میوال میں وہ اپنے اجداد خواجہ روشن ولی، سائیں بگو شاہ اور میرے دادا بیلا خان کی قبریں بھی چھوڑ آئے۔ نانا بھی اپنے اجداد کی چوڑے بازار لدھیانہ میں حویلیاں چھوڑ آئے تھے۔ لاہور میں میرے والدین اپنی بقیہ زندگی جی کے جب جانے لگے تو میرے کان میں کہہ گئے کہ ان کے جسموں کو اٹھا کے ملتان دہلی روڈ پہ گگو سے چند میل پرے بورے والا کے مضاف میں ایک قدیمی قبرستان دیوان صاحب میں دفنانا۔ ادھر میرے ابا جی کی لدھیانہ سے ہی آئیں میری دادی کی قبر تھی۔ ابا جی نے ہمیشہ لیٹنے کے لیے اپنی

ماں کے قدموں کا سرہانہ سوچا تھا۔ابا جی کو ہم لاہور سے لے کے گئے۔امی جی راولپنڈی میں میرے پاس تھیں جب ان کا بلاوا آیا۔انہوں نے بھی یہ کہا جدھر تیرے ابا ہیں وہیں مجھے لے جانا۔کہنے کو وہ علاقہ ہم بہن بھائیوں کے لاہور کے گھروں سے دور تھا لیکن والدین کے حکم کا پالن ہم پہ لازم تھا۔اُدھر ہی لے گئے۔اُدھر ہی انکا مزار ہے۔یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ جدھر والدین نے اپنا مستقل ٹھکانہ بنایا ہے وہیں پہ لدھیانہ کے ڈاکٹر کیول دھیر کا جنم استھان ہے۔قدرت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ادھر کی دھرتی سے ادھر جا پیڑ لگاتی ہے،کبھی اُدھر سے آئے بوٹوں کو ادھر شجر بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے بارے میں سنی سنائی بات میں نہیں کرتا۔

میں نے انہیں بیتا ہے۔ان کے ساتھ لمبے لمبے سفر کیے ہیں۔چودہ چودہ گھنٹے،بیس بیس گھنٹے لمبے سفر اور بہت کیے ہیں۔پاکستان اور ہندوستان کے شہروں بیچ ہم اسی سلامتی محبت اور امن سے گھومے پھرے ہیں جیسے کبھی ہمارے اجداد ان راستوں پہ چلا کرتے تھے۔لاہور میں انکے ساتھ رہا،اسلام آباد میں یہ میرے پاس رہے،لدھیانہ میں،میں انکے پاس ٹھہرا،دہلی میں ہم اکٹھے پھرے،آگرہ کا تاج محل ہماری محبتوں کا گواہ ہے۔ٹیکسلا کے کھنڈرات ہمارے راز دار ہیں،بدھا کے اسٹوپا زنے ہمیں پاس بٹھایا۔لال قلعہ کے جھروکے ہماری باتیں جانتے ہیں،قطب مینار ہماری دوستی کا چشم دید ہے۔اجمیر شریف کے خواجہ جی ہماری محبتوں کے امین ہیں،جہاں سلام کرتے سمے میں ان سے دو قدم ادب سے پیچھے چل کے گیا تھا۔پانی پت کے بوعلی قلندر کے آستانے پہ ہم ساتھ ساتھ بیٹھے اور تبرکات وصول کئے۔نظام الدین اولیاء اور قطب صاحب کی درگاہوں پہ ہم نے اکٹھے دیے جلائے۔فتح پور سیکری کے کھنڈرات سے بھی ہم محبت کی خوشبو بکھیرتے گزرے۔دہلی لدھیانہ کی جامعات میں ہم اکٹھے مہمان اعزاز بن کے گئے۔پاکستان ٹیلی ویژن اور دیگر نجی چینلز کے علاوہ راجیہ سبھا ٹی وی دہلی میں ہمارے اکٹھے انٹرویوز ہوئے۔اسلام آباد،لاہور،دہلی،آگرہ اور لدھیانہ میں ہم نے دو بھائیوں کی طرح باری باری ایوارڈز وصول کیے۔ان تمام شہروں کی فٹ پاتھ پہ ہم چلے،باغوں میں گھومے،دفتروں میں بیٹھے،ہوٹلوں میں ٹھہرے اور ایک دوسرے کے گھر قیام کیا۔کہنے کو میں اسلام آباد میں رہتا ہوں یہ میرے والدین کے شہر لدھیانہ میں،مگر ہماری روز ہی بات ہوتی ہے۔کبھی فون پہ کبھی ایس ایم ایس،کبھی فیس بک۔محسوس یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں بھی ہوں ہم پاس پاس ہی بیٹھے ہیں۔

اتنے قریبی تعلق اور محبت کے اٹوٹ رشتے کی بنا پہ میں انہیں بڑا بھائی مان کے ''بھا جی'' کہتا ہوں۔دل و جان سے انہیں یہ مانتا ہوں۔اس لیے ان کے بارے میں یا ان کی تحریروں کے ضمن میں کوئی رائے دینا اقربا پروری کے زمرے میں آئے گا۔اتنا میں ضرور کہوں گا کہ ایسی محبت بھری ایک بھی شخصیت کا پیار پوری زندگی بھر کے لیے کافی ہے۔میں جنم جنم پہ یقین تو نہیں رکھتا مگر اگر ایسے ہی ہے تو مجھے لگتا ہے ہم حقیقت میں کسی جنم میں حقیقی بھائی رہے ہوں گے۔یا آئندہ کبھی ہوں گے۔بہر حال اس جنم میں تو ہے ہی۔

ڈاکٹر کیول دھیر کی لکھی کہانیاں اجلے دل کی سلجی ہوئی پریم پتریاں ہیں۔انہوں نے اپنے اندر کا سارا پیار اپنے کرداروں میں رکھ کے انہیں ایسے پالا ہے جیسے ایک محبتی مالی اپنے باغیچے میں پھول اور پھلوں کے بوٹے پالتا ہے۔انکے پتے پتے کا منہ دھلاتا ہے۔ان کی جڑوں کو پانی دیتا ہے۔انہیں سجاتا ہے،سنوارتا ہے۔وہ مسکراتے ہیں تو خود مسکراتا ہے۔

ان کی کہانیوں کے ہیرو زیادہ تر ان کی طرح اور میری طرح میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور اپنے پروفیشن سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔اپنے

مریضوں کی فلاح کے لیے خود کو وقف کیے رکھتے ہیں۔ ہندوستانی فلمیں دیکھ دیکھ کے ہم ادھر کے ناموں سے اب بخوبی واقف ہیں، مگر کسی نے اگر وہ فلمیں نہ بھی دیکھی ہوں تو ان کی کہانیوں کے سارے کردار اسے آس پاس دکھنے لگتے ہیں۔ راج 'راجن' کیلاش 'وکاس' سدھیر' نریش، اویناش، شیکھر، ویشال، دیپک، بھیم سنگھ، آکاش، روی، ستیش، منوج اور احمد جہاں مردوں میں انکے پسندیدہ نام ہیں تو ریتا، اندو، سمن، کلپنا، انجلی، سپنا، نشی، ساجدہ، گیتا، نیلم، مدھو، کلا، نیلو، شامنی، شوبھنا، پونم، وینو، سنگیتا، رجنی، مالتی، شالنی، پریتی، لتا، گنگا، سریتا، رما اور واسنتی ان کی ہیروئینز کے نام ہیں۔

ان کی کہانیاں انسانیات کی اعلیٰ قدروں کی قدردانی پہ محیط ہیں۔ قدرت کی عظمت اور قدرتی مناظر سے انکا والہانہ پن ان کی کہانیوں میں مہکتا ہے۔ پہاڑوں کا حسن اونچے دیودار درختوں سے گزرتی خوشگوار مہکتی ہوا، ڈھلوانوں پہ بنے اچھوتے سندر گھر، پہاڑوں کی چوٹیوں پہ چمکتی برف، بہتی ندیاں، گنگناتے چشمے، مسکراتے جھرنے اور اچھلتی چھینٹے اڑاتی آبشاریں ان کی کہانیوں میں خوش نما بیل بوٹوں کا کام کرتی ہیں۔ دارجلنگ، مسوری، نینی تال اور ڈھیرہ دھون کے خوش نما پریم اسٹیشن ان کی کہانیوں میں جھلماتے ہیں، پریمیوں کو بلاتے ہیں۔ ان کی ہر کہانی انسانیت کی کسی اعلیٰ قدر کی ترجمان ہے۔ ایثار و قربانی ان کی سب کہانیوں کی ایک مشترک قدر ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کا سبق انہوں نے نو سال کی عمر میں گگو سے آتے ہوئے سیکھا تھا۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت کا سارا حسن، پرتو، اجلا پن، چاہت، خلوص اور انسان دوستی ان کی کہانیوں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی اجلا قلم میلی بات لکھے۔

یہ سب چمتکار ان کے اندر ٹھہرے ہوئے نکھرے حسین موسم کا ہے۔ اسی کی بدولت یہ وہ سایہ دار شخصیت بنے جن پہ میٹھے انگور کی بیل چڑھی ہوئی ہے۔ اسی سے ان کی لکھی کہانیوں کا سارا رنگ رس ہے۔ یہی وہ امتیازی وصف ہے جو انہیں اپنے عہد کے سارے ادیبوں اور تمام پرشوں سے بلند کر کے مہا پرش کی گدی پہ بٹھاتا ہے، جو ان کا دائمی استھان ہے۔

اپنی تحریروں کے طرح ان کی شخصیت کا سراپا بھی بڑا دلکش ہے۔ پیار کے جذبوں سے لدا ان کا گول مسکراتا چہرہ، بکھرے بکھرے پورے بال، محبت کے شہد سے چپ چپ کرتی، ان کی باندھ کے رکھ لینے والی بڑی بڑی آنکھیں جسے پیار سے دیکھ لیں کوئی گہرا رشتہ بنا لیتی ہیں۔ پتلون کے اوپر دو کھلے بٹنوں والی چیک دار گہرے رنگ کی شرٹ ان کا پسندیدہ پہناوا ہے۔ ان کی آواز بڑی متانت بھری اور کانوں کو بھلی لگنے والی ہے۔ شاید مدتوں ریڈیو براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی ویژن کے میزبان کے طور پہ انہیں اپنی بات کہنے کا ایک منفرد اور سحر انگیز طریقہ آ گیا ہے۔

ساحر لدھیانوی سے کیول دھیر کو عشق ہے۔ ان کا یہ عشق محض رانجھا بن کے چوری کھانے والا نہیں، فرہاد بن کے دودھ کی نہر نکالنے والا ہے۔ پچھلے پینتالیس سال سے یہ لدھیانہ میں ساحر لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی چلا رہے ہیں۔ اس اکیڈمی کے بانی چیئرمین ہیں۔ پینتالیس سال ہو گئے، ہر سال مارچ کے پہلے ہفتے یہ لدھیانہ میں جشنِ ساحر کا اہتمام کرتے ہیں۔ پندرہ سولوگوں سے بھرا پنڈال ہر سال پنڈت نہرو کینڈر لدھیانہ میں یہ سجاتے ہیں۔ ہر سال ادھر پاکستان کے نامور شعراء کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض سے آئے شاعروں کی ضیافت کرتے ہیں۔ ایک آل پاک و ہند مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہی نہیں، ہر سال پاکستان اور ہندوستان کے چنے ہوئے ممتاز

ترین ادیبوں اور شاعروں کو ساحر ایوارڈ اور ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازتے ہیں۔ لدھیانہ ایک صنعتی شہر ہے۔ وہاں کے صنعت کار اور بزنس ٹائکون ان کی وجہ سے اپنے شہر کی سوہنی پہچان ساحر لدھیانوی کی محبت میں ساحر کے سحر کو مانتے ہیں۔ جدھر ڈاکٹر کیول دھیر انہیں کھڑا کرتے ہیں، ادھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جشنِ ساحر کے دنوں میں لدھیانہ شہر شادی والے گھر کی طرح جگ مگ لائٹیں مارتا ہے۔ پینتالیس سال سے اس شہر کی اس سالانہ عروسی سہرابندی میں دولہا ڈاکٹر کیول دھیر ہوتا ہے۔ منٹو سے بھی ڈاکٹر کیول دھیر کو عشق ہے۔ کئی کتابیں منٹو پہ مرتب کر چکے ہیں۔ منٹو کی زندگی میں ہی ان کی معروف کتاب ''منٹو میرا دوست'' آئی تھی۔ منٹو کی تحریر کے علاوہ اس کا ڈومی سائل بھی ان کے زیرِنظر ہے، کیونکہ منٹو بھی لدھیانہ میں پیدا ہوا تھا۔ منٹو کے لیے برصغیر پاک و ہند میں سب سے یادگار ادبی جلسے انہوں نے لدھیانہ میں سجائے۔

ابن انشاء بھی لدھیانہ کا سپوت تھا، حمید اختر کی جائے پیدائش بھی لدھیانہ تھی، اُن کی یادگاریں انہوں نے سنبھالی ہوئی ہیں۔ میری پیدائش تو پاکستان بننے کے نو سال بعد سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔ مگر میرے والدین اور اُن کے نسل در نسل سے لدھیانہ کے تعلق سے یہ مجھے بھی فرزند لدھیانہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ لدھیانہ کے ادبی، سماجی اور یونیورسٹی اجتماعات میں میری گفتگو سے پہلے یہ میرا تعارف بھی لدھیانہ کا بیٹا کے طور پہ کراتے ہیں۔ پاکستان میں جہاں میں ان کا چھوٹا بھائی، سونان اظہر ان کا بیٹا اور بشریٰ رحمان چھوٹی بہن ہیں تو یہیں فخر زمان، عطاء الحق قاسمی، عقیل روبی، رشید امجد، سحر انصاری اور افضال احمد اُن کے پکے دوست ہیں۔ جس طرح لدھیانہ میں انہوں نے عظیم شاعر ساحر لدھیانوی کی عظمت کو سلام کرنے کے حوالے سے ساحر اکیڈمی بنائی ہوئی ہے ایسے ہی اُن کی اپنی جنم بھومی گگو بورے والا میں ان سے پیار کرنے والوں نے ڈاکٹر کیول دھیر اکیڈمی بنا دی ہے جو اس علاقے کی ادبی اور ثقافتی پہچان ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر کیول دھیر پاکستان اور ہندوستان کی عظیم ترین ادبی اور ثقافتی ہستیوں پہ ڈاکومینٹریز بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ ذمہ داری انہی کے اشارے پہ ہندوستان کے سرکاری ٹیلی ویژن، راجیہ سبھا ٹیلی ویژن دہلی کے مینجنگ ڈائریکٹر راجیش بادل نے اُٹھائی ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ڈاکٹر کیول دھیر اس تاریخ ساز منصوبے کے مدیر اور کوآرڈی نیٹر ہیں۔ پاکستان سے یہی ذمہ داری میرے کندھوں پہ رکھی گئی ہے۔ ہماری طرف سے اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، بلھے شاہؒ، ملکہ ترنم نور جہاں، مہندی حسن، رستم زماں گاما پہلوان، ریشماں، شہر لاہور اور ٹیکسلا کو ڈاکومینٹریز کے لیے چنا گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے غالب، ڈپٹی نذیر احمد، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، امرتا پریتم، دلیپ کمار اور اندر کمار گجرال کے نام ہیں۔ اندر کمار گجرال سے کیول دھیر کی گہری دوستی تھی۔ چند سال پہلے جب میں دہلی گیا تو کیول دھیر مجھے آئی۔ کے گجرال سے ملانے ان کے گھر لے گئے۔ اس وقت گجرال صاحب اکانوے سال کے تھے، کڈنی کے مرض میں مبتلا تھے۔ ہفتے میں دو بار ان کا ڈایالیسس ہوتا تھا، مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ مجھے لے کر اپنی سڈی میں بیٹھے رہے، اپنے شہر گجرات اور ایف سی کالج لاہور کی باتیں کرتے رہے، سنتے رہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر گجرال صاحب کے علاوہ بھی ہندوستان کے اکثر مہامنتریوں سے دوستانہ تعلق رہے۔ جہاں جہاں ان کا بس چلا انہوں نے خطے میں امن کے لیے جان ماری۔

ڈاکٹر کیول دھیر دنیا کے اس خطے، جنوبی ایشیاء میں وہ مضبوط ترین پل ہیں جو خطے کے ملکوں کو محبت کے ایک مضبوط، انمول ریشمی دھاگے میں پرو کے آنے والے وقتوں کے نصیب میں امن اور پیار کے سچے موتے پرونے کی ذمہ داری نبھائے جا رہے ہیں۔ تاریخ جانتی ہے کہ ہر بڑے انسان نے محبت کی ایسی ہی مالائیں پروئی ہیں تب وہ کبھی صوفی اور کبھی مہاپرش کہا گیا ہے۔ ایسے ہی مہاپرش کی دستک میں

مدت سے بند''دروازہ کھلتا ہے'' کھلتا آیا ہے،کھلتا رہے گا۔

یہی نام ہے اس ناول کا جو اردو کا ضخیم ترین ناول ہے۔

اب جب انہوں نے اس کا ہندی میں ترجمہ کر دیا ہے تو وہ ہندی کا بھی سب سے بڑا ناول بن چکا ہے۔ یہ بات بھی طلسماتی ہے اور ان کی شخصیت کا سحر ہے کہ یہ ناول اور انکے ترجمہ کیے ہوئے دوسرے چھ ناول ہندی زبان میں پاکستان کے سب سے بڑے پبلشر افضال احمد نے اپنے ادارے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے چھاپے ہیں۔

ہندی زبان میں پاکستان سے شائع ہوئے ان ناولوں سے پہلے، پاکستان سے کبھی ایک صفحہ بھی ہندی زبان میں نہ چھپا تھا۔اب ہندی کے سب سے بڑے ناول کی اشاعت کا شہر نہ دہلی ہے، نہ ممبئی ہے، نہ کلکتہ ہے نہ چنائی ہے بلکہ کتابوں اور علم دوستی کا قدیمی شہر لاہور ہے۔ڈاکٹر کیول دھیر نے اگرچہ پچاسی کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کی ہیں مگر ان کا اردو پاکستانی ناولوں کا ہندی زبان میں ترجمہ اور ان کی پاکستان سے اشاعت ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔اردو زبان اور پاکستانی ادب پہ جہاں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولنے والا ہے، میرے لیے خصوصاً یہ ایک بہت ذاتی انہونی خوشی کا باعث ہے، اس لیے کہ ۱۸۰۰ صفحوں کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اور دیگر چھ ناولوں کا مصنف میں ہوں۔ یہ سارے وہ ناول ہیں جن میں تقسیم سے قبل کے ہندوستان کا سارا سماج، اس کے سماجی رویے، تہذیب، تمدن اور تاریخ، عام کرداروں کے حوالوں سے پوری داستان بیان کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''دروازہ کھلتا ہے'' ادب کا وہ شاہکار ہے جو اشاعت کے پہلے دن سے سیدھا کلاسیکل ادب کا حصہ بن چکا ہے۔لوگ اسے جام جہاں نما کہتے ہیں۔موضوعات کی رنگارنگی، نہ بھولنے والے ساڑھے تین سو کے لگ بھگ کردار، آرائش، تشبیہات، منظر کشی اور کمال جزیات نگاری، مہمات، معلومات، حسن ومحبت، فلسفہ، تصوف اور انسانی نفسیات کی گتھیاں لوگوں نے اس میں ڈھونڈ لی ہیں۔ کہتے ہیں اس کا انداز سیدھا دل میں اترنے والا ہے۔ترکیب انوکھی کہ ایک نہیں کئی زمانوں میں بات کی ہے۔ایک طرف برٹش انڈیا اور قبل کی طلسماتی فضا ہے وہیں فن ناول نگاری کے اب تک کے سارے نقوش۔ داستانوی، تاریخی، سوانحی، ڈرامائی، عشقیہ اور صوفیانہ سبھی ذائقے۔دنیا ادب میں یہ ناول دیکھنے میں تاج محل محسوس کرنے کے لیے محبوب کا گھر اور زیارت کے لیے درگاہ کہا گیا ہے۔دیکھا جائے تو یہ دنیا کا سب سے طویل پریم پتر ہے جو میں اور تم کے دھاگے میں پرو کے صدیوں پرانے ہندوستان کی تقسیم ہند تک کی طلسماتی کہانی بیان کرتا ہے۔کیول دھیر کہتے ہیں کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کی کسی بھی کتاب میں قدیم ہندوستان اور برٹش انڈیا کا سحر انگیز کلچر اس ناول کے علاوہ کہیں محفوظ نہیں ہوا۔ان کا کہنا ہے کہ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے اس ناول کو ہندی زبان کا قالب دیا تاکہ ہندوستان کے سوا سو کروڑ لوگ اور ان کی آنے والی نسلیں اس اثاثے سے بہرمند ہو سکیں۔ان کا یہی جذبہ انہیں اس ناول کے انتخاب پہ لایا اور بعد میں اس ناول کے مصنف سے انہیں پیار ہوا۔

بات کہنے کی تو نہیں، نہ میں سقراط کے باپ کی طرح کوئی ماہر سنگ تراش ہوں، مگر میں نے یہ ناول لکھتے سے اور ڈاکٹر کیول دھیر نے اس کا ترجمہ کرتے وقت قلم کو تیشے کی طرح پکڑنے سے پہلے عین ہوش کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھ لیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب تمام دیواروں کی توقیر اور احترام کے ساتھ ساتھ، ان دیواروں بیچ امن اور شانتی والا ''دروازہ کھلتا ہے''۔

◆◆◆

سعید صورتوں کا مصنّف: انور سدید

منور عثمانی

انور سدید کو اپنے علمی و ادبی سفر کے دوران میں کئی ''سعید صورتیں'' دیکھنے کا اتفاق ہوا؛ انھوں نے اس مشاہدے کو ''تبرکات'' کے طور پر اپنے پاس رکھنے یا زیادہ سے زیادہ (اپنی آپ بیتی یا اسی نوعیت کی شخصی دستاویزی تصنیف میں) ان کی جانب اشارہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سعید صورتوں کے خدوخال کی باریک سے باریک بات کو بھی اپنی ملاقاتوں اور مطالعوں کی بنیاد پر روشن کیا اور معاصر ادب کے کھلے کینوس پر کسی ''رنگ آمیزی'' کے بغیر رکھ دیا تاکہ سب لوگ بہ سہولت اور بہ تفصیل دیکھ سکیں اور ساتھ ہی کینوس میں چھپے اس آئینے کو بھی دریافت کر سکیں جس میں ناظرین بھی خود اپنے آپ کو دیکھنے کی سعادت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

''سعید صورتیں'' خاکوں یا شخصی مضامین کی حامل ایسی منفرد کتاب ہے جس میں مصنف نے ادیبوں' شاعروں اور دانش وروں سے ملاقاتوں کو اپنے مطالعے اور مطالعات کو ملاقاتوں سے اثبات' توسیع اور عمق مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شخصیت اور علم و فن کو آمیز کر کے' حفظ مراتب کے پورے احساس و لحاظ کے ساتھ' نہایت شائستگی و شگفتگی سے ہر مضمون باندھا گیا ہے جس سے یہ 'تذکرہ' کہانی کے لطف اور انشائیے کی لطافت کا حامل ہو گیا ہے۔ بعض خاکہ نگار اس ''شگفتگی'' کی خاطر لطائف' مضحک واقعات' شخصی حلیے کی ناہمواری یا ماحولیاتی آلودگی کے مصورانہ بیان کا سہارا لیتے ہیں؛ انور سدید کو ایسے سہاروں کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ ان کی مدد کو ان کی تر و تازہ یادداشت' مطالعاتی وسعت اور شگفتہ و رواں دواں اسلوب موجود ہے۔

انور سدید کا تنقیدی اسلوب یہ ہے کہ وہ کلمہ خیر کہہ کر ہر اچھی بات' رویے اور عمل کو فروغ و استحکام دیتے اور کلمہ حق کہہ کے غیر متوازن اور غیر مستحکم ''احوال و آثار'' پر گرفت کرتے نظر آتے ہیں گویا ان کا کلمہ خیر ''مفاداتی'' ہے' نہ کلمہ حق فقط ''جدلیاتی''۔

سعید صورتوں کے تذکرے میں انور سدید کی جو اپنی صورت ابھرتی ہے' وہ ایک ایسے وضع دار اور دیانت دار شخص کی ہے جو استفادے کا اعتراف اور احسان مندی کا اظہار برسرِ عام کرنا جانتا ہے۔ ان مضامین میں بعض اوقات موضوع سے گریز کی کیفیت بھی ملتی ہے لیکن اس گریز کے عقب میں فکری و شخصی نمود و نمائش کے جذبے کے بجائے احساسات کا دباؤ یا یادوں کا بہاؤ اپنا زور دکھا رہا ہوتا ہے البتہ اس گریز پائی سے مضمون میں موضوعیت اور شخصی والہانہ پن دوچند ہو جاتا ہے اور مضمون میں' پڑھے جانے یا اپنے آپ کو پڑھوانے کی خوبی بھی بڑھ جاتی ہے۔

شاید تمام تر علمی و ادبی اختلافات' تنازعات اور تعصّبات کے باوجود اس بات سے کوئی انکار نہ کرے کہ انور سدید جن خوبیوں کی بنیاد پر' کسی کو ''سعید صورت'' قرار دے رہے ہیں' وہ خوبیاں خود انور سدید میں بھی موجود ہیں مثلاً درویشی' دیانت داری' راست گوئی' اسی

طرح احسان مندی، محسن شناسی، ادیب نوازی، کتاب دوستی اور محنت شاقہ اور ایک ان تھک تصنیفی و تالیفی سلسلہ جاریہ.....شخصیات پر لکھتے ہوئے خود لکھنے والا بھی منکشف ہو جاتا ہے؛ انور سدید نے عموماً ان شخصیات کو موضوع بنایا ہے جن سے خیر، علم، عرفان اور فن کی کوئی کرن پھوٹی اور مختلف بطون کو روشن کرتے کرتے انور سدید کے باطن تک بھی آ پہنچی ہے۔ انور سدید اس کرن کو اتفاق نہیں، احسان قرار دیتے ہیں اور اس احسان کے اعتراف سے کسی مرحلے پر، کسی صورت اور کسی وقت بھی کنارہ نہیں کرتے۔ گویا ''سعید صورتیں'' محسنین کے تذکرے سے عبارت ہے؛ یاد رہے کہ انور سدید مصنف ہی نہیں، تصنیف کو بھی محسن کے زمرے ہی میں گنتے ہیں۔ اس کتاب میں استفادے کے اعتراف اور احسان مندی کے اظہار کی معتدد مثالیں ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ ہر مضمون ہی اسی سلسلے کی ایک مثال ہے، حتیٰ کہ اگر کسی نے مصنف کی ادبی زندگی کے ابتدائی ایام میں ان کی کوئی تحریر چھاپ دی یا اس پر داد دے دی یا پڑھنے لکھنے کے حوالے سے تھوڑی یا زیادہ رہنمائی کر دی؛ اس کے لیے گہری ممنونیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مضمون میں کسی حوالے سے ادبی رسالے ''ہمایوں'' کے ایک مدیر مظہر انصاری دہلوی کا ذکر آ گیا تو انور سدید نے موضوع سے گریز کرتے ہوئے اس بات کا اظہار ضروری سمجھا کہ:

> ''مظہر انصاری کا احسان یہ تھا کہ انھوں نے شیر محمد اختر کے زمانہ ادارت کے نامنظور مسودوں میں سے میرا ایک افسانہ تلاش کیا اور پھر اس کی نوک پلک سنوار کر اسے ہمایوں کے افسانوں کی کہکشاں میں ایک نئے ستارے کی طرح سجا دیا..... ہمایوں میں جگہ ملی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔'' (سعید صورتیں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2009ء، ص:176)

کتاب کے دیباچے میں اپنے سکول کے اساتذہ ہی نہیں، لائبریریوں کے نگرانوں اور ذاتی کتب خانوں کے مالکوں کا تذکرہ بھی نہایت محبت اور احترام سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے احباب جن سے کوئی نئی کتاب، یا کتاب کی اطلاع یا کتاب کی تفہیم کے لیے کچھ بھی مواد میسر آیا ان کے تشکر میں کبھی ان کا قلم رکا نہیں بلکہ اس کی روانی بڑھ گئی ہے۔

انور سدید ابتدائی زمانہ قرأت کے وہ اثرات بھی نہیں بھولے جو مختلف تصنیفات نے دورانِ مطالعہ میں ان پر مرتب کیے مثلاً خواجہ محمد شفیع کے ناول ''عشق جہاں گیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یہ ناول ''تھری ڈائمینشنل'' فلم کی طرح تھا، جس میں ناظر، فلم کا کردار بن جاتا ہے اور واقعہ آپ بیتی محسوس ہونے لگتا ہے..... میں خود اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ میں اس دور میں افسانے کی دنیا میں پہلا قدم رکھ رہا تھا اور مجھے اعتراف ہے کہ خواجہ محمد شفیع نے میرے جذبات پر ایسا شب خون مارا کہ پھر میں ان کے حلقۂ اثر سے نکل نہ سکا۔'' (ص:42)

اسی طرح کسی بھی نوعیت کے علمی استفادے کا فقط حوالہ ہی نہیں دیتے بلکہ اس کا چرچا کرتے ہیں، مثلاً نظیر حسین زیدی کی کتاب ''غالب: تاریخ کے آئینے میں'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے آج بھی ''مجھے اپنا کام کرنے میں بڑی معاونت ملتی ہے۔'' (ص:189)

''سعید صورتیں'' میں ان شخصیات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جن سے قریبی تعلقات نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت اور خدمات کا دل میں بے پناہ احترام موجود تھا لہٰذا مصنف نے ملاقاتوں کی کمی کو مضمون یا خاکہ لکھنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھا بلکہ ان کی شخصیت، خاندان

اورادبی ماحول کے اکثر زاویے اورادبی کاموں کے چنیدہ تذکرے نہایت شخصی انداز اور دوستانہ تپاک سے پیش کر دیے ہیں؛ ایسی ایک مثال شان الحق حقی پر ان کا مضمون ہے؛ شان الحق حقی کے احوال وآ ثار کے مفصل تذکرے اور جائزے کے بعد انور سدید نے اس بات کا بھی اعتراف واظہار کیا کہ:

''میری محرومی ہے کہ مجھے شان الحق حقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے زیادہ مواقع نہیں ملے۔دسمبر 1988ء میں سرکاری ریٹائرمنٹ سے قبل میں نے تمام وقت ادب کے مراکز سے دور گمنام بستیوں میں گزارا۔ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں مستقل قیام کی صورت پیدا ہوئی اور کراچی جانے کے امکانات پیدا ہوئے تو حقی صاحب سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ایک طویل ملاقات مشفق خواجہ صاحب کے کتب خانے میں ہوئی جس میں متعدد ادیب موجود تھے۔اس لحاظ میں ان کا شناسا ضرور تھا لیکن قریب کا ملاقاتی نہیں تھا' میں نے ان کے فن اور شخصیت کا مطالعہ ''اردو نامہ'' کے علاوہ ان کی کتابوں سے کیا اور میرے لیے یہی حوالے کے ماخذات ہیں۔میرے دل میں ان کی نیازمندی کا گوشہ موجود ہے۔''(ص:63,64)

اس اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہیں: انور سدید کی زبان وادب کے تمام گوشوں سے دلچسپی اور بے لوث ادبی معاصرین کے لیے بے پناہ عقیدت؛ نیز،ہمیں دوسبق بھی ملتے ہیں: ایک یہ کہ کسی ادیب وشاعر سے عدم شناسائی کا جواز ''عدم ملاقات'' کو نہیں بننا چاہیے؛ اور دوسرا یہ کہ اپنے کسی معاصر کے لیے دل میں موجود اچھے تاثرات کے واضح اور مفصل اعتراف اور تصنع اور مبالغے سے پاک اظہار میں بخل اور مصلحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔اس کتاب کے تمام مضامین میں یہ خصوصیت فراوانی سے موجود ہے؛ کتاب کے فلیپ پر وزیر آغا کی رائے کا ایک حصہ انور سدید کی اسی خصوصیت کی جانب اشارہ کر رہا ہے: ''ان کی اضافی خوبی یہ ہے کہ وہ جب کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کا برملا اظہار کرتے ہیں اور جہاں سے کوئی بات اخذ کرتے ہیں''متن میں اس کا حوالہ دیتے ہیں۔''

اس بات کے ثبوت میں انور سدید کی کئی کتابوں کے متعدد حصے' اخباری ومجلاتی مضامین' ادبی کالم اور متعدد دیباچے پیش کیے جا سکتے ہیں؛ خصوصاً زیرِنظر کتاب ''سعید صورتیں'' کے مندرجات اس حوالے سے ٹھوس دلیل ہیں۔خود وزیر آغا پر لکھا ہوا مضمون' وزیر آغا سے مصنف کی قربت' استفادے اور عقیدت کی ان گنت لہروں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔

وزیر آغا کی شخصیت میں اپنے دوستوں کے ساتھ ساتھ اپنے جز وقتی یا کل وقتی مخالفین کے لیے جو خوش دلی اور خیر اندیشی کے عناصر اکثر احباب کے مشاہدے میں آئے؛ انور سدید بھی ان کے عینی شاہد ہیں۔اس سیر حاصل مشاہدے کی بنا پر وہ خوش دلی کو وزیر آغا کی فطرت اور احترام انسانیت کو ان کی ''عادت'' قرار دیتے ہیں؛ نیز یہ بھی بتاتے ہیں: ''چونکہ اس عادت کا انھیں علم نہیں اس لیے اسکی نمائش بھی نہیں کرتے۔''(ص:196) مزید یہ کہ دشنام طرازوں کو گلے لگانا' اپنے مقام ومرتبے سے کسی کو احساس کمتری میں مبتلا نہ کرنا' اربابِ اختیار سے مستفید نہ ہونا' دوسروں کے بنائے ہوئے رستوں کو قبول نہ کرنا اور دور دراز مقامات کے نئے یا غیر معروف تخلیق کاروں کو متعارف کرانا اور ان تمام ''مصروفیات'' اور خصوصیات کے باوجود تفخر وتعلّی سے دور رہنا' فی زمانہ بہت بڑے اوصاف ہیں لیکن بقول انور سدید یہ تمام بھی وزیر آغا کی فطرت وعادت کا پختہ حصہ بن چکے تھے اور فطرت وعادت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بڑی بے ساختگی سے ہمارے ہر عمل اور ردِعمل سے پھوٹتی ہیں۔

عام طور پر جب کسی ایسی شخصیت پر لکھا جاتا ہے جس سے رہنمائی حاصل کر کے مضمون نگار یا مدح نگار نے علمی و ادبی مقام پایا ہو تو مضمون نگار یا مدح نگار عموماً اپنے محسن و مربی کے بارے میں دم تحریر تین قسم کے رویوں کا اظہار کرتا ہے؛ ایک: ایک ممدوح سے تعلق کے اظہار کے لیے واقعات ہی بیان کرتا چلا جاتا ہے یا ملاقاتوں میں بکھرے لطائف کو ترتیب وار پیش کرنے لگتا ہے؛ دوم: ممدوح کو اپنا ''گاڈ فادر'' قرار دینے کے باوجود اپنے ''مقام و مرتبے'' کا اظہار ایسی ہنرمندی سے کرتا ہے کہ ''گاڈ فادر'' بطور رہنما غیر معمولی اور بطور لکھاری معمولی نظر آنے لگتا ہے؛ سوم: ممدوح کے کارہائے نمایاں کا فقط دستاویزی ریکارڈ پیش کر کے یا اس سے جدا ہو جانے پر ایک رقت آمیز بیان جاری کر کے شانت ہو جاتا ہے۔

انور سدید ایسا نہیں کرتے' وہ صاف و شفاف اسلوب میں اپنے باطن کو سامنے لاتے ہیں اور ممدوح کے لیے دل میں موجود جو بھی مقام' گوشہ اور زاویہ جگمگا رہا ہوتا ہے، اسے ''اظہر من الشمس'' کر دیتے ہیں۔ انور سدید اپنے ممدوح کو روشنی کے دائرے میں لانے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں؟ اس حوالے سے کچھ کلیدی اقتباسات ''نظیر حسین زیدی'' پر لکھے مضمون میں موجو ہیں؛ ان اقتباسات سے نظیر حسین زیدی کی شخصیت و خدمات کے ساتھ ساتھ انور سدید کے ذہن' ذوق اور ادبی ترجیحات کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ (خصوصاً ص: 191 پر درج ایک اقتباس..... ''شخصیات و مباحث میں انہوں نے جن چند ادیبوں..... کا تعارف نامہ لکھا ہوا ہے'')

ان اقتباسات سے قارئین ان مراحل سے باخبر ہو سکتے ہیں جن سے انور سدید اس نوعیت کے مضامین لکھتے ہوئے گزرتے ہیں؛ مثلاً:

1۔ انور سدید اپنے شخصی مضامین میں ادیبوں اور شاعروں کو ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں سے بھی دریافت کرتے ہیں۔
2۔ مصنفین پر اظہار خیال تب کرتے ہیں جب ان کی تصنیف یا تصانیف ان سے ہم کلام ہوتی ہیں۔
3۔ کچھ شخصیات پر صرف ایک مضمون یا مقالہ لکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تو اس پر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔
4۔ آسمان ادب سے ٹوٹے ہوئے ''ستاروں کی دریافت نو'' کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں اور اس فریضے کو ادا کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔

''سعید صورتیں'' میں کئی ایسے اقتباسات بھی مل جائیں گے جنھیں حوالہ بنا کر درج کیجیے تو ممدوح کی شخصیت و فن کے اکثر (بعض اوقات تمام) زاویے سامنے آ جائیں گے؛ مثلاً شریف کنجاہی کے حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے جو ان کے بارے میں تمام شخصی' فکری اور فنی خصوصیات قاری تک پہنچا دینے کی خصوصیات رکھتا ہے:

> ''شریف کنجاہی نے کسی خاص نظریے کی جامد و راسخ پیروی نہیں کی' بلکہ ہمیشہ صداقت کی جستجو کی' کچلے ہوئے انسانوں کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھے اور قومی زبان اردو کا احترام کرتے ہوئے پنجابی ادب کے فکری اور لفظی زاویے ابھارنے کی سعی کی۔ انھوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن زندگی کشادہ نظری سے گزاری اور ایک حقیقی شریف انسان تسلیم کیے گئے۔ ان کی غزل ان کے داخل کی آئینہ دار اور امیدوں کا مرقع ہے۔'' (ص: 73,74)
>
> ذرا غور فرمایئے کتنا مکمل اقتباس ہے لیکن معلومات کی فراوانی کے باوجود بوجھل اور خشک نہیں ہے۔

ضیاء الحق قاسمی پر مضمون ان کی قہقہہ ریز شخصیت اور ظریفانہ خدمات کا نہایت سنجیدہ اعتراف ہے لیکن اس ''سنجیدہ اعتراف'' کا اظہار

ضیاءالحق قاسمی کی آواز کی مانند، تازہ اور شگفتہ ہے مثلاً مضمون کے آخر میں اس شگفتہ نگار کے حوالے سے نہایت غم انگیز خبر اس طرح معرض اہار میں آئی ہے:

''وہ (ضیاءالحق قاسمی) مزاحیہ مشاعرے منعقد کر رہے تھے اور بے دریغ قہقہے تقسیم کر رہے تھے کہ اچانک عقبیٰ سے ضمیر جعفری، دلاور فگار، رئیس امروہوی، شفیق الرحمٰن، سید محمد جعفری، نذیر شیخ اور کرنل محمد خان نے مزاحیہ مشاعرے کا دعوت نامہ بھیج دیا اور وہ بیاض اٹھا کر مشاعرہ پڑھنے چلے گئے اور واپس نہیں آئے۔'' (ص:85)

بیاض اٹھا کر چلے جانا، ظاہر کر رہا ہے کہ ممدوح کی ''رگ جاں'' اور رگ ظرافت'' اصل میں دونوں ایک ہیں۔

''کشمیر اداس ہے'' ایسی رپورتاژ لکھنے والی محمود ہاشمی کو اردو دنیا بھولے ہوئے تھی۔ انور سدید نے بھرپور سوانحی، شخصی اور تنقیدی مواد کا حامل مضمون لکھ کر سب کی جانب سے فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے (گو یہ ''فرض کفایہ'' ہرگز نہیں ہے۔ ایسے فراموش ادیبوں کی تخلیقی وتنقیدی جہات کو موضوع بنانے کا سلسلہ رہنا چاہیے لیکن شاید اس نویت کے غیر منفعت بخش کام کے لیے آج کے دور میں سوائے انور سدید کے، کسی کے پاس فرصت نہیں ہے۔)

اسی طرح کا ایک اہم نام مرزا محمد سعید دہلوی کا ہے، بقول انور سدید ''آج کی نئی نسل ان کے کام سے تو کیا، ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔'' انور سدید نے مرزا محمد سعید دہلوی کی شخصیت، علمیت، درویشی اور فنی وفکری انفرادیت کو کچھ اس طور سے پیش کیا کہ مضمون کے اختتام پر مضمون نگار کا دکھ اور تاسف تمام اہل دل قارئین میں منتقل ہو جاتا ہے۔

انور سدید کو ایسے فراموش اور شہرت سے بے نیاز تخلیق کاروں سے بڑی دلچسپی ہے، آج کے دور میں جب ادبی حلقوں میں اشاعتِ کتب اور حصول شہرت کے لیے عجلت پسندی عام ہے، وہ ایک بزرگ اور درویش شاعر نجمی نگینوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس بات کا تذکرہ خصوصی طور پر کرتے ہیں:

''انھیں ایک کتاب چھپوا کر دوسری کتاب شائع کروانے کی شاید جلدی نہیں تھی، سخن کو پختہ کرنے کی فکر زیادہ تھی.....
وہ آج کے نئے سخن وروں سے مختلف تھے جو مرشد سے تعویذ حاصل کرتے ہیں اور ایک برس میں تین چار دیوان چھاپ ڈالتے ہیں۔'' (ص:177)

اس مضمون میں نجمی صاحب کے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ معاصر ادبی صورتحال بھی آشکار ہے۔

ایک بھولی بسری لیکن عظیم الشان شخصیت خواجہ عبدالوحید کو بھی موضوع بنایا گیا ہے؛ ان پر لکھے مضمون میں، سوانح، خاکے اور تنقیدی مطالعے کے زاویے اور ذائقے یکجا ہو گئے ہیں۔ ماضی کا علمی وادبی ماحول جو علامہ اقبال، سر عبدالقادر، مولوی احمد دین، علامہ عبداللہ یوسف علی اور مولانا احمد علی لاہوری ایسے اکابر سے جگمگا رہا تھا، جیتی جاگتی صورت میں قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کی شخصیت میں بھی (مصنف کی پسندیدہ خصوصیات) دیانت داری، خوداری، بندہ نوازی، علم پروری اور ادب دوستی پوری طرح موجود ہیں اور یہ خصوصیات انھیں مصنف کے دل اور حلقہ ادب میں مکرم رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ (خواجہ عبدالوحید، مشفق خواجہ کے والد تھے)۔ شاید میر غلام بھیک نیرنگ بھی اسی لیے موضوع بنے ہیں کہ:

''فقر واستغنا اور انکسار وایثار ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ نمود ونمائش اور جاہ وحشمت کی انھیں تمنا نہیں تھی چنانچہ علمی،

ادبی، سیاسی اور سماجی سطح پر ایک ولولہ انگیز، تحرک آشنا، فعال اور بھرپور زندگی گزارنے کے باوصف یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نیرنگ آج کی نئی نسل کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔'' (ص:129)

اسی طرح طاہر لاہری کی خودداری، ایمانداری، محنت شاقہ اور ادبی ریاضت کے تفصیلی تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے روشن تر پہلو احسان مندی اور محسن شناسی کو مختلف واقعات کے ذریعے سے واضح کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کیونکہ یہ خود مصنف کی بھی خصوصیات ہیں۔ عارف عبدالمتین کی شخصیت کا سارا حسن ان کے مزاج کے ساتھ ساتھ ان کی فکری ارتقا سے بھی جڑا ہوا ہے، سو انور سدید نے اپنے مختصر مضمون میں ان سب پرتوں اور شخصیت و فن کے بدلتے منظروں کو سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کر دیا ہے۔

خواجہ عبدالرشید پر لکھے مضمون میں حیرت اور تاسف بکھرے ہوئے ہیں۔ حیرت اس حوالے سے کہ خواجہ عبدالرشید، شعبہ طب سے کل وقتی وابستگی کے باوجود ادب، مذہب اور فلسفے سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور حد درجے کے علم دوست، ادب نواز اور تحقیق پسند شخص تھے؛ اور انھوں نے ''اپنی زندگی نام و نمود اور شہرت و ستائش سے بے نیاز ہو کر گزاری تھی'' (ص:105) کتاب سے خواجہ عبدالرشید صاحب کے عشق نے ان کے ذاتی کتب خانے کو تخلیق کیا جو اب لاہور میوزیم اور دیال سنگھ لائبریری میں محفوظ ہے۔ انور سدید کا تاسف یہ ہے کہ ایسی سعید روحوں کی رخصتی سے دنیا کی تاریکی بڑھ رہی ہے۔ (ص:105) اس مضمون کے کسی فقرے سے مصنف اور ممدوح کی ملاقات کا تاثر نہیں ابھرتا لیکن اظہار خیال میں ایسی دل بستگی اور تعلق کی گرم جوشی ہے کہ خود مصنف خواجہ صاحب کے حلقہ احباب کا ایک فرد نظر آ رہا ہے۔

اختر حسن ایک با اصول افسر، چیف الیکشن کمشنر اور پنجاب کے گورنر رہے۔ انور سدید نے انھیں ایک ادب نواز شخص اور انجمن ترقی اردو کے صدر کے طور پر موضوع بنایا ہے۔ اختر حسین کو انھوں نے ''ایثار پیشہ، غنی مزاج اور درویش صفت انسان'' پایا جو ''مستعدی، تندہی اور جانفشانی'' سے کام کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ (ص:11)

جاوید شاہین کا خاکہ یا شخصی مضمون، ذاتی ملاقاتوں سے بجائے ان کی خودنوشت سوانح، انٹرویوز اور کسی حد تک ان کے شعری کلام اور ادبی ماحول سے برآمد کیا گیا ہے؛ یہ مختصر مضمون جاوید شاہین کی شخصیت، سوانح، فنی محاسن اور فکری آفاق کا عکس جمیل ہے۔

خلیق ابراہیم خلیق نہ صرف شاعر تھے بلکہ ''غالب'' ایسی دستاویزی فلموں کے خالق بھی تھے، ان کی رحلت کو ''پاکستانی قوم میں ایک اور تہذیبی انسان کی کمی'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے بعض ترقی پسند ادیبوں کی طرح غربت، خودی اور غیوری کا اعلان نہیں کیا، نہ مفلسی کو رومانٹی سائز (Romanticise) کرنے کی کاوش کی اور اپنی زندگی ایک زندہ دل مرد درویش کی طرح بسر کی جس کی ٹھوکر میں زمانہ تھا۔'' (ص:38)

انور سدید بے ملمع زندگی کے حامی و ناصر ہیں؛ انھوں نے قتیل شفائی کی آپ بیتی ''گھنگھرو ٹوٹ گئے'' اور قتیل شفائی کی دیکھی بھالی زندگی کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا تو لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک اعلان کر دیا: ''یہ آپ بیتی صداقت کے عنصر سے مامور نظر آتی ہے اور قتیل شفائی جیسے تھے، ویسے ہی نظر آتے ہیں۔'' (ص:150)

''سعید صورتیں'' ادیبوں اور کتابوں کے ایک ایسے تعارف و تذکرے پر مبنی کتاب ہے جس میں ماضی قریب کا سارا ادبی ماحول، لحہ موجودگی کی گریز پائی سے ہم آہنگ بھی ہے اور ہم کلام بھی۔

◆◆◆

بیاد اظہر جاوید

ڈاکٹر ناصر مستحسن

اظہر جاوید سب کو ہنسایا کرتے تھے، ان کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، بزم آرائیاں اور یاریاں بہت مشہور ہیں اس کے باوجود ان کی زندگی پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ انھوں نے ''امروز'' اخبار سے رشتہ جوڑا جس پر وہ معتوب ہوئے اور پھر ''تخلیق'' (لاہور سے چھپتا ہے) سے زندگی بھر کا ناتا جوڑا اور ایسا جوڑا کہ اشتہار ملیں نہ ملیں بڑی باقاعدگی سے اظہر جاوید صاحب ''تخلیق'' کا پرچہ نکالا کرتے تھے۔ صہبا لکھنوی صاحب مدیر ''افکار'' کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد افکار بند ہو گیا۔ وزیر آغا مدیر ''اوراق'' کے انتقال کے بعد وہ بھی بند ہو گیا اور اگر بند نہیں بھی ہوا تو صاحب فراش ضرور ہے، ایسے ہی ''فنون'' احمد ندیم قاسمی کے بعد بند ہو گیا، لیکن پچھلے دنوں تخلیق کا اظہر جاوید نمبر دیکھا تو ایک مسرّت کا احساس ہوا کہ اس دور قحط الرجال میں بھی اظہر جاوید کا ''تخلیق'' زندہ ہے، پھر مجھے سونان اظہر کا، جو اظہر جاوید کے بیٹے ہیں، اپنے والد محترم کے نام خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں کوئی ادیب نہیں، نقاد نہیں اور نہ ہی میری علمی بساط ہے لیکن اپنے والد کا رسالہ میں ضرور نکالوں گا، دل خوش ہوا کہ چلو باپ سے محبت کی یہ ادا بھی خوب ہے۔ اگر ایسا بھی خیال مندرجہ بالا رسالوں کے ساتھ بھی ہوا ہوتا تو ایک روایت تو باقی رہتی ویسے بھی جس ماحول میں ہم زندہ ہیں وہاں لکھنا لکھانا، پڑھنا پڑھانا ایک Taboo کی شکل اختیار کر رہا ہے، اگر کوئی آپ سے پوچھے ''ہاں بھئی! آج کل کیا ہو رہا ہے'' اور آپ جواب دیں ''ان دنوں میں منٹو پڑھ رہا ہوں، کرشن چندر پڑھ رہا ہوں، اب منٹو کو پڑھ لینے کے بعد T.S. Eliot کی ویسٹ لینڈ پڑھوں گا'' تو سوال کرنے والا آپ کا جواب سن کر ایسا ظاہر کرے گا جیسے آپ زمین کے باسی نہیں، مریخ کے Alien ہیں، یہ ٹیبو Taboo، یہ ایلیئن Alien ہم ہیں، ہیں کیا دور آ گیا ہے۔

ایسا جس کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

اظہر جاوید کو میں نے پہلی بار 2000ء مئی میں دیکھا جب میرے والد محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب کا بائی پاس آپریشن ہوا تھا تو اظہر صاحب لاہور سے عیادت کے لیے تشریف لائے تھے۔ درمیانے قد کے، رنگ قدرے سانولا، چمکدار آنکھیں، لمبی سی ناک، اس کے ساتھ ساتھ سپید لمبے بال جن کو دیکھ کر چاند کی بڑھیا کا تصوّر ذہن کے نہاں خانہ سے آنکھوں کے پردوں پر آ جاتا ہے، مشہور کارڈیک سرجن ڈاکٹر عبدالرحمان نے میرے والد کا بائی پاس آپریشن کیا تھا۔ ان دنوں نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز، آرٹس کونسل میں بدل گیا تھا۔ صبح و شام مشہور ادیبوں، شاعروں، مصوّروں، فنکاروں، اداکاروں سمیت مختلف الجہات قسم کے لوگ آتے تھے۔ کبھی سہام مرزا، منزہ سہام کے ساتھ آ رہے ہیں تو کبھی حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی آ رہے ہیں۔ کبھی نثار کھوڑو تو کبھی ڈاکٹر فاروق ستار۔ ایسے ہی لوگوں میں اظہر جاوید بھی تھے۔ وہ ہنسی مذاق کرنے والے آدمی تھے، والد سے کہا ''یار! اب ٹھیک ہو جا تو لاہور آویں، نئیں تے میں آ جاواں''۔ قہقہہ.....انھوں

نے نئے لکھنے والوں کو تو خوب پروموٹ کیا اور ایسا پروموٹ کیا کہ کبھی وہ اظہر جاوید کو کسی محفل میں دیکھ لیتے تو کنی کترا جاتے جس پر اظہر صاحب بولتے (اور کچھ نئیں یار! نواں نواں شوق اے، اے وی کر لینے دیو)

بہت خیال' بہت خواب سو گئے تھک کر خدا کرے تری یادیں کہیں نہ سو جائیں
(اظہر جاوید)

یوں تو والد محترم کے پاس روزانہ کی بنیاد پر بے انتہا خطوط اور رسالے اور کتابیں آتی تھیں لیکن ہر پندرہویں دن سبز لکھائی سے مزیں ایک ایسا خط آتا تھا جس کو والد صاحب پہلی فرصت میں پڑھتے اور ایک تبسّم سا ان کے چہرے پر آتا اور وہ خط اظہر جاوید کا ہوتا تھا میری ان سے 4-5 ملاقاتیں ہوئیں۔ بخدا میں ایسا محسوس کرتا تھا جیسے ایک زمانے سے اظہر صاحب مجھے جانتے آئے ہیں، اظہر جاوید 4 جنوری 1938 کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے اور سترہ برس کی عمر میں انھوں نے باقاعدہ شعر گوئی اور صحافت شروع کی تھی۔ سرگودھا کے چند ہفت روزہ اخبارات (ضرب مجاہد، رفیق) کی ادارت کی، ممتاز شاعر الطاف مشہدی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''خلوص'' نکالا، لاہور آ کر ایک ادبی ماہنامے ''عکس نو'' کی ادارت کی اور اسی سلسلے میں کراچی آ گئے، اس کے بعد روزنامہ ''امروز'' لاہور میں رپورٹر ہو گئے، لیکن 1969ء میں انھوں نے ماہنامہ (تخلیق) لاہور سے جاری کیا اور 43 سال تک مسلسل اس کی اشاعت جاری رہی۔ پیسے کی کمی نے ان کے استقلال کو مجروح نہیں کیا، وہ خود ہی لفافوں پر پتے لکھتے، پھر ان کو پوسٹ کرتے، یعنی مالک بھی خود، چپراسی بھی خود، ڈاکیے بھی خود ایک آدمی اور اتنے کام اور سب سے بڑی بات ان سارے جھمیلوں کے باوجود ان کے چہرے پر رونق ہر وقت موجود رہتی تھی۔ غزلوں کا اوّلین مجموعہ ''غم عشق گر نہ ہوتا'' تھا۔ انھوں نے بلغارین افسانوں کا ترجمہ بھی کیا جو بہت خوب ہے۔ اس کے بعد ساحر لدھیانوی سے دلی محبت کے باعث ساحر پر ان کی ایک کتاب بھی آئی۔ نیز تمام عمر لکھنے لکھانے ہی میں گزری، تمام عمر وہ کم پیسوں میں گزارا کرتے رہے لیکن کبھی بھی کسی دوست کے سامنے دست دراز نہیں کیا۔ خودداری ان کا وصف ہے، یہ تھی خودداری اس شخص کی جس نے خودی نہ بیچی، غریبی میں نام پیدا کیا۔

ویسے تو ہمارے ملک پر فوجی آمروں کا عفریت مسلط رہا ہے لیکن ضیا الحق کا دور پاکستان کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ آزادی تحریر و تقریر کی پابندی، سخت سنسر شپ، روشن خیال ادیبوں اور صحافیوں نے جمہوریت کے سلسلے میں ایک قرارداد پر دستخط کیے، ان دستخط کرنے والوں میں اظہر جاوید بھی تھے۔ ضیا الحق نے ان سب کو ملازمتوں سے برخواست کر دیا۔ بے روزگاری کا یہ وقت اظہر جاوید کے لیے بڑا ہی کٹھن تھا لیکن ہمت نہ ہاری ''تخلیق'' پھر بھی نکلتا رہا اور گھر بھی چلتا رہا۔

اظہر جاوید کی شخصیت کا یہ پہلو قابل قدر ہے کہ انھوں نے کبھی ناجائز طور پر مراعات حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ ''تخلیق'' کو غیر تخلیقی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا۔ چاہتے تو وہ تخلیق سے مالی فوائد بھی حاصل کر سکتے تھے لیکن باضمیر انسان مر تو سکتا ہے، جھک نہیں سکتا۔ وہ اپنا کام کرتے رہے، چنانچہ 2012ء میں ان کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی ملا جو پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز ان کو 23 مارچ 2013ء کو ملنا تھا لیکن وقت نے مہلت نہ دی۔ 13 فروری 2012ء کی رات کو وہ بالکل صحیح تھے لیکن محبت کے عالمی دن 14 فروری 2012ء کو ہم سے رخصت ہو گئے۔

اظہر جاوید ہمہ جہت شخصیت تھے، لیکن میرے خیال میں ان کی خاص جہت ان کی شاعری ہی ہے ان کی شعری حیثیت ہی انھیں صحافت کے ریگزار میں لائی جہاں وہ تپ کر کندن بننے تک کے عمل سے گزر کر اچھے شاعر اور بہترین صحافی گردانے گئے۔ اب تو یوں محسوس

ہوتا ہے کہ ہر کوئی صحافی ہے، ہر کوئی کالم نویس ہے، لیکن کسی کو یہ نہیں پتہ کہ اصل صحافت ہوتی کیا ہے، کیا اس کے رموز ہوتے ہیں اور کیا اس کے مقاصد۔ جب ہی آج کل اچھے صحافی عنقا ہیں، خال خال ہیں۔ اظہر جاوید کو صحافت کی وجہ ہی سے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا اور صحافت ہی کی وجہ سے ان کی شخصیت نہ بکی نہ جھکی، آج سیم وزر کے دہانے کھلے ہوئے ہیں اور نام نہاد صحافی خوب ہاتھ بھر بھر کے کمار ہے ہیں، حق پر باطل غالب ہے، اور سچ پر جھوٹ، ایمان پر نام نہاد فرقے۔

اظہر جاوید کی کتاب ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کے مطالعے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ رومانی شاعر تھے، اور ہم رومانیت کے متضاد دور میں سانس لے رہے ہیں غالباً یہ عہد رومانیت شکن عہد ہے، اظہر جاوید، ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی، فیض اور ابن انشا سے زیادہ متاثر تھے اور الطاف مشہدی سے قرب تعلق کے باعث، قدرت نے انھیں رومانی مزاج عطا کیا لیکن ان کی اپنی ہی ایک دنیا تھی جس کو آپ بلا کم و کاست رومانی دنیا کے زمرے میں لا سکتے ہیں، ان کے کلام کی مشابہت آپ کلام فراز سے بھی کر سکتے ہیں۔

تمام عمر کی بے چارگی کا حاصل ہیں یہ چند شعر جو مقبول ہیں حسینوں میں

(بشکریہ روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور.....19-06-2014)

نوٹ:۔ قارئین کے لئے یہ اطلاع دینا بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر ناصر مستحسن ممتاز نقاد محمد علی صدیقی (مرحوم) کے صاحبزادے ہیں۔

◆◆◆

دُعائے صحت کی اپیل

گذشتہ ایام **پروفیسر شاہ محمد سبطین شاہجہانی** سالارِ اعظم حلقہ جعفری رحمانی چشتی صابری پاکستان سجادہ 3 روزہ عرس میں

شرکت کے بعد اسلام آباد کی طرف آ رہے تھے کہ ہری پور کے قریب حادثہ پیش آیا۔ آپ کی گاڑی مترادف سمت سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا گئی جس سے آپ شدید زخمی ہوئے۔ مشائخ عظام، مریدین، معتقدین، متوسلین ملک کے مختلف حصوں سے عیادت کے لئے تشریف لائے۔ جن میں حضور قبلہ دیوان سیّد احمد مسعود سجادہ نشین پاکپتن شریف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے مشائخ اکرام، اپنے دوستوں اور اہلِ حلقہ سے دعا کی درخواست کی ہے۔ (برائے رابطہ: 0303-5071990، 0333-4884902)

دوسری طرف **صابر لودھی صاحب** بھی شدید علیل ہیں۔ تمام قارئین سے گذارش ہے کہ وہ ان دونوں حضرات کی صحت کے لئے خدا کے حضو سجدہ ریز ہوں۔ (رائے رابطہ: 0344-4428567)

(ادارہ تخلیق)

منظومات

امین راحت چغتائی

بے نور وسعتیں

آؤ حدیثِ مرگِ تبسّم سنائیں ہم
اِک شہرِ ناشناس پر آنسو بہائیں ہم
اے بزمِ میکدہ کے رفیقو! تمھیں کہو
کس کس کی یادِ موسمِ گُل میں منائیں ہم
اُٹھو! طلوعِ ظلمتِ شب کی نوید پر
پلکوں پہ حسرتوں کے ستارے سجائیں ہم
ڈھونڈو کدھر گئے وہ بہاروں کے زمزمے
سوچو کہاں سے آتشِ احساس لائیں ہم
لے کر خیال و فکر کی محبوس مشعلیں
بے نور وسعتوں میں کہاں پھیل جائیں ہم
زخمِ نظر کہ زخمِ جگر، چارہ گر بتا
اِک فرصتِ نفس میں تجھے کیا دکھائیں ہم
ہر کنجِ گلستاں پہ ہے صیّاد کی نظر
کس شاخِ گُل پہ اپنا نشیمن بنائیں ہم
ہر سو ہے تند و تیز بگولوں کا اہتمام
کس حوصلے پہ شمعِ تمنّا جلائیں ہم
پھر سوچتے ہیں کوئی تو دستک گھروں پہ دے
گلیوں میں شب کے پچھلے پہر پھیل جائیں ہم

OOO

ایوب خاور

ملال کی ایک رات

کچھ نہیں ہے
میرے آئینہ و مہتاب و سبو خالی ہیں
صفحۂ دل کی معتوب شہنشاہ کی مسند کی طرح
حرمتِ لفظ و معانی بھی گنوا بیٹھا ہے
خطۂ عمر معطل ہے وجود
عالمِ ہجر میں زنجیر ہے یہ خلوتِ ذات
آئینہ بابِ ندامت ہے اور اس بابِ ندامت سے
گریزاں میرا عکسِ متروک
عرصۂ وقت کے دامن میں
کوئی شاخِ سحر ہے نہ کوئی شامِ جمال
مگر اِک رنگِ ملال
اے دیارِ رُخ آیندہ کی مجذوب ہوا
لوحِ مہتاب سے اُترے کوئی صبح تحریر
مگر اِس دشتِ شبِ رزم کے سنّاٹے میں
وہ اندھیرا ہے کہ ان ہاتھوں سے گرتے ہوئے لمحے
نہیں دیکھے جاتے
چشمِ حیراں پہ برستے ہوئے نیزے نہیں روکے جاتے
ایک اندوہِ مسلسل کے سوا
برزخِ جاں میں کوئی سنگِ سزا ہے نہ کوئی ساعتِ اجر
سطرِ آیندہ! تجھے حرفِ ملامت سے کیا ہے آغاز

OOO

مظفر ایرج (انڈیا)

اجتہاد

آگ
پانی سے
ہوا سے
اور
مٹی سے اُٹھایا جا چکا میرا خمیر
میں
انا الحق
بولنے کی استطاعت ہی
نہیں رکھتا
تو
کیوں کر قتل ہو جاؤں
میں
سچ کا زہر پی کر
کس لئے
سقراط کہلانے کی ضد کروں
مجھے انساں ہی رہنے دو
مجھے تو
ابنِ آدم کی طرح
دنیا میں جینا ہے
بہت دن تک
کہ
مجھ کو
آدمی کی کوکھ میں
خواہش کا
میٹھا زہر
بونا ہے!!

OOO

منظر ایوبی

ہائیکو

دل چھینا خود ہی
بھولے بن کر پوچھو ہو
کس نے کی چوری

گگری بھر گوری
کھیت میں کوئی بیٹھا ہے
آس میں پانی کی

صدیاں بیت گئیں
جن صبحوں کی راہ تکی
وہی نہیں آئیں

کامل ہے ایمان
ذرّے ذرّے کا دل چیر
دیکھ خدا کی شان

OOO

بشریٰ رحمٰن

آنکھیں

پل دو پل تھا ڈیرہ تیرا
جوگن بن گئیں آنکھیں
تم جب دل جنگل میں اُترے
ساون بن گئیں آنکھیں
تم نے جب پتوار سنبھالے
چھم چھم برسیں آنکھیں
تم جب عشق کنارے پہنچے
رقص میں تھیں یہ آنکھیں
تم نے راہ بدل لی اپنی
ساتھ گئیں یہ آنکھیں!!

OOO

پروین شیر (کینیڈا)

شکستہ سپر

مہرباں، نازک رداؤں کی تہوں میں
نرم باہوں کی پناہوں میں ہے رقصاں یہ زمیں
وہ اک سپر بن کر
جھلسنے سے بچا لیتی ہیں اس کو

نغمہ گر صیقل فضائیں
سبز ریشم کی قبا پہنے زمیں
ہاتھوں میں تھامے نسترن، نرگس، سمن
نازک تہوں میں
زندگی ہے کس قدر محفوظ لیکن.....
لحظہ لحظہ ہر پرت معدوم ہوتی جا رہی ہے!
ایک دن جب آخری تہ کی سپر ہو گی شکستہ
مہرباں اوزون (Ozone) کی چادر میں لپٹی
یہ زمیں جب بے قبا ہو جائے گی تو
ارغوانی آگ مہلک انگلیوں سے
اس کی شادابی کو اپنی آنچ میں جھلسائے گی اور
یہ دھواں بن کر خلاؤں میں اُڑے گی.....!

OOO

ظفر علی راجا

حقیقت

مجھے محسوس ہوتا ہے یہ کا ہے
میرے اندر شجر پھیلا ہوا ہے
اور اس میں اک نگر پھیلا ہوا ہے
ہر اک ٹہنی پہ اس کی آشیاں ہے
اور اس میں پنچھیوں کا اک جہاں ہے
پرندے روز بھرتے ہیں اُڑانیں
سُنا کر ہجرتوں کی داستانیں
رگِ ہر گل میں خوشبوئیں رواں ہیں
اور ان پہ رقص کرتی تتلیاں ہیں
کِھلے ہیں پھول اِس کی ٹہنیوں پر
فسونِ رنگ ہے ہر ایک منظر
فسونِ رنگ کے پردے میں لیکن
ہے پوشیدہ حقیقت اور ہی کچھ
چمکتے اور مہکتے اِس شجر کی
جڑوں کے چار جانب لامکاں تک
قیامت کی خزاں پھیلی ہوئی ہے
فنائے بیکراں پھیلی ہوئی ہے
میں اپنی بے بسی کی آنکھ کھولے
حقیقت کو چھپاتا پھر رہا ہوں
مرے اندر شجر پھیلا ہوا ہے
اور اس میں اک نگر پھیلا ہوا ہے

OOO

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

دُکھیاری ماں (دوہے)

کیسے بولے ماتری[1] کھولے من کی بات
تالے لاگے جیبھ پر چابی جگ کے ہات

پالے کتنے ناز سے دھرتی ماں نے پوت
بیٹھی ہے سر تھام کے نکلے سبھی کپوت

چرخہ ٹوٹا آس کا نہ پُونی نہ سوت
روئے بوڑھی ماتری بچھڑے سارے پوت

ماں بیچاری مر گئی بچے تھے پردیس
رشتہ ٹوٹا آس کا پاتی نہ سندیس

بیٹوں نے پردیس میں اونچے محل بنائے
ٹوٹی کٹیا آپنی بڑھیا کے من بھائے

دُکھ جھیلے ماں باپ نے کتنے کشٹ[2] اُٹھائے
جس پل آئی جیرنی[3] کھوٹے نکلے جائے

وہ تھی ان کی ماتری پنچھی سوگ منائیں
اُجڑی بگیا دیکھ کر جائیں تو کِت جائیں

OOO

---

(۱) ماں (۲) مصائب (۳) بڑھاپا

جاوید زیدی (امریکا)

چوکھٹ

محبت بھی تو عبادت ہے
جبھی تو ایک مدّت سے
پڑا ہوں اس کی چوکھٹ پر
جھکائے سر
اگر چاہوں بھی
اُٹھ کر
جا نہیں سکتا
کوئی نغمہ محبت کے سوا
میں گا نہیں سکتا
عجب علّت ہے، شاید
فی زمانہ ایک ذلّت بھی
محبت
میری خصلت ہے محبت
میری نابیناداوی کی
وہ اُلفت ہے
جو بچپن سے مجھے
قصے محبت کے سناتی تھی
دعائیں پھونک کر ہر صبح
اسکول جانے کو مجھے اٹھاتی تھی
وہ سونے سے ذرا پہلے
کربل کتھا مجھ کو سناتی تھی
کہانی جو مرے خوں میں رواں ہے
بڑھاپے میں یہ جیسے جواں ہے
محبت اصل ہے میرا
میں اس کو چھوڑ کر
کبھی بھی جا نہیں سکتا
بنا یارِ محبت کے
جی نہیں سکتا، میں
شاید مر نہیں سکتا
میں کوئی کام بھی
اس کے سوا تو کر نہیں سکتا
یہ عادت ایسی عادت ہے
یہ علّت ایسی علت ہے
کہ دل میں بیٹھ جائے تو
نکلنا اس کا مشکل ہے
کوئی مشکل کشا نہیں اس کا
دارو ہو
اس نشہ کا توڑ ہو
محبت ایسی عادت ہے
زمیں پر ایسی جنت ہے
کہ فردوسِ بریں بھی
جس پہ ہو نازاں
خدا بھی خود
ندامت کے پسینے کے
وہ موتی رول دے
بندوں کی بخشش پر
جو زیدیؔ کی طرح
عاصی ہیں نادم ہیں

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

ساری عمر کا حاصل کیا ہے؟

کبھی کبھی یہ سوچتی ہوں میں
جو بھی کچھ ہے آخر اس کی منزل کیا ہے؟
ساری عمر کا حاصل کیا ہے؟
کیا وہ جھولا، کیا وہ تختی، کیا وہ آنگن
اور کیاری سے اُٹھتی خوشبو
اور وہ ماں کے ہاتھ کا کھانا
اور بابا کا چیز دلانا
کسی کو دیکھ کے دل میں اُٹھنے والی خواہش
اور وہ پیار کی وقتی خوشبو
ریت پہ لکھا آدھا نام
دنیا بھر کی اُٹھتی نظریں
ماں کے دل پہ رکھا بوجھ
یہ شہرت یا وہ بدنامی
اور وہ دھوکے جو اس دل کو دیئے ہیں خود ہی
یا وہ نمازیں جو عجلت میں ادا ہوئی ہیں
یا مٹھی میں دبے ہوئے ناکافی پیسے
اور دوا کی خالی شیشی
اور کسی کی آنکھ سے گرنے والے آنسو
لمبی ہچکی اور خاموشی
کبھی کبھی یہ سوچتی ہوں میں
جو بھی کچھ ہے آخر اس کی منزل کیا ہے؟
ساری عمر کا حاصل کیا ہے؟

OOO

شہزاد نیر

تم اُداسی کو دیکھ سکتے ہو

اداسی صبح کی پہلی کرن کو کٹاتی ہے
روشنی میں چھپ کے آتی ہے
اُداسی آنکھ میں گھلتی، رگوں میں پھیلتی
دل سے لپٹتی ہے
اُداسی پتلیوں میں رقص کرتی ہے

اُداسی سسکیوں سے لفظ لے کر
حسرتوں سے آنکھ لیتی ہے
مجسم بے دلی سے ہجر کی تجسیم
کرتی ہے
اُداسی وقت کی دھنکی ہوئی
روئی سے
اپنا پیرہن بنتی ہے، رنگوں پہ
اُترتی ہے
یہ دن کی بھیڑ میں اوجھل نہیں ہوتی
خوشی اور غموں کے بیچوں بیچ چلتی
دور سے پہچانی جاتی ہے

اداسی دوپہر کی دھوپ کی قاشیں
نگلتی ہے
سلگتے اشک میں گھل کر
نظر کے سامنے نم دار پردہ تان
دیتی ہے
گھنی دلدل کی صورت اپنے اندر
کھینچ لیتی ہے
ہر بن مو سے چپکتی ہے

اُداسی شام اوڑھے خامشی کے گھر
اُترتی ہے
تھکی آنکھوں سے دیواروں کو تکتی
درد کی تانیں پکڑتی
ہجر کے آنگن میں چلتی
راگ کے دل میں دھڑکتی ہے
بدن کے تار کی لرزش میں ڈھل کر
بید مجنوں سی لرزتی ہے

اداسی رات کے کاجل سے دو آنکھیں
بناتی ہے
برسنے کو ترستی تلملاتی ہے
اُداسی جاگتی ہے سوچتی ہے سو نہیں
سکتی
سحر شب آنکھ میں رہتی ہے پھر بھی رو
نہیں سکتی
اداسی کاٹتی ہے کٹ نہیں پاتی
دلوں میں بانٹتی ہے خود کو لیکن بٹ
نہیں پاتی

OOO

عبیرہ احمد

گداگر کا گیت

(۱)

اے سخی!
اک نظر کی بھیک دے
آنکھ بھر کے خواب دے
ہو اِدھر بھی اک نگاہِ واپسیں
دے مری نگاہ کا جواب دے
اے سخی!
پھر وہی مضطرب سی اک نظر
مختصر سی اک نظر.....
اک نظر دلِ تباہ حال پر
کوئی تبصرہ مرے ملال پر.....؟
جنبشِ مژہ سے کوئی اسمِ درکشا ہی آج پھونک دے
اختیار ہے تجھے نوید ہا وعید دے
اے سخی!

(۲)

اے سخی!
مختصر سی اک نظر رفو کا کام کر گئی
آنکھ میں نظر فریب منظروں کی بھیڑ تھی
نظر ملی تو سب خیال چھٹ گئے
ہو بھلا.....
اک نظر کی بھیک پر
فقیر کے تو صبح و شام کٹ گئے

OOO

افسانے

موسمِ بہار میں سوکھی ٹہنیاں

رشید امجد

باغ کے اس قدرے ویران کونے میں پتھر کے بینچ پر بیٹھے وہ گیٹ سے اندر آنے والوں کے چہروں پر شناسائی کی رمک تلاشتے خود پتھر ہوا جا رہا تھا۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی بچے جھولوں کی طرف بھاگتے، مائیں نیم دوڑتیں، ان کے پیچھے پیچھے جھولوں کی طرف نکل جاتیں اور باپ ساتھ ہوتے تو اکثر بنچوں کا رخ کرتے۔ اس کی تلاشتی آنکھیں اس مریل سی زرد چہرہ، نیم مردہ بچی کو ڈھونڈتیں اسے لگتا کہ اس کے اندر کوئی کہانی چھپی بیٹھی ہے۔ ویسے اب وہ خود بھی ایک کہانی تھا جسے کب کا لکھا جا چکا تھا، لیکن اختتام ابھی باقی تھا۔

''میرا لکھنے والا تو ہر لمحے ایک کہانی لکھتا ہے اور اسے کائنات کی کتاب میں پھینک دیتا ہے''.....خود ہی ہنس پڑا.....''اس کتاب میں جانے کتنی کہانیاں ہیں، ان گنت.....کچھ انجام کو پہنچ گئیں کچھ پہنچنے والی ہیں۔'' اس کی کہانی بھی ابھی ادھوری تھی..... بیوی ساتھ چھوڑ گئی تو اکیلا رہ گیا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں باہر تھے۔ ان کے اصرار کے باوجود اس نے گھر نہیں چھوڑا۔ بیٹا ہر مہینے پیسے بھیج دیتا، نوکر ساتھ تھا۔.....بس کہانی چل رہی تھی۔ ایک رات سانس کی تکلیف اتنی بڑھی کہ سانسیں اکھڑ سی گئیں، نوکر کو ادرتو کچھ سمجھ نہ آئی، پڑوسی کے بیٹے کو جگا لایا۔ اس نے اسے فوراً گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گیا۔ تین چار گھنٹے آکسیجن لگی تو ٹھیک ہو گیا۔ پڑوسی کی بیٹی اور اس کی بیٹی کلاس فیلو رہی تھی، فون پر ان کی بات ہوتی رہتی تھی۔ اس نے اگلے دن اس کی بیٹی کو بتا دیا۔ بہن نے فوراً بھائی کو اطلاع دی، شہباز تین چار دن میں بھاگا آیا۔ ہفتہ بھر میں سارے کاغذات تیار ہو گئے اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بیٹا اسے ساتھ لے آیا۔

نئی جگہ دلکش ضرور تھی لیکن ہر طرف ایک اجنبیت تھی۔ ہفتے کے چھے دن تین کمروں کے فلیٹ میں قید، چھٹی کے دو دن گھر کا سودا سامان لاتے اور کسی اچھے ریستوران میں کھانا کھاتے گزر جاتے اور پھر وہی چھے دنوں کی تنہائی، فلیٹ کی دیواریں گونگی تھیں، بس ایک ٹی وی تھا جو بولتا تھا، لیکن روز کے وہی چبائے ہوئے لفظ.....اسے اب ان لفظوں سے اتنی سڑاند آتی کہ ٹی وی کھولنے کو جی نہ چاہتا۔

چہرے کے بڑھتے پیلے پن اور اندر دھنستی آنکھوں نے بیٹے کو کچھ پریشان کر دیا، بولا ''لگتا ہے آپ کچھ نامطمئن ہیں''

''نہیں تو'' اس کے لفظ اتنے کھوکھلے تھے کہ خود اسے احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''سارے دن کا اکیلا پن'' بیٹا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا.....''تنہائی بھی ایک عذاب ہے۔'' وہ چپ رہا۔

''دیکھیں قریب ہی ایک اچھا پارک ہے'' بیٹا بولا.....''نیچے اتریں گے تو دائیں طرف مڑ کر دو بلڈنگیں چھوڑ کر بائیں طرف کی گلی میں مڑیں گے تو سڑک کے دوسری طرف پارک نظر آ جائے گا، شام کو وہاں چلے جایا کریں۔''

''سڑک بڑی رش والی ہے'' بہو کہنے لگی..... ''ذرا دیکھ کر کراس کریں'' پارک واقعی خوبصورت تھا۔ کھلی فضا میں ایک بھرپور سانس..... انگ انگ جھوم اٹھا۔ لش پش سبز لانوں نے آنکھوں کو تراوٹ دی، اس گونگی تنہائی میں یہ پارک، ہنستا قہقہے لگاتا پارک..... پرانے بچھڑے دوست کی طرح ملا، اپنی بانہوں میں دبا کر اس نے اس کے کان میں کہا..... ''خوش ہو جاؤ۔''

اس نے ایک نسبتاً سنسان سے کونے میں پتھر کی بنچ ڈھونڈ لی، سہ پہر ہی کو وہاں آ بیٹھتا اور گیٹ سے اندر آنے والے لوگوں کے چہروں پر کہانیاں تلاشتا رہتا۔ بچے جھولوں کی طرف بھاگتے، ان کے پیچھے مائیں اور باپ، کچھ واک کرتے کچھ بنچوں پر بیٹھ کر دھواں اڑاتے۔ فلیٹ کی گونگی دیواروں اور بال نوچتی تنہائی سے نکل کلکاریاں مارتا یہ پارک، اسے گدگداتا، کئی چہرے، ان گنت چہرے، خوش، اداس، بے فکرے، فکریں ڈوبے ہوئے یہ چہرے پارک کے گیٹ سے اندر آتے، واک کرتے باہر نکل جاتے..... بس انہی میں اس نم پردہ سی زرد چہرے والی سہمی سہمی سے بچی نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ روز نہیں آتی تھی، تیسرے چوتھے دن ماں کی انگلی پکڑے ڈرتے ڈرتے اندر آتی، ماں کے کپڑے، حلیہ بتاتے تھے کہ کسی گھر میں کام کرنے والی ہے..... بچی تھوڑی دیر جھولے لیتی تو ماں اس دوران بار بار موبائل کو دیکھتی رہتی۔ بچی کا جی شاید ابھی نہیں بھرتا کہ ماں جانے کا اشارہ کرتی۔ لگتا کہ بچی کا جی جانے کو نہیں چاہ رہا، لیکن دوسرے بچوں کی طرح وہ نہ اصرار کرتی نہ ضد، بس چپکے سے ماں کی انگلی پکڑے پارک سے چلی جاتی۔

اس کا بڑا جی چاہتا کہ بچی سے بات کرے لیکن ہمت نہ ہوتی۔ یہاں اس طرح کا ماحول بھی نہیں تھا۔ لوگ اجنبیوں سے بات نہیں کرتے تھے، اور وہ تو اجنبیوں کا بھی اجنبی تھا۔

''شاید کسی دن، اس کا باپ ساتھ آئے تو بات ہو'' اس نے سوچا، اور ایک دن ایک مرد بھی ان کے ساتھ آ گیا،

''باپ ہی ہوگا'' اس نے سوچا۔ حلیہ سے وہ بھی نچلے درجے کا ملازم لگتا تھا۔

ماں بیٹی جھولوں کی طرف نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا، ساری بنچیں بھری ہوئی تھیں۔ بس اس کے برابر جگہ خالی تھی۔ کچھ تذبذب کے بعد وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔ رسمی سی مسکراہٹ کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا اور شائد اپنے اندر ڈوب گیا۔

خیر لمحے وہ ہچکچاتا رہا، پھر ہمت کر کے بولا..... ''یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

وہ چونکا، چند لمحے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتا رہا، اس شک میں کچھ وحشت بھی تھی۔

وہ اتنی دیر چپ رہا کہ اسے لگا جواب نہیں دے گا۔ پھر آہستہ سے بولا ''ہاں، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''بس یونہی، وہ گڑبڑا گیا..... ''بس یونہی، مجھے اچھی لگتی ہے۔ ماں کے ساتھ آتی ہے، آج آپ آئے ہیں تو جی چاہا پوچھ لوں''

وہ بدستور شک کی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بری طرح نروس ہو گیا تھا، سوچا ''مجھے نہیں پوچھنا چاہیے تھا، معلوم نہیں وہ اس کا کیا مطلب نکالے۔''

اپنی بات رکھنے کے لئے بولا..... ''میں نے بس یونہی پوچھا تھا، اگر آپ نے برا منایا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔''

''نہیں نہیں'' اس کی آنکھوں کی وحشت اور پریشانی کچھ کم ہو گئی تھی..... ''میں نے برا نہیں منایا لیکن کچھ عجیب سا لگا کیونکہ یہاں کوئی کسی سے کچھ نہیں پوچھتا، پھر ذرا خاموش رہنے کے بعد بولا۔'' آپ شاید یہاں نئے نئے آئے ہیں'' ''ہاں'' وہ اداسی سے کہنے لگا۔

''بیٹے کے پاس ہوں، پیچھے اب کوئی نہیں۔ بیوی مرگئی ہے اور بیٹا بیٹی دونوں یہاں ہیں۔''

''اوہ'' اس نے.....سن لیا۔'' تو آپ یہاں خوش ہیں؟''

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔''نہیں۔ بالکل نہیں'' وہ ہنس پڑا۔''یہاں لوگ خواب لے کر آتے ہیں لیکن بہت جلدی یہ خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔''

اب وہ چونکا۔''آپ تو اپنی مرضی سے آئے ہوں گے، میں تو لایا گیا ہوں۔''

''دونوں میں شائد کوئی فرق نہیں'' وہ آہستہ سے بولا

بچی اور اس کی ماں جھولوں سے واپس آ رہی تھیں۔ وہ اٹھا، ہاتھ ملایا اور بولا۔''میں تو کسی کسی دن ہی آتا ہوں، شائد کبھی ملاقات ہو جائے۔'' اس کا تجسس بڑھ گیا۔

''کہانی یہاں چھپی بیٹھی ہے'' اسے یقین سا ہو چلا تھا۔''لیکن اس کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔''

اب پارک میں جانا ایک نئے طرح کے انتظار سے جڑ گیا تھا۔ اس دوران دو بار ماں بیٹی پارک میں آئیں لیکن باپ ساتھ نہیں تھا۔ باپ نے شائد انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا کیونکہ اسے دیکھتے ہی وہ شناسا نظروں سے اس کی طرف دیکھتیں، جھولے اور پھر واپسی، انتظار.....انتظار کے لمحے طویل ہو کر مختصر ہوئے، باپ ساتھ آیا وہ کھل سا اٹھا اسے دیکھتے ہی ہاتھ ملایا،

چند لمحے تذبذب کی کیفیت میں رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا پاس آ گیا۔

وہ بنچ کے ایک طرف کھسک گیا، وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''کیسے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اس نے فوراً جواب نہیں دیا، شائد سوچا کہ جواب دے یا نہ دے، پھر آہستہ سے بولا۔''شکر ہے''

چند لمحے ایک ناگوار خاموشی پریشان کن صورت حال کا سبب بنی رہی۔ اس نے پوچھا۔''آپ کیا کرتے ہیں؟''

اس نے پھر مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا، چپ رہا، شائد اس تذبذب میں تھا کہ جواب دے نہ دے، پھر بولا۔''ایک تعمیراتی کمپنی میں میٹ ہوں۔'' آگے سوال کوئی نہیں تھا۔ بہت ناخوشگوار خاموشی میں، وہ اٹھا، ہاتھ ملایا اور بیوی بچی کے ساتھ پارک سے باہر نکل گیا۔

''کہانی موجود ہے'' اس نے سوچا، اور وہ جو خود ایک کہانی تھا جو ابھی اختتام پذیر نہیں ہوئی تھی، کہانی کی تلاش کر رہا تھا۔

''میرا کہانی نویس تو ہر لمحے ایک کہانی لکھتا ہے اس کائنات کی کتاب میں ڈال دیتا ہے'' اسے ہنسی آ گئی۔''اور اسے اپنی کہانیوں کے اختتام سے کوئی غرض نہیں، کوئی کہانی کیسے ختم ہوئی، اسے کیا پرواہ، وہ تو تخلیق کرنے کی مسرت میں مگن ہے۔''

وہ بھی کہانی تلاش کر رہا تھا، کئی دنوں بعد وہ تینوں اکٹھے آئے۔ بیٹی ماں جھولوں کی طرف اور وہ سیدھا اس کی طرف آیا۔

''کیسے ہیں؟'' اس کے لہجے کی خوشگواریت شک کے ختم ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

وہ ایک طرف ہو گیا۔''بیٹھیے''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر اس نے پوچھا۔''کتنا عرصہ ہو گیا یہاں''

''پانچ سال ہونے کو ہیں''

''وطن تو جاتے رہتے ہوں گے''

''ایک بار نہیں'' اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''ایک بار بھی نہیں'' وہ چونکا

''آپ کو شائد یہاں کے طریقہ کار کا علم نہیں''

اس نے نفی سر ہلایا

''یہ ایک ایسا طلسم ہے جہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں'' وہ ہنستے ہوئے بولا لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس ہنسی میں زہر رچا ہوا ہے۔ اس نے استفسار سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہاں پہنچتے ہی پاسپورٹ آجر لے لیتا ہے، پھر سب اسی کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولا۔ ''تو آپ.....؟'' ''میرا پاسپورٹ بھی ارباب کے پاس ہے۔ پچھلے دو سالوں سے اس نے ہمارا ویزہ بھی نہیں لگوایا۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''تاکہ ہم بھاگ کر کسی اور کے پاس نہ چلے جائیں۔ اب ہم غیر قانونی ہیں۔ پکڑے جائیں تو سیدھے جیل، سزا بھی اور جرمانہ بھی''

''تو یہاں سے جانے کا کوئی طریقہ نہیں'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ویسے تو نہیں، ہاں رمضان کے مہینے میں غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب حاصل کرنے کے لئے سزا معاف بھی ہو جاتی ہے اور مخیّر حضرات زکوٰۃ میں سے جرمانہ بھی ادا کر دیتے ہیں، لیکن کس کی باری آئے کس کی نہ آئے یہ کیسے معلوم؟'' اسے لگا اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔

''میرا بیٹا اور بہو بھی.....'' وہ جملہ مکمل نہ کر پایا۔ ''اچھے عہدوں والوں کو اتنا مسئلہ نہیں، یہ تو ہم نچلے درجے والوں کے لئے ہے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔'' ''تو کوئی بھی نہیں'' جملہ ادھورا رہ گیا۔

''اکثر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں، پاسپورٹ پہلے مالک کے پاس رہ جاتا ہے اور غیر قانونی ہو جاتے ہیں، پھر قسمت ہے کہ پکڑے جاتیں یا نہیں''

''اور آپ کی بیوی''

''وہ بھی اپنی پہلی جگہ چھوڑ چکی ہے اور اب غیر قانونی ہے۔'' اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ شاید آج اپنا دل کھولنے پر تلا ہوا تھا ''صبح چھ بجے سے شام چھ بجے تک، یہی حال میری بیوی کا ہے بس ایک چھٹی، وہ بیٹی کو لے کر پارک آ جاتی ہے میں آس پاس کے لوگوں کی گاڑیاں دھو لیتا ہوں، کچھ مل جاتا ہے۔ کسی دن وقت مل جائے تو ان کے ساتھ پارک آ جاتا ہوں، یہی میری سب سے بڑی عیاشی ہے''

''بیٹی تو پڑھتی ہو گی''

''نہیں'' وہ تقریباً رو پڑا..... ''اور کبھی پڑھ بھی نہیں سکے گی۔''

اس کی حیرت آنکھوں سے رس رس کر پورے چہرے پر پھیل گئی..... ''کیوں؟'' اس کی آنکھوں میں آئے آنسو گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہا کہ کچھ کہے یا نہ کہے، پھر شائد برسوں کا بوجھل دل پھٹ پڑا۔ ''یہ سکول نہیں جاسکتی'' آنسوؤں سے بوجھل آواز میں اس نے کہا۔

''کیوں؟''

''ہم ملے تو ایک دوسرے کو اچھے لگے، سوچا شادی کرلیں۔ میں چھے بجے آ کر ایک گھر میں صفائی کا کام کرتا تھا، پھر ایک دو گاڑیاں دھوتے گیارہ بج جاتے سوتے سوتے بارہ اور صبح ساڑھے چار بجے اٹھتا، پانچ بجے ارباب کی گاڑی سب مزدوروں اور میٹوں کو لے کر کام پر روانہ ہوجاتی۔ ارباب نے اپنے بڑے گھر کے احاطے کے ایک طرف ہم لوگوں کے لئے کمرے بنوائے ہوئے تھے۔ کنوارے ایک کمرے میں چار چار اور شادی شدہ ایک کمرے میں دو دو جوڑے۔ یہ ساتھ والے گھر میں کام کرتی تھی۔ آتے جاتے نظر پڑتی، پھر ملاقاتیں ہونے لگیں اور ہم نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ یہ کسی اور جگہ سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔ اس لئے غیر قانونی ہوگئی تھی۔ باقاعدہ شادی اس کے غیر قانونی ہونے کی وجہ سے ہونہیں سکتی تھی۔ ایک بنگالی مولوی صاحب نے نکاح پڑھوادیا لیکن یہ نکاح ریکارڈ نہ ہوسکا۔ بیوی امید سے ہوئی تو فکر پڑ گئی۔ ایک رات اچانک اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر اچھا تھا۔ چیک کر کے دوائیں لکھ دیں اور بولا اب اس کا کارڈ بنوالیں تاکہ باقاعدہ سے چیک اپ ہوتا رہے۔ آپ کل نکاح نامے کی فوٹو کاپی لے آئیں، دفتر سے کارڈ بن جائے گا''

وہ چپ ہوگیا۔ کہانی تو ریشم کے تاروں کی طرح الجھ گئی تھی۔ نرم الجھے ہوئے گولے کو ہاتھوں میں دباتے اس نے پوچھا..... ''پھر''

''جس دن بچی ہوئی اسی رات میں اسے اسپتال میں لے گیا'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے سامنے لکھی کوئی تحریر پڑھ رہا ہو.....

''اتفاق سے ڈیوٹی نرس بھی بنگالن تھی۔ جانتی تھی۔ کہنے لگی..... ''بچی کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ صبح کاغذات مانگے جائیں گے تو دونوں پکڑے جاؤ گے اور حدود کا مقدمہ بن جائے گا۔''

''میں نیم مردہ حالت میں پڑی بیوی کو ٹیکسی میں ڈال کر وہاں سے نکل آیا۔ یہ ننھی سی بچی رو رہی تھی نہ ہل رہی تھی۔ شائد اسے اپنے مستقبل کا پتہ چل گیا تھا۔ میں سمجھا مرگئی ہے لیکن.....''

دونوں چپ تھے۔

ماں بیٹی جھولوں سے لوٹ رہے تھے۔ وہ کھڑا ہوگیا، تادیر کھڑا رہا پھر بولا..... ''یہ بچی بیمار ہوجائے تو ہسپتال نہیں جاسکتی، سکول بھی نہیں جاسکتی کیونکہ یہ غیر قانونی ہے، پیدائشی غیر قانونی''..... ذرا چپ رہنے کے بعد بولا..... ''یہ پکڑی گئی تو تو ہم دونوں بھی.....''

بدلتے پتھروں کی شوکار اس نے بھی سنی اور ان سے بچنے کے لئے گیٹ کی طرف دوڑا۔ اس رات فلیٹ کی گونگی دیواریں بول پڑیں اور چھوٹے چھوٹے پتھر بن کر برس پڑیں۔ درد کی شدت سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بیٹا اور بہو ہڑبڑا کر جاگے۔

''کیا ہوا..... ابو جی کیا ہوا؟''

کہیں کوئی جواب دینے کی بجائے وہ چیختا رہا..... بس چیختا رہا۔

◆◆◆

مِیٹ مال؟

بشریٰ رحمٰن

وہ جب اندر سے نکلی تو دس بارہ اس کے پیچھے تھے۔ دو چار دائیں بائیں اور کیمرے والے اس کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ اس کے اترا اترا کر چلنے کا انداز نرالا تھا۔ زلفیں کاندھوں تک بکھری ہوئی تھیں۔ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ جدید طرز کا فراق زیب تن کر رکھا تھا۔ ایک برائے نام سا ڈوپٹہ کاندھے پر یوں ڈال رکھا تھا جیسے ناپسندیدہ عزیز کو منہ موڑے بغیر گوارا کر لیتے ہیں۔

وہ جس طرف مسکرا کر دیکھتی سب مسکرانے لگ جاتے۔

وہی انداز تھا۔ میرے والا..... بالکل وہی..... میں تو اس سے زیادہ خوبصورت اور طرحدار تھی..... یہ جو ایک ملٹی نیشنل ادارہ ہے۔ سیل فون سے لے کر اشتہار بازی، اشتہاری فلمیں، فلیکس، بیل بورڈ اور اشتہار بازی کے نئے نئے گر بیچتا ہے..... یہاں جو بھی آتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ بیچنے کے لئے ہی آتا ہے..... مثلاً جوان لڑکیاں..... جنہیں آج کل شوہر سے زیادہ جاب کی تلاش ہوتی ہے۔ اور اشتہاری فلموں میں کام کرنے کی شوقین لڑکیاں جو اپنے چہرے کے نقوش کی قیمت لگاتی ہیں..... بال لمبے ہوں تو شیمپو کے اشتہار میں بک جاتے ہیں۔ دانت خوبصورت ہوں تو ٹوتھ پیسٹ والے فدا ہونے لگتے ہیں..... آنکھیں متوالی ہوں تو کاجل بیچنے کے کام آجاتی ہیں۔ غرض یہاں حُسن کا کوئی معیار نہیں ہوتا..... چہروں میں چیزیں تلاش کی جاتی ہیں۔ لب و لہجے میں اپیل دیکھی جاتی ہے۔

اس ادارے کے کئی شعبے ہیں۔ ان شعبوں میں کئی ڈیسک ہیں۔ ان ڈیسکوں پر ایک سے ایک خوبصورت لڑکی کو بٹھایا جاتا ہے۔ یہ کمپنی ہاؤس بلڈنگ کے لئے قرضے بھی دیتی ہے۔ اور باقاعدہ پراپرٹی ڈیلنگ کا کام بھی کرتی ہے۔ اس لئے ہر قسم کے ضرورت مند، ہر طرف سے آتے رہتے ہیں۔ اس پلازہ کے اندر جادو کی ایک دنیا آباد ہے۔

میں بھی جاب کرتی یہاں آ گئی تھی۔ ایسا ہی تھا میرا زمانہ بھی..... میرا پورا چہرہ اس دفتر کی رونق تھا۔ میں جدھر رخ کرتی ہوا اس طرف کی ہو جاتی۔ نہ جانے کتنی آنکھیں والہانہ طواف کرتی تھیں۔ نہ جانے کتنے دل دھڑکنے کو بے قرار رہتے تھے۔ میں بھی جب دفتر سے باہر نکلتی تو کتنے قدم مجھے باہر تک چھوڑنے آتے تھے۔ میں بھی ایسے ہی اترا کر اور لہرا کر چلا کرتی تھیں..... سسکتی جھولیوں میں نظر کی بھیک پھینکتے ہوئے..... مجھے بھی مردوں کے ہجوم میں رہنے کا فن آ گیا تھا۔ میں بھی تعریفی فقروں کی طرارت سے لبریز رہتی تھی۔ مجھے بھی مٹک مٹک کر ادائیں دکھانے میں مزہ آنے لگا تھا..... مجھے بھی لگتا تھا۔ دنیا میں بس میں ہی پہلی اور آخری جوان اور حسین لڑکی ہوں۔ اس سے پہلے نہ کوئی تھی۔ نہ بعد میں کوئی آئے گی.....

افوہ..... کیسا زمانہ تھا وہ..... اسے یاد کر کے میں بے اختیار ہنسنے لگی۔

نہ جانے کس طرف سے چودھری عنایت حسین گل نکل کر آ گیا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر بولا۔

یہ ہنسی حسد کی ہے یا رشک کی.....؟

چودھری عنایت اس دفتر کا سب سے قدیم اور سب سے خبیث کارندہ تھا۔

اس کو بلیک میل کرنے کے ہزاروں گراز بر تھے۔عملہ یہ سب کچھ جانتا بھی تھا۔ پھر بھی کئی لوگ اس کے ذریعے اپنے کام نکلواتے تھے۔ جو بھی کام اس کے زمے لگایا جاتا بڑی جانشانی اور چابک دستی کے ساتھ کرتا تھا۔اس لئے باس کو بھی نہیں کھٹکتا تھا..... باس کو کیسے کھٹکتا ان کے تمناؤں کے گل دان میں وہ نت نئے پھول سجانے کا ماہر تھا۔ چونکہ وہ درون خانہ کا راز دار بھی ہوتا اس لئے کوئی اس کی بدزبانی کا برا بھی نہیں مناتا تھا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

اس میں حسد والی کون سی بات ہے؟ اور رشک والا کونسا پہلو ہے۔

ایک زمانے میں لوگ تمہارے اوپر بھی اسی طرح فریفتہ ہوتے تھے.....تو.....

میں نے جل کر کہا۔ارے خفا کیوں ہو رہی ہو۔ میں تو ویسے ہی.....ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ تم تو بہت ٹیلنٹڈ نکلیں.....اپنی منزل کا یقین بروقت کرلیا۔

آج خوشامد کے لئے تمہیں کوئی نہیں ملا..... میں نے جھڑکنے کے انداز میں کہا۔

ویسی کی ویسی ہو.....رسی جل گئی بل نہیں گئے..... یہ کہہ کر وہ بھاگ گیا.....

میں اسے اتنی دور تک دیکھتی رہی جتنی دور تک وہ نظر آتا رہا.....

اس شخص نے میرے کانوں میں بھی وقت کا سب سے دلآویز منتر پھونکنا شروع کر دیا تھا.....نوخیز اور نوآمدہ لڑکیوں کو ورغلانا .....دام میں پھنسانا.....دام وصول کرنا اور پھر بلیک میل کرتے رہنا اس کا مشغلہ تھا.....

حُسن اور جوانی ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔ دونوں وقت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں.....

نظروں کا تعاقب کرنا.....مردوں کا آہیں بھرنا..... بار بار سراہا جانا.....کب زمین پر پاؤں جمنے دیتا ہے.....میں بھی ایسی ہو چلی تھی۔ چاہنے لگی تھی میرے ساتھ ایک ہجوم عاشقاں باہر نکلا کرے.....لوگ قدموں میں دل پھینکا کریں.....میرے لئے عاشق خودکشیاں کریں۔اور جاں سے گذر جائیں..... میں جس دل پر راج کروں وہ تاراج ہو جائے وقت کی لگام میرے ہاتھ میں رہے۔ کہ میں اس دفتر کی سب سے حسین لڑکی تھی۔اور پورا میڈیا چینل میرے گرد گھوم رہا تھا.....

کہ اچانک میری ماں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔

میں اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔اور بیوہ ماں کی زندگی کا واحد سہارا تھی..... بڑی مشکل سے اس نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔اور بڑی کوشش سے میں نے یہ نوکری ڈھونڈی تھی۔اب اس کے سکھ کے دن آئے تھے اور وہ سی سی یو میں جا لیٹی تھی.....

میں اس کے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھی.....روز دفتر سے اٹھ کر ہسپتال جاتی تھی۔ڈاکٹروں سے ملتی تھی.....سب ہی تسلی دیتے تھے.....

ایک دن جب میری ماں ذرا بہتر تھی۔اس نے مجھے پاس بلایا۔
ڈھیر ساری باتیں کیں.....
میں نے کہا ماں تم تھک جاؤ گی۔اور تھکنا تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔
بولی۔بس ایک ضروری بات کرنے دو۔اس کے بعد نہیں بولوں گی.....
میں ہمہ تن گوش ہوئی تو ماں بولی۔

یہ جو ڈاکٹر امریکہ سے آیا ہے ناواجد علی شاہ.....اس نے میرا علاج بہت توجہ سے کیا ہے۔یہ بہت نیک انسان ہے۔ایسے انسان دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔میرے بعد تم اس ڈاکٹر سے شادی کر لینا۔یہ وعدہ میں نے اس سے بھی لے لیا ہے۔

ماں.....میں زور سے چیخی جیسے کسی نے مجھے کہکشاں سے کھینچ کر اندھیرے کنوئیں میں پھینک دیا ہو۔مگر ماں تو چپ ہوگئی تھی۔ اس کے بعد بولی ہی نہیں.....میں چیخ چیخ کر چلا چلا کر تھک گئی.....رو رو کر ہلکان ہوگئی۔مگر اس نے تو کچھ سنا ہی نہیں.....بس یہی سب کہنے کے لئے زندہ تھی.....اس کے مرنے کا انداز مجھے پسند نہیں آیا.....

اور اپنے جینے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آیا.....
اس کی آخری سانسوں نے مجھے باندھ لیا تھا.....
جبکہ ڈاکٹر واجد علی شاہ سے بھی وہ وعدہ لے چکی تھیں.....

میرے لئے راہِ فرار نہیں تھی۔میں نے زہر کا گھونٹ بھرا۔اور ڈاکٹر کے ساتھ نکاح کر کے امریکہ آ گئی۔ڈاکٹر پچتالیس برس کا تھا۔سر سے گنجا تھا۔عینک بھی لگاتا تھا۔بلکہ اس کی پہلی بیوی جو امریکن تھی۔مر چکی تھی۔اس میں سے دو بیٹیاں تھیں۔جن کے لئے اسے ایک پاکستانی ماں کی ضرورت تھی.....ماں کی ضرورت تھی یا آیا کی ضرورت تھی۔بہت امیر آدمی تھا آیا تو وہ خرید بھی سکتا تھا۔مگر پتہ نہیں میری ماں کو اس کی کہانی کا کون سا موڑ اچھا لگا کہ مجھے اس کی جھولی میں ڈال دیا.....میں کہ ہمہ مہتاب ہمہ آفتاب آسمان پر چمکنا چاہتی تھی۔ ٹوٹے تارے کی طرح اس کے قدموں میں جا گری.....

وہ ہارٹ سپیشلسٹ تھا۔سنا ہے اس کے پائے کا ڈاکٹر پورے امریکہ میں نہیں تھا۔مگر اس کا ایک مشن تھا۔سال کے چھ مہینے میں وہ تیسری دنیا کے غریب ملکوں کی طرف نکل جاتا تھا۔اور وہاں غریبوں کا علاج مفت کر کے واپس آ جاتا تھا۔اس کی امریکن بیوی اس کی سیکٹری بھی تھی اور نرس بھی.....اس میں سے دو بیٹیاں تھیں۔پانچ سال کی سکینہ اور تین سال کی زینب.....وہ دونوں بچیاں چپ چاپ رات کو آ کر میرے دائیں بائیں سو جاتی تھیں۔اور اکثر گہری نیند میں مجھ سے لپٹ جاتی تھیں.....ماں کی محرومی نے انہیں میرے قریب کر دیا تھا.....اور میں ان معصوم محبت بھرے ہاتھوں کے آگے ہار گئی تھی۔جو رات کو میری گردن میں حمائل ہو جاتے تھے.....ان کی معصوم سانسوں نے مجھے انسانیت سے محبت کرنا سکھایا.....مجھے ماں بننا سکھایا۔رفتہ رفتہ میں بیوی بن گئی۔پھر ڈاکٹر واجد علی شاہ کی جملہ خوبیاں مجھ پر روشن ہونا شروع ہوگئیں.....

آخر کیا ہے آرزو کی معراج.....؟

اس کے سامنے حُسن اور جوانی کچھ بھی نہیں تھی۔دونوں فانی.....دونوں بیکار.....سکینہ اور زینب نے مجھے ماں بنا دیا۔میں ان کے

پیار میں کھو گئی.....تب مالک نے مجھے ایک خوبصورت بیٹا عطا کر دیا۔ جو دونوں بیٹیوں کی خوشیوں کا مرکز بن گیا.....

میں نے بچوں کی ذمہ داری لے لی.....اور ڈاکٹر صاحب کو ان کے مشن کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔

پانچ سال امریکہ میں رہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے اجازت دے دی کہ میں بچوں کو لے کر پاکستان چلی جاؤں۔ وہ چاہتے تھے۔سکینہ اور زینب پاکستانی معاشرے میں تربیت حاصل کریں۔اور پاکستانی لڑکیوں کی طرح نظر آئیں.....

اور مجھے بھی انہوں نے اجازت دے دی کہ میں جو بھی کرنا چاہوں کرلوں۔ کیونکہ میں نے امریکہ میں میڈیا سے متعلق ایک ڈگری لے لی تھی.....

میں واپس آئی.....سیٹل ہوگئی۔ بچوں کو سکولوں میں داخل کرا دیا.....

جب ذرا سکون ہوا تو جاب کرنے کا سوچا.....

اپنی پرانی کمپنی میں جاب کرنے کا خیال آیا۔ گو دس سال بیت چکے تھے۔ پھر بھی میں وہاں کام کر چکی تھی اور سب لوگ میرے کام سے مطمئن تھے.....

سوخوش نصیبی سے مجھے وہیں جاب مل گیا۔ بلکہ مجھے میڈیا پروجیکٹ کا ہیڈ بنا دیا گیا..... ماحول میں جو تبدیلی آئی تھی اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی.....

کیا یہ پاکستانی لڑکیاں ہیں۔ڈوپٹہ غائب، آدھی ٹانگیں ننگی.....فیشن کی ماری ہوئی..... بوائے فرینڈز کی یلغار میں، ننگی تلوار کی طرح گھومتی ہوئی.....

میں ڈاکٹر واجد علی شاہ کو کیا بتاؤں گی..... کیسے بتاؤں گی۔ پاکستانی لڑکیاں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ وہ یورپ کی ایک بگڑی ہوئی شکل میں ڈھلتی جارہی ہیں.....کلچر سے دور مذہب سے بے زار..... یہاں اپنے دفتر کی میز پہ بیٹھ کے، شیشہ کی دیوار کے اس پار میں ان مٹکتی چمکتی لڑکیوں کو آتے جاتے دیکھتی ہوں.....زمانہ جن کے قدموں کی ٹھوکر معلوم ہوتا ہے.....

کیسی تھی وہ عابدہ.....اف اس کا سچ مچ بلور کا بدن تھا۔ جیسے شیشہ میں سے گلابیاں جھانکتی ہیں.....ایسے اس کے ٹرانسپیرنٹ لباس سے جھلکتا تھا بدن.....کون دیوانہ تھا اس کی مستانہ چال کا..... کتنے دل تھے اس کے قدموں تلے.....اب یہاں واپس آ کے میں نے سنا.....ایک دن وہ اس پلازہ کی چھت سے نیچے کود گئی.....خودکشی کی وجہ کوئی نہ جان سکا.....بس کہانیاں بنتی رہیں.....ایک دن میں نے یہ بات اس چودھری عنایت سے پوچھ لی۔ایک جنابت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری.....

میڈم جی! ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

کیا مطلب.....ایسی لڑکیوں سے.....

وہ جی وہ سمجھتی ہیں عاشق ہمیشہ عاشق رہتا ہے.....مگر گوشت نوچنے والے عاشق بن کر کہاں رہتے ہیں.....وہ جی.....

شٹ اپ.....میں نے اس چپ کرا دیا۔

وہ اقبال بانو تھی اسے سب بالی بالی کہتے تھے۔گاؤں سے پڑھنے آئی تھی۔ پھر جاب کی لگن اسے یہاں لے آئی.....ان چھوئی، مکھن کے تازہ پیڑے کی طرح تھی.....سنا ہے اس نے ہوسٹل کے کمرے میں اپنے آپ کو پستول مار لی تھی.....مکھن کو دھوپ لگے تو گھل جاتا ہے۔

صہبا کو دماغی دورے پڑنے لگے تھے۔آج کل دماغی ہسپتال میں ہوتی ہے.....

وفا.....سلینہ.....نادیہ.....سہانہ.....

کتنی خوبصورت اور طرحدار لڑکیاں تھیں۔کبھی کبھی جب ان کے بارے میں سنتی ہوں.....تو اپنی ماں کو دعائیں دیتی ہوں۔خوش فہمیوں اور نادانیوں کی تند و تیز ندی سے میری ماں نے کھینچ کر مجھے نکال کے ساحل پہ ڈال دیا.....میں ان لڑکیوں کے گروپ میں رہتی تھی۔ میں بھی ان جیسی ہوگئی تھی..... میں بھی آسمان کی طرف دیکھتی تھی۔ میں نے زمین کی طرف دیکھنا بند کر دیا تھا۔میرے پاس بھی ہر روز خوشبودار پیغامات، کارڈز، پھول اور تحفے آنے لگے تھے.....شخصیات کا جادو مجھے ہواؤں میں اڑنے پر اکسا رہا تھا.....وہی تو چودھری عنایت کہتا ہے.....

او جی میڈم جی! ان لڑکیوں کو یاد کر کے نہ رویا کریں۔بس یہ شکر کریں آپ مناسب وقت پر بچ کر چلی گئیں۔

ورنہ.....ورنہ.....ادھر ادھر دیکھ کر کہتا ہے۔آپ کے ساتھ بھی انہوں نے نہ.....میرا مطلب ہے.....وہ جو.....روز.....اوپر سے آپ کے لئے بھی آرڈر آنے لگے تھے.....

بکواس بند کرو چودھری.....اور دفع ہو جاؤ یہاں سے.....

مجھے جلال میں دیکھ کر وہ بھاگ جاتا ہے۔

میں یہاں بیٹھ کر کہانیاں لکھوں گی.....یا ان نادان لڑکیوں کے لئے.....ان کی تربیتِ نفس کے لئے کچھ کر بھی سکوں گی.....

یہی دنیا ہے۔یہ انسانوں کا ایک سمندر ہے۔تیرنا آتا ہے تو اس سمندر میں اترو.....ورنہ ڈوب جاؤ گے۔اس طرح کہ لاش بھی نہ ملے گی.....ساحل کی طرف بلانے والے ہی تمہیں ڈبوئیں گے.....

اور یہ چودھری عنایت گل، جس کے دانت گوریلا کی طرح کے ہو گئے ہیں۔ساٹھ کے پیٹے میں تو ہوگا.....یہ بھی تو پھنسانے سے لے کر پیش کرنے تک.....پھر اپنا حصہ وصول کرنے آجاتا تھا۔

دفتر والوں ہی نے مجھے بتایا.....اس کی تین بیٹیاں تھیں.....ایک اپنے کلاس فیلو کے ساتھ بھاگ گئی.....دوسری ایک پولیس افسر کے ساتھ سیٹ ہوگئی۔اور تیسری اس گوالے کے ساتھ بھاگ گئی۔جو گھر میں دودھ دینے آتا تھا۔سنا ہے اس کی بیوی کو پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے.....آج کل وہ شہر کے سب سے بڑے پاگل خانے میں داخل ہے۔

جو لوگ اس دنیا کو پاگل خانہ سمجھتے ہیں.....دنیا ان کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے.....جو حد سے گذرتے ہیں۔وہ جاں سے گذرتے ہیں۔دل سے گذرتے ہیں.....دماغ سے گذر جاتے ہیں.....میں نے شیشہ کی دیوار میں سے دیکھا میری گاڑی آ کر رکی تھی۔ اور دروازہ کھول کر ایک طرف سے سکینہ اور دوسری طرف سے زینب باہر نکل رہی تھی.....زینب ایسی تھی جیسے مکھن کا پیڑا اور سکینہ تو بالکل بلور کی بنی ہوئی لگتی تھی..... مجھے پہلی بار احساس ہوا دونوں بیٹیاں جوان ہوگئی ہیں۔

میں پاگلوں کی طرح اپنا پرس اٹھا کر باہر کو دوڑی.....میں نہیں چاہتی تھی گوشت کی اس منڈی میں میری فرشتوں جیسی بیٹیوں کو، کوئی بھی نگاہ بد دیکھ سکے۔

◆◆◆

عزم

ثاراحمد صدیقی (انڈیا)

''لیمن ٹافی۔لیمن ٹافی۔کھٹا میٹھا لیمن ٹافی۔''

''ابے!ایسے نہیں آواز لگاورنہ پولیس والے سن لیں گے۔''

تقریباً بارہ سالہ بچے کی آواز پر کسی مسافر نے کوئی توجہ نہ دی۔ایک بار پھر ایک نو 9 سالہ بچے کی آواز بلند ہوئی۔''لیمن ٹافی۔ لیمن ٹافی لیمن ٹافی۔کھٹا میٹھا لیمن ٹافی۔''اور پھر ایک آواز۔جس نے مجھے چونکا دیا۔میں نے غور سے گھوم کر دیکھا۔ایک بارہ سالہ بچے نے اپنے نو سالہ ساتھی کی گردن پر تھپڑ مارا تھا۔لڑکا گردن سہلاتے ہوئے منہ بسور رہا تھا۔بارہ سالہ لڑکا اس سے کہہ رہا تھا۔''ابے تجھے منع کیا تھا کہ اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی ہو تو آواز نہ لگایا کر،لیکن تو نہ مانے گا۔ابھی تیرے باپ پولیس والے آ کر پکڑیں گے تو سالے تجھے بھی پیسے دینے پڑیں گے اور تیرے ساتھ میری بھی جیب خالی ہوگی۔پھر چل کے رات کو اپنی اماں کو تھوبڑا دکھانا۔''

چھوٹے بچے کی معصوم شکل نے میرے دل میں ہمدردی کا ایک جذبہ لاشعوری طور پر پیدا کر دیا۔میں نے قدرے غصہ کے لہجے میں بڑی لڑکے کو آواز دی۔اور سوالیہ لہجہ میں اس سے پوچھا۔''یہ تمہارا بھائی ہے؟''

''نہیں صاحب۔''

''تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''ویسے تو میرا کوئی نہیں ہے اس کی ماں نے اس کو میرے ساتھ کر دیا ہے۔''

''مار کھانے کے لیے؟''

''نہیں صاحب!''

''پھر.....''

''دیکھو صاحب اس کے پتا جی مر گئے ہیں،اس کی ماں گھروں میں برتن مانجتی ہے۔اس کو ریوڑی بیچنے میں اس نے لگا دیا۔یہ الہ آباد اسٹیشن پر ریوڑی بیچتا تھا۔وہاں دن بھر بیچتا اور شام کو جو جواری اسٹیشن پر بیٹھتے ہیں وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پتے لگاتے تھے،اور اس پاگل سے سارے روپے جیت لیتے تھے،تب اس کی ماں نے میرے ساتھ اس کو کر دیا کہ چلتی ٹرین پر سودا بیچے اور میرے ساتھ گھر واپس جائے۔صاحب دیکھو چکر یہ ہے کہ اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی رہتی ہے تو آواز لگانے پر پولیس والے سن کر پکڑ لیتے ہیں اور پیسہ مانگتے ہیں نہیں تو کہتے ہیں بند کر دیں گے۔صاحب اب ان کو اگر پانچ چھ روپے دے دیں تو منافع تو گیا اور سارے دن کی محنت برابر۔''

لڑکے کی بات میں سچائی نظر آ رہی تھی، کیونکہ اکثر و بیشتر میری نظروں نے ہاتھ میں پٹی باندھے پولیس والوں کو کمپارٹمنٹ کے واش روم کی طرف خوانچے والوں اور دیگر ہاکروں کو لے جاتے اور کان میں رازدارانہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے بعد چند نوٹوں کو بطور جذیہ لینے کے بعد نہایت دوستانہ طور پر ان خوانچے والوں سے مفت میں ان کے چنے یا مونگ پھلی لے کر کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ دراصل یہ قیمت ہر اس ہاکر کو روزانہ ادا کرنی پڑتی ہے جسے ریلوے سے باقاعدہ طور پر اشیا بیچنے کا لائسنس حاصل نہیں ہے۔

میں نے لڑکے سے پھر سوال کیا۔ ''تم بھی لیمن ٹافی بیچتے ہو؟''

''نہیں صاحب! چنے بیچتا ہوں۔'' اس نے نیچے رکھی ہوئی ڈلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

احساس تجسس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔ اب تک غصہ نے ہمدردی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور مجھے اس بڑے لڑکے کی بات چیت میں کافی دلچسپی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ویسے تمہارے پتا جی کیا کرتے ہیں؟''

''صاحب ریلوے میں چپراسی ہیں۔''

''تمہارا گھر؟''

''صاحب یہیں کانپور میں باپو رہتے ہیں۔ ریلوے کالونی میں۔ اور میں الہ آباد میں رہتا ہوں۔ وہ آپ نے پریاگ ہوٹل کے پاس کچھ چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دیکھے ہیں نا، بس وہیں۔''

''لیکن تم کو تو اپنے باپو کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' میرے اس سوال پر اس نے چند لمحوں کے لیے نظریں پھیر لیں۔ احساسِ کرب اس کے کمسن چہرے پر صاف نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھیں ہلکی سی ڈبڈبا بھی گئیں۔

وہ دھیرے سے بولا۔ ''صاحب، میری ماں کسی کے ساتھ چلی گئی، میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔''

مجھے اپنے اوپر غصہ آیا کہ ناحق ایسا سوال کیا۔ مجھے اب اس بچے سے پوری طرح انسیت کا احساس ہو چلا تھا میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارے اور بھائی ہیں۔''

''ہاں صاحب ایک چھوٹا ہے۔ اسکول جاتا ہے۔''

''تمہارے ساتھ ہی ہے۔''

''ہاں صاحب۔ اسے پڑھا رہے ہیں۔''

میں نے اس سے پھر پوچھا۔

''تمہارا یہ چھوٹا ساتھی کتنا کماتا ہے اسے جوئے میں تو نہیں گنواتا؟''

''نہیں صاحب! اب تو اس سالے سے پورے روپے میں شام تک لے لیتا ہوں اور اس کی ماں کو دے دیتا ہوں۔''

بارہ سال کا وہ بچہ مجھے اب ایک قد آور درخت نظر آ رہا تھا۔ جس نے اپنے سایہ میں بلا امتیاز رشتہ اور کنبہ کے ہر شخص کو پناہ دینے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہو۔ میں نے پورے خلوص سے پوچھا۔ ''ہاں تمہارا نام.....؟''

''رامو'' بڑی بے توجہی سے اس نے جواب دیا۔ اپنا نام ادا کرتے وقت اس نے جس بے توجہی کا اظہار کیا اس سے مجھے مزید دکھ پہنچا۔ تو گویا اسے اپنے نام میں کوئی دلچسپی نہیں۔

گھر میں بچوں کے نام رکھنے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پورے خاندان کی رائے زبانی یا خط کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اس رامو کے لیے اب نام سے زیادہ معمولی بات شاید کوئی اور نہ تھی۔

میرے دل نے کہا کہ اس بچے کو کیوں نہ اپنے ساتھ رکھ لوں اور اس کو تعلیم دلوادوں۔ میں اسی جذبہ کے تحت اس سے پھر پوچھا۔''رامو میرے ساتھ رہو گے، تمہارا نام اسکول میں لکھوادیں گے۔''

''نہیں صاحب۔ مجھے چھوٹے بھائی کو پڑھانا جو ہے۔ میں اگر پڑھنے کے چکر میں پڑ گیا تو اسے کیا پڑھاؤں گا۔''

مجھے اس کی آواز میں بے چارگی اور بے بسی نہیں'' بلکہ عزم کا احساس ہوا۔ اور دل سے ساری نیک خواہشات اس کی کامیابی کی لئے نکل پڑیں۔ سورج نے ابھی ابھی کئی دن بعد بادلوں کی اوٹ سے سر نکالا تھا۔ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی میں نے سوچا کیوں نہ رامو سے چنے خریدے جائیں تا کہ اس کی کچھ مدد ہو سکے۔ لہٰذا اس سے چنے کے دو پتے لگانے کو کہا۔ ایک اپنے لئے اور ایک اپنے بزنس مین دوست کے لئے۔

رامو نے دو پتے قدرے اہتمام سے تیار کئے، چنے عام پتوں سے زیادہ ڈال دیئے اور ہمارے ہاتھ میں پتے رکھ کر ڈلیا کو گلے میں لٹکا کر وہ آگے بڑھا۔

میں نے آواز دی۔''رامو پیسے لے لو۔''اس نے پلٹ کر کہا۔

''نہیں صاحب آپ سے نہیں۔''میں نے دوڑ کر اسے پکڑا اور دو روپئے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھا۔

وہ بولا۔''نہیں صاحب! آپ سے نہیں!''

مجھ سے کیوں نہیں۔ یہ پوچھنا میں ضروری نہیں سمجھا۔ میری بہت منت پر اس نے صرف ایک روپیہ یہ کہہ کر لیا۔''صاحب میں آٹھ آنے پتہ بیچتا ہوں۔''

میں نے اس ننھے فرشتے کی طرف دیکھنا چاہا۔ لیکن میری نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ دُور افق پر بادل چھائے ہوئے تھے۔

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ناول کے رنگ

شائع ہوگئی ہے

اُردو کے چند جدید ناولوں کا تجزیہ

ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈمی، چوک اُردو بازار۔ لاہور (042-37233165-37324164)

اندیشہ!

احمد زین الدین

کئی دن بعد ہم شفیق کو دیکھنے گئے۔ وہ اوپن ہارٹ سرجری کے بعد ریاض سے واپس کراچی آ چکا تھا۔ وہ میرا بہت قریبی رشتہ دار ہے۔ دل کے آپریشن کے بعد اسے نئی زندگی ملی ہے اور اب وہ تیزی سے روبصحت ہو رہا ہے۔ ملنے پر اس نے بڑی تفصیل سے ساری باتیں بتائیں۔ بیوی اور بچوں کے یہاں واپس آ جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کام کی زیادتی اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے اسے یہ تکلیف ہوئی۔ بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھا کہ اچانک دل کا دورہ پڑا۔ وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے قریبی دوست رحیم کو فون کر کے بتایا۔ وہ فوراً گاڑی لے کر آ گیا اور اسے ہسپتال لے گیا۔ اتفاق سے اسی ہسپتال میں اس کی بیوی رعنا کی سہیلی مریم کام کرتی تھی۔ اس نے ہر طرح سے اس کی مدد کی اور مریض کی ساری ذمہ داری اپنے ذمّے لے لی۔ اسی کی وجہ سے داخلہ اور دوا علاج کی سہولت اسے میسر آئی۔ مریم کی وجہ سے بڑی ڈھارس ملی۔ شفیق بار بار مریم کے حسنِ سلوک اور اپنوں سے بڑھ کر خیال رکھنے کی تعریف بھی کر رہا تھا اور بار بار یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''آپا میں بتا نہیں سکتا کہ ان دنوں مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں نے اوپن ہارٹ سرجری کرائی اور مریم ہی نے موت و حیات کی ذمہ داری اور فارم پُر کیا۔ دوست رحیم نے روپے پیسے اور بھاگ دوڑ کا ذمہ لیا اور مجھے دلاسا دیتا رہا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو ان لوگوں کا کیا ہوتا۔ مستقل ملازمت بھی نہیں تھی اور تنخواہ بھی کمپنی والے پوری نہیں دیتے تھے۔ پاسپورٹ انھیں کے پاس تھا تاکہ میں بھاگ نہ سکوں۔ وہ ہر ملازم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ البتہ میری ایمانداری اور محنت کی وجہ سے کمپنی والوں نے بھی خیال کیا اور حوصلہ بڑھاتے رہے۔'' ''شفیق زیادہ بات نہ کرو۔ تم کافی دیر سے وہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی تمھیں مکمل آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپریشن سے پہلے تم نے رعنا کو فون کر کے بتا دیا تھا، یہ بہت اچھا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا جو سارا کام بخوبی ہو گیا۔ تم بہت جلد صحت مند ہو جاؤ گے۔'' رات کے کھانے کے بعد میں نے اس کے بیٹے عادل سے کہا کہ بیٹا جا کر ٹیکسی لے آؤ، اب ہم جائیں گے۔ اس کی بیوی رعنا، فریدہ اور بھابی شائستہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ رعنا کے بچوں کی تعلیم کا ذکر آیا۔ عادل کیڈٹ کالج میں پڑھ رہا ہے اور چھوٹا حارث ایم بی اے کی تیاری کر رہا ہے اور بیٹی نگہت، جس کو ہم پیار سے نگی کہتے ہیں، بی اے کے بعد ایک کمپیوٹر کی کمپنی میں کام کرتی ہے۔ باہر کی کمپنی ہے۔ وہ لوگ اس کے کام سے بہت خوش ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دونوں بیٹوں کو رات کے وقت پارٹ ٹائم کرنے کی سہولت دے رکھی ہے۔ نگی کو ڈراموں میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اس نے تربیت بھی لینی شروع کر دی۔ وہ ٹی وی کے ڈراموں میں آنا چاہتی ہے۔ ہم نے اسے منع بھی کیا مگر وہ بڑی پُراعتماد اور حالات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ریاض میں ان لوگوں

کی انگلش میڈیم میں تعلیم ہوئی جس کی وجہ سے سارے بچے بڑے بولڈ اور سمجھ دار ہیں۔ وہ ہم دونوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ شفیق بھی صحت یاب ہوکر اپنے دوست رحیم، جس نے ریاض میں بڑی مدد کی تھی، کی کمپنی میں کام کریں گے تاکہ گھر کا خرچ چل سکے۔

فریدہ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے رعنا سے کہا، ''زمانہ بڑا خراب ہے۔ نگہت سیانی ہوگئی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ ڈرامہ کی ریہرسل میں اکیلی جاتی ہے۔ خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے۔ بڑے باپ کے لڑکے بڑے آزاد اور اوباش ہوتے ہیں۔ تم اس پر کڑی نظر رکھنا۔ شفیق تو مزاجاً رحم دل اور کم سخن ہیں۔ بچوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، مگر یہ شہر بڑا خراب ہے۔''

''ہاں آپا، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر نگی ایسی ہے نہیں۔ وہ اتنی بولڈ ہے کہ ایک بار میں نے اسے ٹوکا تھا تو کہنے لگی، مجھے اپنے اچھے بُرے کی تمیز ہے، آپ پریشان نہ ہوا کریں، روک ٹوک لگانے سے ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔'' ''بہرحال میری سمجھ میں جو آیا میں نے تم سے بتادیا۔''

''نہیں آپا، آپ نے ٹھیک سوچا۔'' کچھ دیر کے بعد عادل ٹیکسی لے کر آ گیا۔ وہ دس دن کی چھٹی لے کر باپ کو دیکھنے آ گیا تھا۔ اس نے فلیٹ کے نیچے سے آواز دی۔ ''ٹیکسی آ گئی ہے۔ جلدی کریں۔'' ہم لوگ اجازت لے کر نیچے آئے۔ ٹیکسی والے نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا اور پوچھا، ''سر جی، کہاں جانا ہے؟''

''نارتھ ناظم آباد، این بلاک جانا ہے۔ چلو میں تمھیں جگہ بتادوں گا۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے ٹیکسی چلاتا رہا۔ پچھلی سیٹ پر فریدہ اور شائستہ نگی کی آزاد خیالی اور لڑکوں سے بے تکلفی سے ملنے جلنے کی باتیں کرتی رہیں اور یہ بھی کہا کہ نگی ذرا دیر کے لئے گھر میں آئی اور پھر کپڑے بدل کر علیک سلیک کر کے فوراً چلی گئی۔ گاڑی پر اس کے ڈرامہ ریہرسل میں ساتھ دینے والے اس کے دوست انتظار کر رہے تھے۔ اس نے ماں سے کہا، مجھے جلدی ریہرسل میں پہنچنا ہے میں جا رہی ہوں۔ ڈرامہ کی شوٹنگ چل رہی ہے اور میں بھی اس میں شامل ہوں۔

''نگی کی آنکھیں کتنی خوب صورت بڑی بڑی ہیں اور اس کا فِگر بھی اچھا ہے۔ ہنستی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ بال بھی کمر تک آتے ہیں۔''

''اچھا، اب بس کرو۔ چل کر باقی باتیں کریں گے۔ ڈرائیور سن رہا ہے۔'' اس نے بڑی آہستگی سے کہا۔

''سر جی زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے۔'' ڈرائیور نے رائے دی جیسے اس نے ساری باتیں سن لی ہوں۔

میں چونک پڑا، ''مگر تم کو کیسے اندازہ ہے؟''

''دیکھیے نا سر جی، اب اخلاق محبت کی باتیں کوئی نہیں کرتا۔ جائز ناجائز ذریعہ سے کمائے ہوئے پیسوں سے آدمی آدمی میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ امیر، غریب کا۔''

''مگر تم کو یہ احساس کیسے ہوا؟'' میں نے اسے کریدنا چاہا۔

''سر جی، مجھے روزانہ بھانت بھانت کی سواریاں ملتی ہیں۔ میں ہل پارک کے اسی علاقہ جہاں سے آپ آ رہے ہیں، میں رہتا ہوں۔ میں کسی سے اتنی بات نہیں کرتا مگر آپ لوگوں کو شریف دیکھ کر میں کچھ بولنے کی ہمت کر رہا ہوں۔'' ''تمھارا نام کیا ہے؟'' ''ذُلف

قار'' (ذوالفقار)''''تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔''''سر جی، میں میٹرک کا امتحان پاس نہیں کر سکا۔غربت کی وجہ سے۔ پھر گاؤں چھوڑ کر پیسے کمانے کراچی آ گیا۔سر جی، میرے والد نے پیدائش کے بعد میرا نام ذوالفقار رکھ دیا۔ میں سن 1974ء میں پیدا ہوا۔اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا نام سب کی زبان پر تھا۔ ملک میں اچھے کام ہو رہے تھے اور پاکستان ترقی کر رہا تھا۔خوش حالی آ رہی تھی۔عوام ان کے دیوانے تھے۔ میرے والد کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ مجھے زلفی کہہ کر پکارتے۔ پھر 1977ء اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو آپ کو یاد ہوگا۔'' اس نے رک کر گہری سانس لی۔

میرے ذہن میں ماضی کے واقعات کے جھکڑ چلنے لگے۔ ملک دولخت ہو گیا اور ہم لوگوں کو دوسری ہجرت کرنا پڑی۔ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ جیل روڈ چورنگی پر رک گئی۔''کیا ہوا؟''''میں نے سرخ بتی پر دھیان نہیں دیا۔''''دیکھ کر چلاؤ میاں۔''

وہ پھر بول پڑا، جیسے وہ آج راستے بھر اپنی ہی باتیں سنائے گا۔''سر جی، اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔''

میں نے اس کے چہرے کو دیکھا، چھوٹی چھوٹی داڑھی، سیاہ رنگت، کشادہ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی جہاندیدہ آنکھیں۔ وہ نوجوان تھا مگر ایسی باتیں کر رہا تھا کہ جیسے اندر سے بوڑھا ہو گیا ہو۔مگر چہرے مہرے اور باتوں سے شریف لگتا تھا۔''سر جی، آپ مجھ سے بڑے ہیں۔شاید اس ملک میں اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے۔مگر میں تو آج کے زمانے کو دیکھ رہا ہوں۔اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔''

فریدہ اور شائستہ نے اس کی باتوں کی آہستگی سے تائید کی،''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔''

ان کے خیالوں میں گویا نگی پھر در آئی ہو۔ وہ ان کے ذہن سے گئی کہاں تھی۔

''ماں جی، آپ لوگ تو میری ماں سمان ہیں۔ مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ میں شہر میں رہ کر بھی گاؤں کو نہیں بھولا۔ جیسے گاؤں تو میرے اندر آباد ہو۔ میری عمر ان دنوں بارہ سال تھی۔ والد صاحب مجھے اپنے رشتہ داروں سے ملوانے دوسرے گاؤں لے گئے تھے۔ وہ لوگ بھی پیار سے مجھے زلفی کہا کرتے۔ یہ تیرے نانا ہیں، یہ پھوپھا، یہ ماسی اور یہ تیرے دادا ہیں۔نانا نانی تو میری پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو چکے تھے۔ ماں بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے دل میں نہال ہو رہی ہو۔سب لوگوں نے مجھے گلے لگایا، پیار کیا اور گُڑ دیے۔ دودھ لسی کے گلاس آ رہے تھے۔ گھی مکھن چپڑی ہوئی مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ جس پر ڈھیر سارا مکھن رکھا ہوا تھا۔ میرے دل میں وہ سارے رشتے ناطے آباد ہیں۔مگر میرا چھوٹا بھائی جو شہر میں پیدا ہوا ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔بس اسے اڑانے کے لئے پیسے اور اچھے کپڑے چاہئیں۔سر جی، ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ ایک بار ماما کے بیٹے کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ ماں اور بابا بھی شریک ہونے آئے تھے۔انھوں نے مجھے ماما سے ملوانے کی کوشش کی مگر وہ دھیان دیے بغیر دوسری طرف چلے گئے۔ان کے اس رویے پر میں رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر والد صاحب مجھے پنڈال سے باہر لے گئے۔ بڑے لوگ ہیں بیٹا، دولت مند لوگوں کی آؤ بھگت میں مصروف ہیں۔اس دن کے بعد میں کبھی ان سے ملنے نہیں گیا، اور ماں کے ساتھ فیصل آباد واپس چلا گیا۔ دنیا کسی اور طرف جا رہی ہے۔''

''تباہی کی طرف۔'' شائستہ نے کہا۔''تم اتنی چھوٹی عمر میں اتنی اچھی باتیں کرتے ہو زلفی۔اتنی سمجھ تم میں کہاں سے آئی۔''''سر

بھی کھا کر ہی آدمی سیکھتا ہے۔اس میں عمر کی کیا قید؟'' میں زلفی کی باتوں میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ میڈیکل کے دوران سے۔ کھڑے بھتیجے بھی ملنے نہیں آتے۔ واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔ زلفی نہ جانے کیوں ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ منزل پر پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ اس کی باتوں سے راستہ آسانی سے کٹ رہا تھا۔ مجھے گلی کا خیال آیا۔

اتنے میں زوردار بریک لگی اور ہم اچھل پڑے۔ ''کیا ہوا زلفی؟'' ''کچھ نہیں سر جی، پچھلی گاڑی میں چند نوجوان شور مچاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے اوورٹیک کر کے گزرے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ٹکر ہو جاتی۔ گاڑی اتنے قریب سے گزر رہی تھی کہ''

شائستہ نے ایک دم کہا، ''اگلی سیٹ پر نگی بیٹھی قہقہہ لگا رہی تھی۔''

''نہیں نہیں۔'' فریدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں نے دیکھا وہی تھی۔''

ان کی گاڑی تیزی سے دور جا چکی تھی اس لیے تصدیق نہ ہو سکی۔ مگر ہمارے ذہن میں بہت سے وسوسوں اور اندیشوں نے سر اٹھایا۔

''سر جی، میں نے ان لڑکوں کو کئی لڑکیوں کے ساتھ ہل پارک میں مستی کرتے ہوئے دیکھا ہے اور انھیں گاڑی سے ایسی ویسی جگہ چھوڑا بھی ہے۔'' ''تم کیا کہہ رہے ہو۔ نگی ایسی لڑکی نہیں ہے۔'' ''بہن، جی، یہ لڑکی نہیں تھی، دوسری لڑکیاں تھیں جو دولت مند باپ کے بیٹوں کے ساتھ عیش کرتی ہیں۔'' اتنے میں میرا موبائل بجا۔ رعنا کی آواز آئی۔ ''آپا نگی کا حادثہ ہو گیا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہے، ابھی اس کے دوست کا فون آیا تھا۔ شفیق کی حالت غیر ہو گئی ہے۔ ہم انھیں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔''

مجھے جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔

(مدیر رسالہ ''روشنائی'')

◆◆◆

پروین شیر ایک معروف شاعر، ادیب، مصور اور موسیقار کی ادبی خدمات کے اعزاز میں

Cape Town, Atlantic Ocean, South Africa

◆ راویہ کے زاویۂ نظر اور زندگی کی بصیرتوں سے لبریز استعاراتی انداز نے تاثر کی شدت کے ساتھ انسانی معاملات کی تفہیم کے پہلو کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اظہار اور اسلوب میں ایک ایسی جامعیت ہے جو کسی مخصوص شخص یا مخصوص علاقے کی محدود ذات اور قدروں کے بحران کو آفاقیت اور ہمہ گیری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ راقم الحروف اس ناقابلِ فراموش کتاب کا خیر مقدم کرتا ہے۔''

(پروفیسر ابوالکلام قاسمی، انڈیا)

◆ پروین شیر اپنے بیانیہ میں اندر ہی اندر ایک عقبی راہ سے فلسفیانہ فکر، یادوں اور جذبوں کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں۔ انہوں نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ حقیقی توضیحی زبان اور شعری زبان کے خواب رنگ پہلوؤں کے مابین ایک ربط باہم پیدا کر دیا ہے۔''

(پروفیسر ڈاکٹر دارین کیر یو، کینیڈا)

اُلٹا ناچتے بگولوں کی جل پریاں

ڈاکٹر زین سالک

زندگی وہی ہوتی ہے جو گزر رہی ہو۔ وہ نہیں جو گزرنے کے بعد نظر آئے کیونکہ وہ کسی نہ کسی درجے کے 'گرِم ریپر' سے بچ بچاؤ کرتی ہی نظر آئے گی۔ لڑتی نہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کہیں خالص صورت میں نظر نہیں آئے گی۔ سادگی کے سفید ملکوتی لباس کے بجائے ہمیشہ ملمع چڑھی ہی ہوگی۔

ماضی کے گرد آلودہ تجربے کے گرد آلودہ عدسوں سے دھندلی دکھتی، بے معنی سی ہنستی مسکراتی، اجل پر طنزیہ خنداں، مسکراہٹیں سمیٹتی انجام سے بے خبر، سوفرشتوں کی معصومیت کا بوجھ اٹھائے، زندگی کی کتنی بیگاروں کا جبر بھگتاتی۔

وہ ہیجان جانے کیا تھا جسکے آئیکون شیشے دامن میں سمیٹے، دل میں چبھتے ڈیفوڈلز کے گل دستے لئے وینس کے سراپا سے مدہوش و مغمور وہ کسی کپو پڈ کا تیر کھا کر خونم خون ہونے کو اولمپس پر چڑھا چلا آیا تھا۔ شاید زندگی کی بذات خود کوئی احمقانہ عارضی فریفتگی کوئی انفیچویشن یا پھر اسکے سرابی بگولوں کی سرزمین میں کھینچی ایسی کشش جو زمین سے ادھورے اجساموں کے ساتھ ادھورے ارمانوں، خوشیوں، مسرتوں کو لے جائے اور ناچتی جل پریوں کو چھوڑ جائے۔ جو آنکھیں ملاتے ہی میڈوسا کے شراپ کا کوئی سنگِ خارا، سنگِ موسی بنا دے۔

حیات نے اپنے ادوار کی سلاخوں کے پیچھے ہر نفس کو قید میں رکھا ہوتا تو انسان اپنے قد سے بڑھ کر فہیم ہوتا۔

یہ ادوار اسے بتدریج ایسی سیڑھیوں پر چڑھا کر معلق کر دیتے ہیں جہاں پچھتاوا کسی کام کا نہیں ہوتا اور صرف ایک ہی راستہ کھلا چھوڑتا ہے۔ جسکی طرف ہر ذی روح کا راستہ نہیں جاتا۔ یا یوں کہا جائے کہ وہ راستہ جسکے پار پھر محبت کی نیم برہنہ دیوی اپنی مہربانی اور ناراضگی کے ادوار کے چکرو یو لیئے کھڑی ملے گی۔

'وہ مصرعہ ذرا سنانا دوبارہ بازخ'

' کونسا.....اچھا وہ والا ؎ مجھ کو گھائیل کر گیا، ٹوٹ کر میرا سبو'

'ہاں وہی۔۔صرف مصرعہ۔۔'

حسبِ معمول مصرعہ سن کر جیسے اسے سکون آ جاتا۔

'اچھا دوست میں تو کلینک چلا کام پر'

اور وہ جیسے کسی میدانِ کارزار میں اترنے سے پہلے کوئی جوشیلی تقریر سن چکا ہو اور اگلے مرحلے کیلئے تیار ہو گیا ہو۔ اس کی علیحدگی کو سولہ برس ہو چکے تھے لیکن اُسے اپنے اس دور میں پچھلے ادوار اتنی وضاحت سے نہیں دِکھتے تھے کیونکہ وہ سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر

کھڑا تھا۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے ٹیکوں کا ٹوکرا سر پر اٹھائے، اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوششوں میں جھولتا، ڈولتا۔

سولہ سال پہلے وہ اُسکا بھرا پُرا آسودہ گھر چھوڑ کر کراچی چلی گئی تھی۔ بیمار بچی کا بقچہ بغل میں دبائے۔ کیا یہ بچی کے لاعلاج مرض کو بہتر جگہ علاج کروانے کا کوئی بہانہ تھا یا پھر عورت کے سو چلتّروں میں سے ایک چلّتر۔

اُس زمانے میں اسکے زنانہ غصےّ کے درجے کی حد اتنی نیچی تھی کہ جس سے نیچے کوئی، مہیج یا بیرونی محرّک کوئی ردّعمل پیدا نہیں کرتا۔ یہ تھریشن ہولڈ اتنا مختصر تھا کہ وہ سمجھتا جیسے فزیالوجی کی لیبارٹری میں تجربہ کرتے وہ پرانے ماڈل کے ڈرم پر خود کار سٹائیلش پین میں سیاہی بھر کر مینڈک کے دل کی حرکات کا گراف بناتے اپنی انگلیاں سیاہی میں لتھیڑ لیتا تھا۔ عورت کے جانے سے ایسا ہی کوئی غیر اہم عمل ہوا ہے اور ہونہہ کہہ کر جلدی اس خیال کو جھٹک دیا۔

جوانی کے روّیے میچور نہیں ہو سکتے تھے۔ محبت، الفت، غصہ، نفرت ہر شے جلدی اُبال کھا لیتی ہے۔ اور یا تو جلدی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یا پھر اگر فریق حساس طبیعت ہوں تو نفرت کا نہ ٹھنڈا ہونے والا تنور بھی جل پڑتا ہے۔ اور ابھی وہ خود سے حساس بننا نہ چاہتا تھا شاید۔

اور یا پھر یہ بھی عادتاً اسکا کوئی فرار تھا، زندگی کی مشکلات میں سے ایک مشکل کا۔ کچھ عرصہ بعد اسے ایک میٹھے درد کا احساس ہوا جیسے کبھی مڈل میں سوئمنگ پول میں اس سے زیادہ سینئر مشتاق انور نے اپنا جسم چھو جانے کے مغالطے میں اسکے چڈّھے کے بیچ لات ماردی تھی۔ جو اسکے فوطوں میں لگی تھی۔ لیکن اس نے انور کی یہ غلط فہمی ختم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

رشتے اور تعلقات جس خمیر سے بنتے ہیں وہ بیک وقت گاڑھا بھی ہوتا ہے۔ اور مایا سا بھی۔۔ اسے کسی صورت قرار بھی نہیں آ سکتا۔ یہ ہر وقت بگڑا بگڑا سا ہی رہتا ہے۔ ہاں البتہ جب یہ پہلے پہل قائم ہو رہا ہو تو عجب افسانوی لامتناہی پر کشش اور غیر مرئی سا رنگ دے جاتا ہے۔ جیسے آسمانی قوتوں نے ملکوتی برکات کے تمام بادل بیک وقت دو انسانوں پر انڈیل دیئے ہوں۔ اور اس سے پیدا ہونے والی کشش کچھ اس طرح لڑکے لڑکی کو جوڑتی نظر آتی ہے کہ آسمانوں پر بننے والے جوڑے کے محاورے کی سچائی کا مخملی لحاف لامحالہ اوڑھا کر نہ صرف سلا دیتی ہے۔ بلکہ خوابوں میں جدائی کے خوفناک ناگ دکھا دکھا کر انکی الفت کو مضبوط سے مضبوط تر کر جاتی ہے۔ اس سے پہلے بچپن کی محض ساتھی، کزن، سے لے کر لڑکپن کی پہلی شعوری رومانی دلچسپی تک اس سے تعلقات استوار کرنے کا ایسا کوئی مراق نہیں ہوا تھا۔ وہ انکے گھر اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گیا تھا۔ اور اپنی پینٹنگ کا تمام سامان، پینٹ برش، رنگ، پیلیٹ اور دیگر لوازمات سے لے کر ایزل تک لے گیا تھا۔ وہ ڈائینگ ٹیبل کے قریب بیٹھا تصویر بنا رہا تھا اور وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ایک لمحے کو اس نے بلیک اینڈ وائیٹ ٹی وی کی متحرّک تصویروں کو نظر انداز کر کے اُسکے سفید قمیض اور شلوار کے دل آویز سراپا سجی گلابی ہونٹوں کی پھبن دیکھی تو بھوں چکا سا رہ گیا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اسے کسی ایٹک کے غیر دلچسپ سامان میں ڈال رکھا تھا۔؟ ذہن میں اٹھتے اس سوال کا جواب میل، فی میل ٹین ایج کی انتہائی کشش کے بادلوں میں کچھ اس طرح کھویا کہ خط و کتابت کے ابنارا سے چاک کرنے لگے۔

'انڈر دا گرین وڈ ٹری' انکے خطوط کا کوڈ ورڈ تھا، اسکے ہرے پینٹ ہوئے بکس کے نیچے وہ خط رکھتا اور وہ کوڈ سن کر دوسروں کی نظروں سے بچکر فوراً اٹھا لیتی۔ ایسے دنوں میں سب سے زیادہ خوف جس اژدھے سے آتا ہے وہ رشتے میں پیدا ہونے والی نفرت سے ہوتا ہے۔ جو دونوں فریقوں کو دوڑا دوڑا کر بے حال کر دیتی ہے۔ اور وہ ادوار ٹاپتے ٹاپتے ایسے کھلے مقام پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے

آ جاتے ہیں جب اُس اژدھے کا خوف جا چکا ہوتا ہے۔اور دلوں کے افعے منہ کھولے آگ اگلنے لگتے ہیں۔

کیا ہر جوڑے کی کہانی ایک سی ہوتی ہے؟ کیا ہر جوڑا ایک غیر متوازن نرالا، طاق، پھٹکل جوڑا ہوتا ہے۔

ان سولہ برسوں میں اصل میں وہ انہی دائروں میں سر پر سبز بکس اٹھائے چلتا رہا تھا۔کبھی کبھار جیسے آنکھ کھلتی رہتی تھی۔اور کبھی لگتا کہ کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔زندگی میں وہ اسٹیج نہیں آیا آج کہ انجم کی طرح کہا جائے کہ۔

؎ جسکی نفرت بھی مجھے عزیز ہے۔

اسے یہ یاد تھا کہ بدنما دور کا اختتام چوتھی بچی کی پیدائش کے بعد ہوا تھا۔

مرد کی مرہونِ منت عورت بستر میں دیر سے بیدار تو ہوتی ہے لیکن اگر کچھ ناراضگیوں کے سبب مرد میں غیر دلچسپی، تنفر، بلاوجہ کی ضد والی منطق کو اپنے اوپر مرد کو نیچا دکھانے کی خاطر، اپنی انا کا سحر بنا کر طاری کر کے اور اپنی شادی شدہ بہنوں میں ناک کھڑی کر کے زندگی جہنم بنانے پر تلی ہو تو اپنے ساتھ سارے کنبے کو لے جاتی ہے۔ایسی عورتوں کے بارے میں ہی کہا جاتا تھا کہ عورت کی عقل اسکی گدّی میں ہوتی ہے۔یہی وہ عورت ہوتی ہے جو اپنی انا کے سائے میں خود اپنے آپ کو کسی مذہبی عقیدے کی سی طاقت سے کچلتی ہے اور بری طرح کچلی جاتی ہے۔

یہ محبت معمولی بھی ہو سکتی تھی۔شاید ہوتی بھی پر اتنی نہیں کہ کسی کی جان لے لینے یا دے دینے کی حد تک۔اسے پیار البتہ کہا جا سکتا تھا۔عشق نہیں، حالانکہ عشق پس منظر میں ضرور چل رہا تھا۔

یہ زمانہ 'تیری دنیا سے دور' جیسے مقبول فلمی گیتوں کا دور تھا۔

فہمیہ کراچی سے اپنے دونوں بھائیوں فہیم، مبین کے ساتھ چھٹیاں گزارنے اسکے گاؤں والی حویلی میں آنٹی انکل کے ساتھ آئی ہوتی تھی۔اور بار بار اپنے 'ون ٹریک مائینڈ' کے ساتھ پوچھتی۔

' کل تم مجھے یاد کر کے یہ گایا کرو گے نا'۔۔؟ ماموں مظفر علی اسکے ماتھے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر ہاتھ کے اشاروں سے کہا کرتے تھے کہ جس کا ماتھا ڈھلواں ہو وہ بندر کی طرح کم عقل ہوتا ہے۔اسکول کے زمانے سے انکی ہی ایک اور بات بھی بہت دنوں بعد اسے سمجھ میں آئی تھی کہ لڑکیاں جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔

اسے بچپن میں گھر کی 'انجمن' نامی فربہ ملازمہ نے لڑکپن سے ابتدائی بلوغت میں پہنچانے کا فریضہ ادا کیا تو اُسے پہلی بار اسکول میں ایک گوری کلاس فیلو اچانک اچھی لگنے لگی۔اسکول کی چھٹی کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی اور اسکی معیت میں آدم جی سٹریٹ پر اسکے والد کی عیسیٰ جی موسیٰ جی والی دکان تک جاتے۔جہاں وہ انہیں ٹھنڈا پانی پلاتی اور پھر وہ اپنی بس پکڑتے۔

اس نے عشقیہ اشعار چھپے ٹشو پیپر کے نیپکن پر ایک دن اپنا نام پینٹ برش سے لکھ کر اسے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بھجوایا تھا اور پھر اینجلا سکول چھوڑ گئی تھی۔شاید۔۔یقیناً اس احمقانہ ٹشو پیپر کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے اور آگے شاید ٹشو پیپر کا شامیانہ سامنے آ گیا تھا۔اور یوں انداز پرستش کو غائبانہ محبت کا مزا لینے کا موقع ملتے ملتے رہ گیا۔

ارے یہ کیا غلط سلط ہو گیا۔لکھنا تو کچھ اور تھا۔

ایک ڈیرھ عشقیہ میں سب نمٹنے لگا۔لکھنا تو وہ تھا جو سوچا تھا۔لیکن اب یہ باتیں چھڑ گئی ہیں تو وہ کہنا ہی پڑے گا۔لیکن نہیں۔ابھی نہیں۔ابھی نہیں تو کچھ دیر بعد سہی۔جیسے وہ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں والی، کبوتر کے انڈے جیسی سفیدی لیئے طنزیہ ہنسی ہنستی۔جیسے اسے خدا واسطے کا بیر ہو۔اسے صرف ایک گرُ آتا تھا۔اسکی انگریزی دوسروں سے بہتر تھی۔

اور اُسے اس کے کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آنے پر بیر تھا۔کلاس کے لڑکوں میں بیس بال کا کھیل جیت کر اسمیں 'کنگ' بن جانے سے چڑ تھی۔اُسے اسکی ڈرائنگ کی دوسروں کی زبانی تعریف سننے سے عناد تھا۔لیکن ادھر یکطرفہ خاموش محبت ہر قسم کے کچوکے کھانے کیلئے معصومیت سے دل کے قالین اسکے قدموں تلے پھیلائے سالوں منتظر رہا۔

بیسٹ فرینڈ کے بار بار اکسانے اور حال دل انجمن کو سنانے کی ہمت پیدا نہ ہوسکی۔سب سے پہلے فرید الدین نے بتایا تھا کہ محبت کے اظہار میں کبھی بھی دیر نہ کرو۔سب کہہ دو۔سب کچھ کہہ دو۔لیکن اسے اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ محبت کا مزہ جب ہے کہ محبت غائبانہ ہو۔موسم قرب، انتظار بھی جھوٹ، اگر دل اظہار پر نہیں راضی تو وصل یار بھی جھوٹ۔یہی تقدیر کا ہے فیصلہ میرے لئے۔

یہی روحوں کے اقرار کا وقت۔۔جانے کہاں کونسی آسمانی صف بچھ جائے۔! کیا یہ اس سے دوستی کی شدید خواہش تھی۔چاہت کے معنوں میں البتہ یہ ضرور میچور ہو چکی تھی۔'انفیچویشن' ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔پہلے بھی کئی بار کی طرح۔

اور اس کا کام گزشتہ سولہ سال سے صرف 'گرِم ریپر' سے چھپ چھپ کر گھر آنا رہ گیا تھا۔جہاں وہ بے نام کاغذ کی پرچیاں ہوا میں اڑاتا اور پھر انہیں چن چن کر گولڈفش کے خالی مرتبان میں جمع کرتا۔۔پھر اُڑاتا اور پھر جمع کرتا رہتا ہے۔

◆◆◆

تخلیق مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	دانش کدہ (پروپرائیٹر : شوکت علی) زہرا سکوئر، بلاک نمبر 6، گلشن اقبال (0300-2387965)
لاہور	ایسٹ بک ڈپو (پروپرائیٹر : محمد علیم) 6-B، مال روڈ، لاہور (0320-4343588)
گوادر	قندیل نیوز ایجنسی (پروپرائیٹر: شبیر شاکر) پیشکان ضلع گودار، بلوچستان (0322-3761579)

اپسرا

صائمہ نورین بخاری

سرسراتے آنچل، کھنکتے قہقہے، دمکتے عارض، یاقوتی ہونٹ، مشک یاسمین زلف سیاہ بردوش صبا، نازک نازک ادائیں.....چشم نیم خواب دیکھ رہی تھی کہ خزائنِ حسن کے جنگل میں جانے والی پگڈنڈی سجائی جا چکی تھی۔ بہت سے پھل دار درختوں کے ہمراہ کئی ٹنڈ منڈ درخت بھی اپنے اپنے تنوں میں کالا دھن چھپائے محوِ انتظار تھے کہ کب جشنِ طرب شروع ہو اور وہ اپنی اپنی تجوریوں کے منہ کھولیں۔

کئی جھلستی دوپہروں اور یخ بستہ سرد راتوں کے بعد یہ شام اپسرا کے نصیب میں لکھی گئی تھی.....آج پہاڑ، جنگل اور سمندر کی اس پری اپسرا کو اس صحرائے جدید میں اپنے حسن کا جادو جگانا تھا۔ تنگ گلی کی بڑی سڑک کے لمبے رستے، بھوکی نظریں، خالی جیبیں اور شکستہ گھر بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ تاریک غاروں کے روشن ایوانوں سے جشنِ طرب کی آوازیں اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ جام لبریز تھے.....فضا مشکبار تھی۔ مہکار، جھنکار.....سمندر کنارے نیلے پانی کی سبک خرام نقرئی لہریں.....جدید دنیا کی اس نشاط افزاء جادونگری میں جشنِ بہاراں بپا تھا۔ آج کا ''برائیڈل شو'' بھی اسی جشن کا ایک حصہ تھا۔ ''ڈیزرٹ سفاری'' ''ڈوکروز'' اور ''قلوپطرہ'' میں رقص و موسیقی کا اہتمام کرنے والے اب نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ ریمپ پر حسین ''بلیوں کی چال ڈھال'' سنوارنے کے لئے تیار تھے۔ یہ فیشن میلہ، ''میلہ مویشیاں'' کی طرح ہر سال سجتا تھا۔ کبھی اپنے وطن میں کسی امیر زادے کی پراسرار حویلی کے لان، دالان اور بالا خانے اس آرائش و زیبائش کے میزبان ٹھہرتے تو کبھی پانچ ستارہ ہوٹلوں کے بال روم، محفل ہال، شمع ہال دل آراؤں کے لئے بک کرائے جاتے۔ کبھی لال قلعے کی دیواریں، قمقموں سے جگمگا اٹھتی تھیں تو کبھی دور پہاڑی علاقوں کے حسین موسموں میں بادلوں کے سنگ روپ سروپ کے رنگ بکھیرے جاتے تھے۔ حُسن کے خریدار اور مصر کے بازار، ہزار کوششوں کے باوجود بند نہ ہوئے۔ اسی زعم کے بل بوتے پر دوبئی کے اس عظیم الشان ہوٹل میں تانیہ مغل کو ''ٹی۔ ایم'' کا کوڈ الاٹ کیا گیا تھا۔ سکول اور کالج کی معصوم اور ذہین طالبہ تانیہ مغل سے.....دولت اور شہرت کی بلندیوں کو چھوٹے والی ''اپسرا'' کے روپ میں ڈھلنے کا سفر.....طویل نہیں، کٹھن ضرور تھا۔ آج تانیہ مغل کا یہ پہلا فیشن شو نہیں تھا۔ اب وہ اپسرا تھی.....اندر سبھا کی ناچنے والی پری.....ملک کی مہنگی ترین ماڈل نہیں ''سپر ماڈل''.....ریمپ پر حُسن کے جلوے بکھیرنے والی سبز پری.....آج اس کے چہرے پر اعتماد کی چمک سے زیادہ غرور کی سرخی نمایاں تھی۔ پہلی ''کیٹ واک'' میں اس کے ہونٹ خشک اور ہاتھوں کی پوریں ٹھنڈ سے پتھر ہو گئی تھیں دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ لیکن جھیل ایسی آنکھوں میں شکار کو تلاش کرنے کی عیاری اور معصوم چہرے پر بھولپن کی اداکاری کمال کی تھی۔ اور اس نے پہلے ہی شو میں میلہ لوٹ لیا تھا۔ بوتیک والی کی بھی چاندی ہو گئی تھی اور ریمپ سجانے والے فوٹو گرافر دلاور فیاض کی خوشی دیدنی تھی۔ دلاور فیاض بے جان تصویروں میں جان دار رنگ بھرنے کا ماہر تھا۔ اس کی یہ جیتی جاگتی تصویریں اس

کے پیچھے ڈارک روم میں بھاگتی تھیں۔ الجھے ہوئے ملگجے سے حلیئے والے دلاور فیاض کے ڈارک روم سے تانیہ مغل کی ہوش رُبا تصویریں، اپنی تمام تر شرسامانیاں سمیٹیں جو باہر نکلیں تو ملک کے مہنگے فیشن ڈیزائنروں کے رسالوں کے سرورقوں اور سائن بورڈز کی رونقیں دوبالا کر گئیں۔ وہ اشتہاروں کی زینت بن گئی۔ لوگ اسے چاہنے لگے۔ ہنستی مسکراتی، سجی سجائی تانیہ مغل ہر شے بیچنے کی ضمانت ٹھہری۔ وقت کچھ اور بدلا..... اب وہ ملک کے چیدہ چیدہ دولت مندوں، پروڈیوسروں، فنانسروں کی اور ہدایت کاروں کی منظورِ نظر بن گئی۔ ریمپ پر ''کیٹ واک'' اس کے قدموں کی منتظر رہنے لگی۔

بسوں رکشوں کے دھکے کھانے والی تانیہ مغل ''ٹی ایم'' ''اپسرا'' کو آج مبتدیوں سے سخت نفرت تھی۔ آرٹ سٹوڈیوز کے باہر کھڑے سٹارٹر (Starter) اور سٹرگلر ''Struggler'' کہلانے والوں کے میلے کپڑوں بھنکتے حلیوں سے اسے گھن آتی تھی۔ آستینوں سے منہ پوچھتے، دامن سے عرقِ مشقت صاف کرتے یہ مبتدی بے چارے خود کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں..... خواہشوں کے مندر کی گھنٹیاں بجاتے، جوتیاں چٹخاتے، کامیابیوں کے یقین میں مبتلا، ناکامیوں کی سرد دھوپ میں جسموں کو جھلساتے، یہ حقیر..... بے توقیر..... کم مایہ..... دل گیر..... یہ کیفیات اس پر بیت چکی تھیں۔ اسے بے بسی کی سیاہ دھند میں غریبی ٹپکاتے آنگن میں چپ چاپ کھڑے سکھ چین کے درخت سے پتے جھڑنا اچھی طرح یاد تھا۔ اور جب امی مونگ کی دال چولہے پر چڑھاتے ہوئے اپنے خاندانی قصیدے پڑھتی تھیں تو دادا ابا اپنے سیلن زدہ، چھوٹے سے کمرے سے کھانس کھانس کر ان کی تائید کرتے تھے۔ تب وہ جل کر کہہ اٹھتی تھی۔

''امّی ہمارے خاندان والے ہندوستان میں پکوڑے بیچ رہے ہیں..... وظیفوں اور وثیقوں کی خیرات بھی ان کو نہیں مل رہی ہے۔ تم ہر لمحہ شجرے کے قصیدے نہ پڑھا کرو۔ خود کو بدل لو یا مجھے بدل ڈالو'' تو وہ چراغ پا ہو گئی تھیں۔

''ارے بہو'' تربیت نااہل را چوں گردگاں بر گنبد است''، نالائق کی تربیت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ گنبد پر اخروٹ پھینکنا''۔ دادا ابا کی تائید سرزنش میں بدل جاتی..... انہیں کون سمجھاتا کہ اب فارسی پڑھنے اور سمجھنے والے زمانے کی گرد میں کھو گئے ہیں۔ سب کچھ تو بدل گیا ہے۔ ذاتیں، وعدے، عہدے، زبانیں، تہذیبیں، انجمنیں، سارے منظر سراب ہو گئے۔ ہماری سکول کی آیا ''میڈ Maid'' ہو گئی فضیلہ بی بی درزن سے فیشن ڈیزائنر ایف بی (FB) کہلانے لگی۔ حنیف تندور والا ''شیف'' (Chef) کہلانے لگا۔ باسی سڑی بیکری والا ''ایسیک'' کے سائن بورڈ تلے بیٹھ چکا، ٹیچر ''کو آرڈینیٹر Co-ordinator ہو گئی۔ نہیں بدلی تو ایک کلرک کی حالت زار نہ بدلی۔ تانیہ مغل دختر علیم الدین مغل کلرک کی اوقات نہ بدلی۔ اس ''کلرک'' کے نام کی نئی ''ڈویلپمنٹ''، کوئی نیا ''ورژن'' کیوں تخلیق نہیں ہوتا۔ وہ خود کو مخفّفات کی دنیا میں کھویا ہوا پاتی۔ CO, MNA, MPA, DDO, DEO, DCO, کلرک Clerk۔ یہ کلرک، یہ پڑھا لکھا مزدور نہ ہوتا تو ان کا کیا ہوتا۔ وہ کب بھول سکتی تھی۔ کالج میں تقریب انعامات کی تقریب سنہری کرسی پر براجمان نوکیلی زبان والی دس جماعتیں پاس صوبائی وزیرِ تعلیم حشمت چنگیزی کی نک چڑھی، بیگم نے لفظ کلرک کو کچھ اس طرح ادا کیا کہ اسے یوں لگا کہ اس سے بڑھ کر کوئی حقیر اور کم تر شے اس کرۂ ارض پر موجود نہیں۔ اس پر تپ لرزہ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

''دیکھو..... علیم الدین کلرک کی بیٹی نے اتنے نمبر لے لئے۔ پنجاب بھر میں دوسری پوزیشن..... نہ ان لوگوں کے گھروں میں بجلی ہے نہ پانی۔''

مگر بھئی ہے ''خدا کی مہربانی''.....امیر شہر کی تھلتھلی بیگم نے طلائی چوڑیوں بھرے ہاتھ نچائے۔کالج کی پرنسپل اور پروفیسرز ان نیم خواندہ عورتوں کے آگے کسی حرم کی کنیزیں معلوم ہو رہی تھیں۔وہ اساتذہ کے اس تملق پر حیران تھی۔اندر کی جذباتی تناہٹ، تناؤ میں بدل گئی تھی۔اس نے عین موقع پر وزیرِ تعلیم حشمت چنگیزی کے دست خاص سے بی۔اے کی ڈگری اور میڈل لینے سے انکار کر دیا۔اس کی اس اعلانیہ بغاوت پر سب حیران رہ گئے۔وزیرِ تعلیم کھسیانے لگے۔اور ان کی بیگم چراغ پا نظر آئیں۔تقسیمِ انعامات کے بعد چائے کی پرتکلف میز پر بھی ان نخوت زدہ چہروں کے تبصرے جاری رہے۔ڈی سی او کی بیگم وزیرِ تعلیم کی تنی ہوئی بیگم کو تسلی دے رہی تھی۔سب پوزیشن ہولڈرز طالبات بھی سن رہی تھیں۔

''یہ علیم الدین کلرک کی بیٹی پتہ نہیں خود کو کیا سمجھ بیٹھی ہے حور پری یا اپسرا.....شکل میں پتہ نہیں کس پر گئی ہے باپ بے چارہ کلرک ٹٹ پونجیا، حلال حلال کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔گردے فیل ہو چکے ہیں.....سرکاری خرچے پر مہنگے ڈائیلسز کے علاج کی درخواست ٹائپ کرتا رہتا ہے۔تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی۔اوپر سے نیچے تک اس حلال حلال کی رٹ لگائے جانے والے قبر کے مردے سے سارا عملہ پریشان ہے۔جلد ہی فارغ ہوگا بے چارا۔''

تانیہ کے حواس قابو نہ رہے۔چائے کی ٹیبل سے ٹکرائی۔ضبطِ غم سے چہرہ سرخ لئے آڈیٹوریم سے باہر نکلی مگر سیڑھیوں پر ایسا چکر آیا کہ ساتھی لڑکیوں نے پانچویں سیڑھی سے اٹھایا۔

کئی دنوں تک ان حروف گیری کے زخموں کو سنبھالتی رہی۔اس کے گھر کی بالائی منزل پر وحشت زدہ کمرے میں ایک بوسیدہ سا صوفہ، پرانی میز اور کچھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔وہ سارا دن بیٹھی دادا ابا کی ضخیم کتابوں اور ابا کی پرانی یادگار تصویروں کی دھندلی نظروں سے ٹٹولتی رہتی۔مگر آج خوشبو خوشبو، شبنم شبنم چہرے، دیپک آکاش سب ہی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار تھے۔لگژری فلیٹ میں شفٹ ہوتے ہوئے اور امی سے دعائیں وصول کرتے ہوئے اس کے من میں وہی نکتہ چینی بھری محفل یاد آ گئی۔اس کا من چاہتا تھا کہ نہ کپڑا نہ پانی کے طعنے دینے والے اس طبقے کی متکبر عورتوں سے ضرور پوچھے کہ اپنے رشتہ دار، وڈیرہ ذادوں سے زبردستی جائیداوں کے پھندوں میں بندھی..... خوش گوار ازدواجی زندگی کی اداکاری کرنے والے چنگیز خانوں کی یہ بیگمات، دھاندلی کے تمغوں کو فخر سے سینوں پر سجانے والے امیرزادوں کی تنگ ذہن بیویاں کہاں جاتیں اگر انگریز غداری کے صلے میں ان کے باپ داداؤں کو بخشش میں قوم کی زینتیں عطا نہ کرتا۔کوئی امیرِ شہر کی الیف۔اے فیل بیگم سے پوچھے کہ ہر شہر میں تعینات یہ کوتوالی افسران تین سال کے مختصر عرصہ اختیارات میں قیامت تک کے لئے لمبی لمبی جائیدادیں کیسے بناتے۔اگر یہ کلرک، ہزار ہزار کنال کی اراضیاں فائلوں کی سیاہ گھاٹیوں میں دفن نہ کرتا۔

یہ جعلی ڈگریوں والے کس جادو کی چھڑی کے زور پر گیارہ گیارہ سال وزارتوں کے مزے لوٹتے.....واقعی یہ لارڈ میکالے کے نظام کے پیدا کردہ کلرک کے دشمن نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟.....کچھ عرصے کے بعد اس پڑھے لکھے مزدور علیم الدین کلرک کا انتقال ہوگیا۔اس کی بیچلر آف آرٹس کی ڈگری کہیں کام نہ آئی۔کلرکی بھی نہ ملی۔دادا ابا بھی روتے روتے آخری وقت تک اسے سمجھاتے رہے کہ ان ''امیروں کے ہاں معقولیت کا گذر عدم غریبی کے باعث نہیں ہوتا۔اس لئے وہ خود کو ان کی عامیانہ باتوں سے ہلکان نہ کرے۔زندگی میں کوئی مقام ایسا ہوتا ہی نہیں جسے آغاز قرار دیا جائے یا انجام سمجھا جائے۔جہاں ایک کہانی ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع ہوتی نظر آتی ہے۔

بس زندگی کے سہارے کمزور نہیں پڑنے چاہئیں''۔ اور یہی ہوا دادا ابا کے انتقال کے بعد اماں کا سہارا بہت کمزور پڑ گیا۔ مگر ایک نئی کہانی شروع ہوئی۔ دلاور فیاض اس کی زندگی میں داخل ہوا اور اس کے اعتماد کو سہارا سا مل گیا۔ فیاض کی نظر اس پر پہلے سے تھی۔ کالج کے فوٹو سیشن سے حیات فوٹو شاپ اور پھر دلاور فوٹو سٹوڈیو تک رسائی..... مسز رمیشہ خان المعروف R.K ''آر کے'' کے دولت کدے پر حاضری تک وہ ان مراحل سے گذر چکی تھی جسے تجربہ گاہ کی بھٹی کہا جاتا ہے۔ مسز خان نے اس کی خوب صورتی اور دراز قد سے متاثر ہوتے ہوئے اسے ایک غیر معروف پروڈکٹ کے اشتہار میں ماڈلنگ کی پیش کش دی۔ اور چند ''قیمتی نصیحتیں'' بھی کیں۔ بقول مسز خان اس نے تازہ ترین تیسرے شوہر سے نجات حاصل کرنے کے لئے کورٹ میں کیس کیا ہوا تھا۔ وہ اس شوہر نام دار کی مجنونانہ محبت اور غیرت مندی سے تنگ آ چکی تھی۔ ''ہمارے در پر آتے ہوئے یہ مجنوں اپنی غیرت مندی سلا کر آتے ہیں اور جب ہمیں اپنانے کی جرات کر لیتے ہیں تو پھر غیرت کے جلے خیمے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' گفتگو کی جاذبیت، اعلیٰ تعلیم اور پُرکشش ہونے کی بناء پر اسے کئی ثِقہ ٹی وی چینلوں نے پیش کش دی تھی کہ وہ صبح کے پروگراموں میں ہلا گا میزبانی کرے۔ یا شام کے سیاسی باتوں والے ''عالمانہ'' پروگراموں میں سیاسی عارفوں کو لڑوائے..... یا نورا کشتی پیش کرے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ عام انتخابات کے دنوں میں تو باقاعدہ بولیاں لگ رہی تھیں۔ ہر سنسنی پھیلانے والے میزبان کی نیلامی ہو رہی تھی۔ مگر زہریلی مسکراہٹ والی حسین رمشیہ خان کو اطمینان تھا کہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ زعما، وزراء، سفراء اور ڈان، آئی کون ٹائی کون وغیرہ ایسی شخصیات سے کما لیتی تھی۔ سب اس کی قابلیت کا دم بھرتے نظر آتے تھے۔ کئی ماہر درزیوں اور حجاموں کو اس نے فیشن کی دنیا میں ''ڈی زائینرز'' اور ہیر سٹائلسٹ'' کے طور پر متعارف کروا کر بامِ عروج تک پہنچایا تھا۔ اور اب وہ تانیہ مغل کو T-M ٹی ایم کے نام سے متعارف کروانا چاہتی تھی۔ جب بھی خانگی، ازدواجی زندگی، خاوند یا میاں کے موضوع پر بات ہوتی تو وہ بڑی دُرشتی سے کہتی.....

''ڈیئر..... مجھے گھر ''پرابلم'' پالنے کا کوئی شوق نہیں یُو نو..... آزادی اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اگر تمہیں اعتماد ہے خود پر تو اس بھری دنیا میں بہت زندہ پیر مل جائیں گے..... ان زندہ پیروں کی گردنوں سے لپٹا زناکس نے دیکھا ہے؟ اللہ ہی جانے کون بشر ہے۔ میری اکلوتی بیٹی لندن میں قانون پڑھ رہی ہے اور کتھک کی ماہر ڈانسر بھی ہے۔ میری یہی نصیحت اس کے لئے بھی ہے۔ میری پیاری اپسرا''.....

مسز خان کی فلاسفی خالصتاً ''مارکیٹنگ بیس'' تجارتی بنیادوں پر مبنی تھی۔ وہ ایم۔ بی۔ اے MBA تھی اور تجارت کے چیدہ چیدہ رہنما اصولوں سے بخوبی واقف بھی۔ چند سالوں کی مشق کے بعد ''ماڈل'' اور پھر ''سپر ماڈل'' ہونے تک ہر ''کیٹ واک'' میں مصنوعی پلکوں کو اٹھاتے گراتے مسز خان کے یہی الفاظ تانیہ مغل کے کانوں میں گونجتے رہتے.....

''اے اپسرا..... اپنی مہکتی سانسوں کے زیر و بم سے زیرنگیں سلطنت پر شاہانہ نظر دوڑاؤ۔ اور زیرِ نظر کو زیر کر لو۔ تم تو زرکوب ہو۔ ان زرِ سرخ، زرِ طیار، زرتار، زرتاب اور زرِ ضامنی رکھنے والے، زرِ گل کے خریداروں کو اپنے یاقوتی ہونٹوں سے پیامِ زندگی پہنچاؤ اور ان کو زرِ کل سمیت لوٹ لو۔ کئی سالوں تک زنجیر دادتم نے ہلائی مگر فریادی کی فریادی رہیں۔ عزت کی نوکری ملی اور نہ باپ کی شفقت رہی۔ نہ پیا کا گھر ملا نہ خدا کا در ہر جگہ استحصال اور پائمالی۔ تو اب کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر ہوسنا کی چاٹتی، زرِ سیاہ کی اس بھوکی مخلوق کو اپنے قدموں تلے کچلتی

جاؤ۔ کیوں کہ زندگی میں مواقع نکل جاتے ہیں مگر مواقع ختم نہیں ہوتے۔''

اور پھر اس نے ہر موقع کا بھرپور حظ اٹھایا۔ آج بہت سے زعیم و سردار اس زرنگار کو چھونے اس کے در پر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ بزرگ والدہ بڑے اطمینان سے آسائشوں سے بھرپور زندگی گذار رہی تھیں۔ سب کچھ تھا..... کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے سب کچھ ہونے کا احساس، عمر کے پواؤ پر شام ڈھلنے کا انتظار اسے ہرگز نہ تھا۔ جتنا بنک بیلنس وہ یخنی، اُبلے پانی، کچی سبزیوں، بے پناہ ورزش، سبز چائے اور شیشہ پینے کے زور پر بنا سکتی تھی بنا رہی تھی۔ وہ شیشے کے نازک حقے کی کش لگاتے ہوئے خود کو سب سے زیادہ مسرور محسوس کرتی تھی۔ شیشے کی نازک صراحی سی اپسرا..... پوری رات شوٹنگ دن بھر سونا۔ چمچماتی گاڑی..... شان دار بنگلہ، مہنگی خوشبوئیں، قیمتی ملبوس اور سب سے بڑھ کر اشرافیاء میں عزت..... وہ بڑی تلخی سے مسکرائی۔ آج بھی اشرافیاء کا شاندار میلہ اپنی شروعات کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ وہ کل اپنے ثقافتی وفد کے ہمراہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت ''برج الخلیفہ'' کی سب سے بلند منزل پر خود کو پا کر کس قدر مسرور تھی۔ شیشے کے حصار میں اس نے اس خوف ناک بلندی سے نیچے جگمگاتی دنیا کو دیکھا۔ روشنیاں بکھیرتے کھجور کے درخت کے پھیلے ہاتھوں پر ایک نیلگوں لہر۔ اور بلندیوں کی انتہاء کو چھونے والی اپسرا۔ حسین دنیا سے کس قدر بلندی پر..... آج اس عظیم الشان ہوٹل میں خطے کی حسینائیں جلوہ گر ہوں گی۔ حُسن کی جدید تراش خراش کے ماہر اور خواص کے نمائندے لباس کے نام پر بے لباسی کا مظاہرہ نہایت ادب اور سلیقے سے دیکھیں گے۔ ''برائیڈل شو'' کے بعد ''سمر کلیکشن'' کی پریڈ بھی ہونی تھی۔ اچانک میک اپ روم میں داخل ہوتے ہوئے اس نے حسین چہروں کے درمیان ایک پلاسٹک کی گڑیا نما بڑھیا کا تمکنت سے تنا ہوا چہرہ دیکھا۔ گہرا میک اپ عمر کی سلوٹوں کو اور مکروہ بنا رہا تھا۔ اس کے ساتھ پھیکی، کھسیانی سی مسکراہٹ والے..... بوٹاکس انجکشنوں سے منہ سجائے..... سرجری سے کسے تنے، مصنوعی بالوں کی گھنیری پستیری سر پر جمائے، سابقہ وزیر تعلیم حشمت چنگیزی کو وہ کیسے نہ پہنچانتی۔ تیسرا چہرہ نسبتاً امید افزاء نوجوان تھا۔ وہ یقیناً اس عجیب جوڑے کی صاحبزادی تھی..... بالوں کے اونچے جوڑے کو آتشی زرد رنگ کے رومال میں چھپائے۔ عربی خواتین سے متاثر لباس، مصری عورتوں ایسی کاجل دھار آنکھیں..... ہندوستانی خواتین ایسے زیورات میں لدی پھندی وہ دونوں خواتین سب کو زبردستی مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ ذہن میں جھماکے ہوئے۔ جہنم کی گھاٹی دہکنے لگی..... حروف گیری، حقارت، بے توقیری سب مرحلہ وار آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ تعلیم کے نام پر کروڑوں کا غبن کرنے والے وزیر تعلیم اور آج یہاں..... ریمپ سجانے والوں کے درمیان۔ ایک زہر آلود مسکراہٹ ''اپسرا'' کے چہرے پر چھا گئی۔ آج انہیں معلوم نہیں ان جیسے میرے ناخنوں میں بھرے پڑے ہیں۔ اور ان کی بیگم ایسی آیا میرے کچن میں ''Maid'' ہے۔ اور ان کی خاندانی بیٹی ایسی میرے کپڑے سینے والی ڈیزائنر ہے۔ ''ریڈ کارپٹ'' پر شور اٹھا۔ رنگ برنگے ٹی۔ وی چینلز کی پتلی پتلی لڑکیاں موٹے موٹے مائیک تھامے مشہور شخصیات کی طرف لپکیں۔ سب سے پہلے چیف صاحب کا تعارف ہوا۔ پھر سابقہ وزیر تعلیم نے بحیثیت آرگنائزر اپنا مدعا بیان کیا۔ کہ وہ اس شو کے آمدنی کا نصف حصہ پاکستان میں موجود غریب، مزدور طبقے کی خواتین کی فلاح و بہبود کو دینا چاہتے ہیں۔ ''اس سے ضرور غربت کی نچلی سطح پر زندگی گذارنے والے خواتین اور ان کی تعلیم و فلاح میں مدد ہوگی۔'' وہ مسکرائی۔ ہاں جناب اشرف الاشراف..... اشک شوئی کا شکریہ۔ یہ تماشہ خانہ آپ جیسوں نے ہی اپنا ملک لوٹ لوٹ کر آباد کیا ہے۔ یہ آپ ہی تھے جن کی تقاریر حلال و حرام کی تمیز سے لبریز ہوتی تھیں اور آج اپنے کالے دھن کی ''منی لانڈرنگ'' کا کیسا عمدہ، رنگین و حسین ذریعہ نکالا آپ نے جناب۔ واہ صاحب واہ۔ وہ

یہی کچھ سوچتے ہوئے تمکنت سے آگے بڑھی۔ اونچے قد کے بونوں کے درمیان وہ کس قدر اونچائی پر تھی۔ کالی آنکھوں اور بے وقوف مسکراہٹ والی لڑکی نے اسے خود کو اپنے سامنے کیمرے کی روشنیوں میں جھلملاتے ہوئے دیکھ کر کہہ۔ ''ممی.....اپسرا.....تانیہ مغل۔ اور کس قدر خوب صورت، بیوٹی فل.....وزیر تعلیم متوجہ ہو کر کھسیانے لگے۔ بیگم صاحبہ تڑپ اٹھی۔ ''اوہ تو بیٹا، اپنے مرتبے کا لحاظ کرو۔ یہ کوئی شریف ذادی ہے بھلا.....حرام خور کہیں کی۔ وہی کلرک کی بیٹی.....بدکردار عورت ثابت ہوئی نا.....باپ دادا کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ اس سے کوئی بات نہ کرنا.....کوئی نہ کوئی تماشا کھڑا کرنے میں ماہر ہے۔ اشراف پاؤں پڑے، کمینہ سر چڑھے''.....سجی سجائی دلہنیں ریمپ پر واک کے لئے مدار سرخ سبز آنچل سنبھال چکی تھیں.....اور پھر سنہری روشنیوں میں زمینی کیڑے مکوڑوں کو کچلنے والی چال چلنے والی ست رنگی حسیناؤں کے درمیان سب مطمئن، مسرور اور متکبر چہروں نے محسوس کر لیا کہ ''اپسرا'' کے قدموں میں لغزش تھی۔ چشمِ سیاہ پرنم تھی۔ یاقوتی ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ سرخ ملبوس میں ڈھکے چھپے سینے سے کوئی طوفان ابلنے کو تیار تھا۔

.....اپسرا کا دم گھٹنے لگا.....فضا حقارت کے سیاہ دھویں سے بھری بوجھل ہونے لگی۔ دور افق سے آئے ہوئے پرندوں کے نغموں پر حُسن کے افسانے سناتی ماڈلز اسے کرلاتی غموں کے گیت گاتی پیاسی کونجیں معلوم ہونے لگیں۔ ٹیڈیوں کی آوازیں اپنی بددعاؤں کو دہرانے لگیں.....حسین پرندوں کے سروں میں سوراخ ہو گئے۔ رعونت کی فصل اُگ آئی۔ لپکتی روشنیوں، جھمکتے کیمروں میں سب نے دیکھا کہ حُسن کی دیوی، سبز پری ''اپسرا'' لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ریمپ سے نیچے گر پڑی۔

''اف خدایا۔ اوہ گاڈ.....او مائی گڈنیس.....''

''بے چاری کی ہیل ٹوٹ گئی''۔

''کیا ہوا۔ کوئی میک اپ روم میں سازش ہوئی ہے کیا؟''۔ مختلف آوازیں اٹھیں۔ مگر اندھیرے میں لحظہ لحظہ ڈوبتی ہوئی اپسرا کو یوں لگا جیسے ان سب نے اسے بلندی کے سب سے اونچے برج کی چوٹی سے اسفل کی گھاٹی میں دھکا دے دیا ہو۔ اے گریۂ شیشہ.....اے گلابی آنکھ.....اے چشمِ نیم خواب ذرا دیکھ.....یہ امیر یہ وزیر.....ایک کلرک زادی کو پھر بے توقیر کر گئے۔ اے صبر کے سمندر اس رعونت کے صحرا کو نگل جا۔'' اس کے نازک وجود سے چیخ نکلی اور دور افق میں ڈوب گئی۔

◆◆◆

اطلاع عام

قارئین کی پرزور فرمائش پر رسالہ ''تخلیق'' کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ ''تخلیق'' پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تحریریں download کر سکتے ہیں۔

شارٹ کٹ

تسنیم کوثر

کالے رنگ کی چَم چَم کرتی لمبی سی کار فراٹے بھرتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی تھی..... میں نے بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ کر خود کو اور بہادر کو بچایا تھا..... کار کی رفتار خاصی تیز تھی..... میں کار چلانے والی کی جھلک ہی دیکھ سکی تھی مگر پھر بھی..... وہ میری پہچان کے دائرے میں آ گئی تھی۔ وہ عذرا تھی۔ یقیناً وہ عذرا ہی تھی..... خوبصورت سی عذرا..... جو میری کلاس فیلو تھی..... ہم دونوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا..... ہم اکٹھے سکول جاتے، اکٹھے سیپارہ پڑھنے جاتے..... ہم دونوں نے ایک ہی سکول سے میٹرک کیا تھا۔ دس سالہ تعلیمی دور میں، اس کا اور میرا تقریباً روز کا ساتھ تھا پھر میں عذرا کو کیسے نہ پہچانتی؟

مگر وہ عذرا..... جسے میں جانتی تھی اس کا تعلق ایک بہت ہی غریب گھرانے سے تھا..... عذرا کا باپ مزدوری کرتا تھا..... ڈھیر سارے بہن بھائی تھے..... روٹیوں کے لالے پڑے رہتے تھے..... اگر یہ وہی عذرا تھی تو یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ؟..... میرے ذہن میں کھد بد ہونے لگی کیونکہ جس عذرا کو میں جانتی تھی اس کے گھر کے دروازے پر لٹکتا ہوا ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ اس گھر کے مکینوں کی غربت کے سارے راز فاش کر دیتا تھا۔ عذرا کو اپنی غریبی کا بہت دکھ تھا۔ وہ ہر وقت افسردہ سی رہتی۔ نہ پڑھائی میں اس کا جی لگتا تھا اور نہ گھر میں۔ خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنا اس کی عادت تھی۔ امارت اس کا شوق تھا۔ مگر غربت میں امارت کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عذرا چڑچڑی سی ہوگئی تھی۔ سکول میں کوئی فنکشن ہوتا یا کسی عزیز کی شادی..... عذرا پر غم کے طوفان امڈ آتے۔ وہ پریشان ہو جاتی..... ماں سے نئے کپڑوں کی فرمائش کرتی۔ گھنٹوں روتی رہتی۔ پہروں روٹھی رہتی۔ احساس کمتری میں گھری عذرا کئی کئی دن سکول بھی نہ جاتی تھی۔ اسے نت نئے فیشن پسند تھے اچھے کپڑے اور جوتے خریدنے کا شوق تھا..... نیل پالش بہت پسند تھی..... مگر اس کے یہ سب شوق پورے نہیں ہو سکتے تھے..... وسائل ہی نہیں تھے تو..... کہاں سے سارے شوق پورے ہوتے؟

حالات تو میرے گھر کے بھی زیادہ اچھے نہ تھے مگر سفید پوشی کا بھرم قائم تھا میں بہت قناعت پسند تھی..... ہر حال میں خوش رہتی تھی..... بچپن سے میری یہی عادت تھی..... جو مل گیا، کھا لیا..... جو امی نے کپڑے بنا دیئے..... پہن لیے..... سادگی میرا شعار تھی اور میں عذرا کو یہی سمجھاتی تھی مگر جب بھی اسے سمجھانا چاہا..... وہ مجھ سے الجھ پڑی۔ جھنجھلا کر کہتی..... زہرہ، زندگی ایک بار ملتی ہے..... اگر وہ اتنی غریبی میں ہر شے کو ترستے ہوئے بیتے تو دکھ ہوتا ہے نا۔

کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھی..... مگر نصیب میں جو لکھا ہو وہی ملتا ہے میں اسے سمجھاتی۔ تم تو ہم سب سے زیادہ امیر ہو..... تمہارے پاس حُسن کی دولت ہے..... تم سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔ مگر وہ کچھ نہ سنتی..... نہ میری باتیں..... نہ اپنی ماں کی نصیحتیں۔ شب و روز اسی

طرح بیت رہے تھے کہ ہم نے میٹرک کے پیپر دے کر سکول کو خیر باد کہہ دیا اور یوں ہمارا روز کا ساتھ چھوٹ گیا۔

میں نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنا چاہا تھا مگر اسی دوران ممانی جان اپنے بھتیجے کا رشتہ لے آئیں۔ امی تو نہال ہوئی جاتی تھیں۔ ان کی بیٹی کے لئے خاندان سے رشتہ آ گیا تھا۔ میکے والے امی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ امی کی خوشی بے جا نہ تھی۔ میں بھی خوش تھی۔ اپنا گھر بسانے کا خیال ہی دل کو گدگدا دیتا ہے۔

احمد ایک پرائیوٹ فرم میں ملازم تھے..... تنخواہ بھی ٹھیک تھی اوور ٹائم لگا کر اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ امی نے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہ مانگی۔ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئیں۔ میں مڈل کلاس سے نکل کر اپر مڈل کلاس میں آ گئی۔ احمد اچھے شوہر تھے..... محنتی تھے..... ذمہ دار تھے..... ان میں کوئی برائی نہ تھی۔

مگر ان میں کوئی اچھائی بھی نہیں تھی۔ انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ ان کا کوئی حلقہ احباب نہیں تھا۔ ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

وہ تو بس ایک روبوٹ کی طرح۔ صبح اٹھتے..... ناشتہ کر کے مجھے ترکاری لا دیتے۔ رات گئے واپس آتے..... کھانا کھاتے اور سو رہتے، نہ انہیں گھومنے پھرنے کا شوق تھا..... نہ انہیں خوبصورت جذبوں کے اظہار کا سلیقہ آتا تھا..... نہ برائی کرتے تھے نہ اچھائی کرتے تھے..... شادی نے بھی احمد کی پختہ عادات کو نہ بدلا تھا۔ وہ ایک رٹو طوطے کی طرح وہی سبق پڑھ رہے تھے جو..... پڑھتے آئے تھے۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح اسی ڈگر پر گامزن تھے جس پر..... چلتے آئے تھے۔ اپنے اردگرد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گھریلو حالات تو ہمارے ہاں بھی آسودہ نہ تھے۔ مگر ان میں رنگینی ضرور تھی۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا تھا۔ امی کو سینما جانے کا شوق تھا۔ اور ابا سینما ناپسند کرتے ہوئے بھی امی کی خوشی کی خاطر ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ امی کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ امی نے ابا کو..... اپنے سر تاج کو سچ مچ کا تاج بنا رکھا تھا۔ ان کے پسندیدہ کھانے کا خیال، ان کے کپڑوں کا خیال، میں نے امی کو ابا کا پرستار و وفا شعار پایا تھا۔ میری گھٹی میں بھی یہی سب کچھ تھا۔ اس لیے میری اور احمد کی خوب نبھی۔ میں نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی..... کہ میری اپنی پسند کیا ہے؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں ایک وفا شعار بیوی کی طرح وہی کرتی جو احمد چاہتے تھے۔ جو ان کا جی چاہتا، مجھے لا دیتے وہ مجھے جہاں لے جاتے، میں چوں چرا کیے بغیر ساتھ چل دیتی۔ میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔

احمد کو محلے میں ادھر ادھر بلاوجہ بے مقصد آنا جانا پسند نہیں تھا۔ میں نے ان کی غیر موجودگی میں بھی کبھی..... گھر سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب کبھی ان کے جی میں آتا، مجھے امی سے ملوانے لے جاتے۔ کبھی امی کو اپنے ہاں لے آتے۔ میں نے احمد سے کبھی کوئی ضد، کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ یہ سب مجھے آتا ہی نہیں تھا میں نے امی کی اس نصیحت کو پلے باندھ رکھا تھا کہ فرمائش کرنے والی عورت کو مرد پسند نہیں کرتا۔ واقعی..... امی نے ابا سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ میں بھی اس ڈگر پر چل رہی تھی..... چلتے چلتے کتنے ہی برس بیت گئے اب تو بہادر بھی دس برس کا ہو گیا تھا۔ ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ وہ پیار کرنے والے باپ تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک روایتی مرد تھے جنہیں بیوی کے چونچلے اٹھانا پسند تھا، نہ بچے کے نخرے اٹھانا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنے ہی خاندان کے بڑے بڑے سورماؤں کو بیوی بچوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا۔ احمد کو گھر کے کاموں میں گھسنا..... بچے کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا قطعاً پسند نہیں تھا۔ میں نے بھی ان سے یہ توقع کبھی نہیں کی تھی۔ یہ سب کام کرنے کے لئے میں جو تھی۔ ان کا کام کما کر لانا تھا۔ ہماری ضروریات پوری کرنا

تھااور وہ یہ کام کر رہے تھے۔

کمائی احمد کی تھی اور سلیقہ میرا۔اس آمیزش نے میرے گھر کو مثالی بنا دیا تھا۔میرا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا جس کی معطر ہوائیں مجھے کہیں نکلنے ہی نہ دیتی تھیں۔محلے کی خواتین سے کہیں خوشی غمی میں ملاقات ہوتی تو وہ گلہ کرتیں۔بھئی بہادر کی امی کا کام تو ہم سب سے زیادہ ہے تبھی تو نظر نہیں آتیں۔میں ہنس کر ٹال دیتی۔میرے پاس سچ مچ وقت ہی نہیں تھا بلا مقصد اِدھر اُدھر پھرنے کا.....گھر کے کام فرصت ہی نہ دیتے تھے۔جب سے احمد کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی۔میں نے ان کے لیے پرہیزی کھانا بنانا شروع کر دیا تھا صبح دفتر جاتے ہوئے انہیں کھانا پیک کر کے دیتی تھی۔گھر کے ڈھیروں کام میری توجہ کے منتظر تھے۔بہادر کا سکول، ٹیوشن، یونیفارم۔یہ سب میری ذمہ داری تھی۔امی جب بھی کہتیں۔بہادر کی چھٹیوں میں کچھ دن آ کر میرے پاس رہ جاؤ، میں جھٹ کہتی.....نہیں امی میں تو گھر سے نکل ہی نہیں سکتی۔احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی..... ویسے بھی ڈھیروں کام ہیں۔تب امی بڑے فخریہ انداز میں احمد کو دیکھتیں، جیسے کہہ رہی ہوں.....دیکھا میں نے بیٹی کی کیسی تربیت کی ہے؟

بہادر کئی روز سے جیلانی پارک جانے کی ضد کر رہا تھا۔سکول والوں کے ٹرپ کے ساتھ وہ جب سے پارک کی سیر آیا تھا اسے تو جیسے خبط ہو گیا تھا آبشار دیکھنے کا..... ہر روز سکول سے آتے ہی وہ یہ ضِد کرتا۔میں احمد کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اسے ٹالتی آ رہی تھی۔میں جانتی تھی احمد صرف اتوار کو فارغ ہوتے ہیں اور میں یوں بھی انہیں کہنا نہیں چاہتی تھی کہ گھومنا پھرنا انہیں پسند نہیں۔مگر مجھے یہ بھی خبر تھی کہ بچے تفریح چاہتے ہیں۔ضِد بھی کرتے ہیں اور ان کی جائز ضد پوری نہ ہو تو وہ.....احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایک رات جب احمد گھر لوٹے تو میں حسبِ معمول جاگ رہی تھی۔میں نے انہیں کھانا گرم کر کے دیا اور چائے بنانے چل دی۔احمد کھانے کے فوراً بعد چائے ضرور پیتے تھے۔چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے میں نے کہا

''بہادر.....آپ کا انتظار کر کے ابھی سویا ہے۔''

''کیوں بھئی''.....آج ایسی کیا بات تھی۔وہ چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے بولے۔میں چپ رہی، شاید جملہ ترتیب دینے میں الجھ گئی تھی۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' مجھے چپ دیکھ کر احمد نے کہا۔

''نہیں.....بس وہ بہادر کئی دن سے ضد کر رہا ہے جیلانی پارک جانے کی۔ایک دفعہ کیا ہوا آیا.....اسے تو آبشار دیکھنے کی لت ہی پڑ گئی ہے۔میں نے آہستہ سے مسئلہ احمد کے سامنے رکھ دیا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے''اتوار کو تم کام ذرا جلدی نمٹا لینا۔ہو آئیں گے۔'' میں بے یقینی کی سی کیفیت میں انہیں دیکھنے لگی۔

میں خوش تھی اور حیران بھی۔

مجھے لگا.....غلطی سراسر میری تھی۔جو کبھی کچھ کہا نہیں.....کبھی کچھ مانگا نہیں.....شاید کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود تو کوئی شوق نہیں ہوتا.....مگر وہ دوسروں کی خواہش کو رد نہیں کرتے۔احمد ایسے ہی تھے اور یہ بات..... مجھے اتنے برسوں میں پتہ چلی تھی۔

احمد ٹکٹ خرید لائے تو ہم گیٹ کی طرح چل دیئے تبھی.....ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔
زہرہ.....اپنا نام سن کر حیرانی سے پلٹی۔میری آنکھوں میں جھلملیاں ہونے لگیں۔
وہ عذرا ہی تھی۔

اس نے مجھے پہچان لیا تھا.....ہم کتنے برسوں بعد ملے تھے۔میں نے احمد اور بہادر سے اس کا تعارف کرایا۔سرسری سلام دعا کے بعد احمد بہادر کو لے کر آبشار دکھانے چلے گئے اور میں عذرا کے ساتھ درختوں کے جُھنڈ میں گھرے سنگ مرمر کے بنچ پر بیٹھی۔کتنی دیر ہم ماضی کی ورق گردانی میں گم رہیں.....بہت سی باتیں کیں.....بچپن کے دن یاد کیے.....سکول کے قصے دہرائے.....اس دوران مجھے عذرا ویسی ہی خوبصورت دکھائی دی۔تروتازہ،شاداب،شگفتہ شگفتہ۔

تم بالکل نہیں بدلیں عذرا.....میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔اس نے ایک دلآویز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا.....بدلیں تو تم بھی نہیں زہرہ.....ویسی ہی دقیانوسی ہو،جیسی تھیں،وہی شرمیلا پن،وہی چادر کی بُکل.....ہاں البتہ ممتا کا نکھار آیا ہوا ہے۔میں نے اس کی بات سنی اَن سنی کر کے پھر پوچھا اچھا.....بتاؤ شادی کہاں ہوئی تمہاری؟ وہ ایک زوردار ہنسی ہنس دی۔مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا

''شادی اور میں؟ نہ بابا نہ.....میں ایسے جھنجھٹ.....نہیں پالتی۔''حیرت سے میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں.....''تو پھر یہ سج دھج؟.....یہ ٹھاٹ باٹ؟''.....میرا اشارہ اس کے قیمتی زیورات اور کپڑوں کی طرف تھا۔

''یہ سب میں نے شادی کر کے نہیں پایا زہرہ''.....وہ قدرے توقف سے بولی.....''شادی کر لیتی تو تمہاری طرح میں بھی چادر کی بُکل مارے،بچے کی انگلی پکڑے،دُبکی ہوئی کسی دقیانوسی مرد کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوتی۔تم تو جانتی ہو میرے حالات کو.....کیسا رشتہ آتا وہاں میرے لئے۔کسی مزدور کا کسی فیکٹری ورکر کا.....کتنا کما لیتا وہ؟ چار ہزار،پانچ ہزار یا پھر زیادہ سے زیادہ دس ہزار.....سب کچھ ویسا ہی رہتا زہرہ.....جیسا پہلے تھا اور میں ایسی ترسی ہوئی زندگی جینا نہیں چاہتی تھی۔''اس کی آواز میں عجیب سا درد تھا۔''تو پھر کیا تم نے ملازمت.....''میں نے پوچھنا چاہا مگر وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگی۔''نہیں زہرا میٹرک پاس کو ملازمت کون دیتا ہے.....بس یہ کہو میں نے جینے کا فن سیکھ لیا ہے۔''مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔''

مگر کیسے؟ میں نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا

تم جانتی ہو زہرا! سڑی بُسی،غربت زدہ زندگی مجھے کبھی پسند نہیں تھی۔میں اپنی زندگی،اپنے شوق پورے کر کے جینا چاہتی تھی.....سو ایک شارٹ کٹ لیا میں نے.....وہ عجیب پُراسرار لہجے میں بولی۔جس میں یاسیت تھی نہ شرمندگی۔

''یہ شارٹ کٹ میری زندگی کا چلن بدل گیا.....اور میں عذرا سے مس اَچی بن گئی۔''وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی اور.....میں حیرتوں میں غوطہ زن.....مس اَچی میں.....اس معصوم عذرا کو ڈھونڈ رہی تھی جو ضد پوری نہ ہونے پر پہروں رویا کرتی تھی۔

◆◆◆

افسانہ پھاڑ دو!

اسلم سحابؔ ہاشمی

زلیخا بی بی اپنے بوڑھے نوکر پیرو کے ساتھ مسلسل سات جمعراتیں مائی نوراں کے مزار پر اونٹ پر سوار ہو کر جاتی رہی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر ثمینہ ناز کا علاج بھی جاری رہا اور حکیم الٰہی بخش کی دیسی ادویات کا استعمال بھی ہوتا رہا..... رئیس غلام احمد نے ملک بھر کے تمام اولیاء عظام کی مزارات پر حاضری دی اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اولادِ نرینہ کی نعمت مانگتا رہا۔

اتنے جتن کرنے کے باوجود زلیخا بی بی کی گود جب ہری نہ ہو سکی تو رئیس غلام احمد نے دبے دبے لفظوں میں دوسری شادی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ ایک اولاد کی محرومی کا دکھ زلیخا کو دن رات بے حال کیے رکھتا تھا اور اب شوہر کی دوسری شادی کے ارادے نے تو گویا اس کی جان ہی نکال لی تھی۔ کئی دنوں تک اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی..... زبان سے قوتِ گویائی چھن گئی..... نظر جس جگہ ٹکتی وہیں مرکوز ہو کر رہ جاتی..... دل میں امید کا چراغ گل ہو گیا تھا اور دماغ گہری سوچوں میں کھویا رہتا..... گھر کے تمام معاملات سے بے نیاز، یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بے خبر ہو کر وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔ بیوی کی اس حالت کو دیکھ کر رئیس غلام احمد اپنی دوسری شادی کے ارادے پر پچھتاتا اور لگا بیوی کو اپنی وفاداریوں کی یقین دہانی کرانے۔ لیکن زلیخا بی بی کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ خزاں رسیدہ پھول کی سی کملاہٹ اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔

عجز و نیاز کا مجسمہ بن کر جب وہ مصلےٰ پر کھڑی ہوتی تو پوری پوری رات عبادت گزاری میں بسر ہو جاتی۔ پیروں پر وَرم آ جاتا۔ صبح کے وقت چند قدم چلنا محال ہو جاتا۔ خدا کے ساتھ لَو لگائے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔ شاید مقدر میں خدا نے اولاد کی نعمت نہیں لکھی تھی اس لیے ابھی تک مراد پوری نہ ہو سکی۔ لیکن زلیخا لاتقنطو..... کی آیت کو مدنظر رکھ کر ہر لمحے ربی ھب لی..... کا ورد جاری رکھتی۔

رمضان کا مہینہ ختم ہوا تو اس نے نفلی روزوں کو بھی اپنا معمول بنا لیا۔ ہر تیسرے دن وہ روزہ رکھنے لگی تھی۔ رئیس صاحب کی بیوی جھوک رئیس اعظم میں بذاتِ خود ایک اللہ لوک خاتون کے طور پر مشہور ہو گئی۔

قدرت والے کا عجب کھیل تھا کہ اس کی دعا کئی بے اولاد عورتوں کی گود ہری ہوئی۔ مگر اس کی اپنی جھولی، سات سال تک گلِ مراد سے خالی رہی۔ یہاں تک کہ اب تو وہی عورتیں جو اس کی دعاؤں سے صاحبِ اولاد ہوئیں تھیں، زلیخا بی بی کے لیے جھولیاں اٹھا اٹھا کر خدا سے رحم کی خیرات مانگتی تھیں۔ سات سال بعد نجانے کس کی دعا زلیخا کی کوکھ میں بہار کا پھول کھلا گئی۔ رئیس غلام احمد خدا تعالیٰ کے شکرانے ادا کرتے کرتے نہ تھکتا تھا۔ دیگیں چڑھائی گئیں..... ڈیرے پر کئی دنوں تک غربا میں کھانا تقسیم ہوتا رہا..... کوئی ضرورت مند محتاج آ کر جو بھی سوال کرتا اسے وہی ملتا تھا..... بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں اس نے خوب دریا دلی دکھائی..... اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی

تھی؟.....اسے اپنی جاگیر کا وارث مل گیا تھا.....ورنہ پگڑی کے رشتہ دار نجانے کب سے آس لگائے بیٹھے تھے.....یہ بے اولادی کا دکھ جلد ان کے سانحہ ارتحال کا سبب بنے.....تاکہ اتنی بڑی جاگیر کے حصے بخرے کیے جاسکیں.....لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا.....سب مٹھیاں بھینچے رہ گئے۔

دعاؤں، منتوں اور مرادوں سے تولد پذیر ہونے والا بچہ جو رئیس امیر خاں کے نام سے موسوم ہوا..... پیدائش کے وقت ہی کئی باندیوں کی گود کی زینت بن گیا۔ بچپن بھی ان کی قربت میں گزرا اور لڑکپن کی عمر کو پہنچا تو خدمت گاروں کی ایک بڑی فوج اس کی دیکھ بھال کرنے اور اس کے ناز اٹھانے کے لیے حاضر تھی۔ اس کی ہر خواہش پلک جھپک میں یوں پوری ہوتی جیسے تختِ بلقیس کو ایک جن نے آن کی آن میں لا پیش کیا تھا۔

ماں نے تو سچے رب کے ساتھ لو لگائی تھی۔ جس نے آدھی عمر خدا سے اولاد کی نعمت مانگنے میں صرف کر دی تھی اور اب باقی عمر اس ذاتِ پاک کے شکرانے ادا کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔ البتہ رئیس غلام احمد کو اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی ہر وقت فکر رہتی۔ اور بیٹا تھا کہ پڑھنے پڑھانے جیسے عمل سے کتراتا تھا بالکل اسی طرح باپ کے سائے سے بھی دور بھاگتا تھا۔ بس ہر وقت نوکروں کی دھاچوکڑی میں خوش رہتا۔

جیدے نے امیر خاں سے مخاطب ہو کر کہا: ''سائیں! سادہ سگریٹ تو بہت پیا ہے ذرا اس بھرے ہوئے سگریٹ کا مزا چکھو.....'' وہ مزا ایسا منہ کو لگا کہ بالآخر بات شراب نوشی تک جا پہنچی۔ اسی طرح بگو نے اسے ایک اور راہ دکھائی ''رئیس صاحب! خدا بخش کی چھوکری پر کیا ظالم جوانی آئی ہے.....'' مزارعے کی بیٹی تھی وہ تو گھڑے کی مچھلی تھی۔ آسانی سے اچک لی گئی۔ ایک دن خیرو نے آ کر امیر خاں کو یہ بتایا۔ ''آج کل بخشونائی کا بیٹا بڑے گریباں کھول کھول کر گلیوں میں گھومتا ہے.....'' بس اگلے دن سرِ راہ اس کی خوب ٹھکائی کر دی گئی تھی۔ جیسے جیسے امیر خاں کی عمر بڑھتی گئی.....ان مشاغل کی نوعیت بھی سنگین ہوتی گئی۔

باپ کے بار بار کہنے پر امیر خاں نے جیسے تیسے ایف اے پاس کر لیا تھا۔ اس کے بعد کچھ برس آوارہ سرگرمیوں کی نذر ہو گئے۔ پھر اچانک سیاست میں حصہ لینے کا جنوں طاری ہوا۔ بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے میں ایک شہری دوست ایم بی چشتی کی خدمات حاصل کی گئیں۔

''یار اگر اس جعلی ڈگری کی جانچ پڑتال ہو گئی۔ تو کیا ہو گا؟''

دوست نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''ایم بی چشتی جو کام کرتا ہے، پکا کرتا ہے۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں''

''اچھا اب سنا! مڈٹرم الیکشن ہونے کا کوئی امکان ہے یا نہیں''

''رئیس صاحب! کچھ کہا نہیں جا سکتا.....اپوزیشن کی بھی تو کچھ سمجھ نہیں آتی نا.....کبھی دوست.....تو کبھی دشمن''

''بس ہر کوئی اپنے اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہا ہے چشتی صاحب!''

''عوام کے مسائل حل کرنا، تو سیاست دانوں کا شروع سے مسئلہ ہی نہیں رہا.....اور انہی سیاست دانوں میں ایک اور سیاست دان کا اضافہ ہونے جا رہا ہے.....''

چشتی نے امیر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو جواباً امیر خاں نے ایک بھیانک قسم کا قہقہہ فضا میں بلند کیا۔ جس میں اس کے مستقبل کے ارادوں کی گونج شامل تھی۔

اب جھوک رئیس اعظم کا یہ چشم و چراغ اپنی شہر والی کوٹھی پر منتقل ہو گیا تھا۔ انتخابات کے ہونے میں ابھی ڈیڑھ سال کا عرصہ باقی تھا..... مختلف سیاسی شخصیات سے رابطے شروع کر دیئے گئے..... کسی ملک گیر شہرت رکھنے والی پارٹی سے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں..... بالآخر ایک عظیم پارٹی کے رہنما سے کسی طور ملاقات ہوئی..... ٹکٹ کی یقین دہانی کرائی گئی..... امیر خان خوش تھا۔ اسے ایسی پارٹی سے ٹکٹ ملنا تھا..... کہ جس کا ٹکٹ اگر کالے چور کو مل جائے تو اس کی فتح یقینی ہو جاتی تھی..... جو خود کو مستقبل کا ایم این اے تصور کرنے لگا تھا۔

دو کروڑ کی خطیر رقم خرچ کرنے پر ایم این اے کی سیٹ رئیس امیر خان کو حاصل ہو گئی تھی..... ''رئیس صاحب! اتنی بڑی رقم کے خرچ ہونے پر پریشان نہ ہوں..... یہ رقم تو پہلے ہی سال میں معہ منافع وصول ہو جائے گی.....''

مشیر خاص ایم بی چشتی نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ لیکن رئیس امیر خان فکر مند تھا کہنے لگا۔

''میری یہ رقم کہاں سے وصول ہو گی؟..... ہمیشہ قرض لے لے کر تو ہم یہ ملک چلاتے رہے ہیں.....''

''وہ قرض کون سا ملک پر خرچ ہوتا ہے؟'' ایم بی چشتی نے شاطرانہ انداز میں کہا ''ساری رقم آپ لوگوں کے ہاتھوں خرچ ہوتی ہے..... اسے عوام پر نہ خرچ کروا اپنے بنک بیلنس میں جمع کرا دو..... کون پوچھتا ہے یہاں؟..... یہ پاکستان ہے رئیس صاحب! یہاں سب کچھ چلتا ہے.....''

جواب میں رئیس امیر خاں کا ایک زوردار قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

پہلے سال کے بجٹ کے لیے غیر ملکی امداد وصول کرنے پچاس وزرا پر مشتمل شاہی قافلہ اپنے ملک سے دیارِ غیر روانہ ہوا۔ رئیس امیر خان بھی انہیں پچاس میں سے ایک تھا۔ واپسی پر اسے ڈھائی کروڑ روپے کی گرانٹ موصول ہوئی..... ''واہ ایم بی چشتی واہ! وِد پرافٹ والی بات ہنڈرڈ پرسنٹ درست نکلی.....''

جھوک رئیس اعظم کے لوگ ڈھائی کروڑ کی گرانٹ کا سن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ تصورات میں وہ گاؤں کی پختہ گلیاں..... رات میں بجلی کے قمقمے، گھر کے چولہوں میں گیس کی تیز آگ..... بچوں کی تعلیم کے لئے عالی شان سکول کی عمارت..... علاج معالجہ کے شفا خانہ۔ یہ سارے حسین خواب آنکھوں میں سجائے ایک سال بیت گیا۔ دوسری مرتبہ غیر ملکی امداد آئی تو ایک کروڑ پچھتر لاکھ کی گرانٹ رئیس امیر خان کو دی گئی۔ اب کی بار بھی جھوک رئیس اعظم کے لوگ محض خواب ہی دیکھتے رہ گئے۔

ترقیاتی کاموں کی عملی صورت کہیں دکھائی نہ دی تو رئیس غلام احمد نے ایک روز بیٹے سے دریافت کر ہی لیا..... بیٹا! ہر سال جو گرانٹ تجھے ملتی ہے، وہ کہاں خرچ ہوتی ہے؟..... لوگوں نے اپنے ووٹ دے کر تجھے یہ عزت بخشی ہے، کچھ ان کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کرو نا.....؟

''بابا سائیں! ان لوگوں نے..... مجھے ووٹ نہیں دیا..... میری پارٹی کو ووٹ دیا ہے..... میری پارٹی والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ٹکٹ اگر کسی کالے چور کو بھی دے دیں تو وہ جیت جائے گا.....'' باپ نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا ''تو کیا تم اپنے آپ کو ایک کالا چور

ثابت کرنا چاہتے ہو؟.....لوگوں نے جو تجھے ووٹ دیا ہے.....کیا ان کا کوئی احسان نہیں ہے ہم پر؟ یہ لوگ پچھلی کئی صدیوں سے ہماری اس جاگیر میں آباد ہیں..... باپ، دادا، پردادا سے یہ ہمارے خدمت گار چلے آرہے ہیں.....اب اگر خدا نے تمہیں ان کی خدمت کا موقع عطا فرمایا ہے.....تو یہ موقع کیوں ضائع کرتے ہو؟.....کیوں؟''

''بابا سائیں آپ کی یہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ اگر میں ان لوگوں کی خدمت میں پڑ جاؤں نا تو میرا یہ سارا ٹھاٹھ باٹھ، بنک بیلنس سب کچھ تباہ ہو جائے گا.....اور میں ایسا کسی صورت نہیں کر سکتا.....'' پھر اپنے باپ سے مخاطب ہو کر وہ بڑے فاتحانہ انداز میں کہنے لگا: میں نے دو سال کے اندر اندر جتنی دولت اکٹھی کر لی ہے، اتنی دولت آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی.....''

باپ نے بھڑک کر جواب دیا: ''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر''

اسی جوش کے ساتھ بیٹا بولا ''بابا سائیں آپ پرانے خیال کے بندے ہیں۔ اب سیاست تجارت بن گئی ہے۔ اور تجارت کی بنیاد زیادہ سے زیادہ پرافٹ پر ہوتی ہے۔'' زلیخا بی بی اپنے کمرے میں تسبیح کرنے میں مصروف تھی.....اور ہال کمرے میں باپ بیٹے کی اس تلخ کلامی سے اس کے وظیفے میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے اٹھی اور حویلی کے بڑے ہال میں آ کر چیخ چیخ کر کہنے لگی.....''تجھ پر خدا کی مار!.....کیا ہم نے تجھے خدا سے اسی لیے مانگا تھا.....کہ تو حرام کی دولت سمیٹ کر گھر میں لائے.....جا! آج کے بعد تیری کمائی سے ایک لقمہ بھی کھایا تو ہم پر حرام ہے.....'' پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا لی۔

تین دن تک دروازہ بند رہا۔ اس کے لیے کھانا لے کر نوکر، باندیاں اور خود رئیس غلام احمد بھی کھڑا تھا۔ سب زور زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے رہے اور وہ کمرے کے اندر سے یہی کہتی رہی ''لے جاؤ کھانا..... مجھے نہیں کھانا ہے..... میں روزے سے ہوں..... مجھے رزقِ حرام سے روزہ افطار نہیں کرنا..... یہ انگاروں کے لقمے اسی جہنمی سے کہو، وہ خود کھائے..... مجھے نہیں چاہیے ایسا کھانا.....'' ماں کا ایک ایک جملہ کسی تیز دھاری چھری کی طرف امیر خان کے دل کو کاٹ رہا ہے.....وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر نوکروں سے کہتا تھا.....''بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے..... لے جاؤ کھانا مر جانے دو اسے بھوکا..... یہ کفرانِ نعمت کر رہی ہے۔ اسے بھوکا مرنے دو۔ سگی ماں ہو کر بیٹے کی دشمن بن گئی ہے.....اس سے میری ترقی دیکھی نہیں جاتی..... یہ مر جائے تو اچھا ہے.....''

افسانے کے اختتام پر صدرِ مجلس نے افسانے پر تنقیدی گفتگو کرنے کے لئے شرکاء کو دعوت دی۔ ایک سینئر دانشور نے صدر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''جناب صدر! میں افسانہ نگار کو آپ کے توسط یہ مشورہ دوں گا کہ یہ افسانہ پھاڑ دو.....حاضرین میں سے کچھ چونکے.....اور کچھ ہنس پڑے.....دانشور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا..... جناب صدر!.....حسّاس اور باشعور معاشرے کے لوگ لفظوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں.....لیکن ہمارے ہاں صورت حال بالکل مختلف ہے..... یہاں اس افسانے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چڑیا اپنی چونچ میں پانی کی ایک بوند لے کر.....آسمان کو چھوتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی مضحکہ خیز کوشش کرے.....اس آگ کو بجھانے کے لئے افسانے کی نہیں، طوفانِ نوح کی ضرورت ہے جناب صدر! طوفانِ نوح کی.....''

افسانہ نگار نے افسانہ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

مجید امجد اکیڈمی کا ہفتہ وار اجلاس اختتام پذیر ہو گیا۔

◆◆◆

پنشن

جمیل حیات

صبح کے تین بجے تھے، جون کی پہلی تاریخ؛ حسبِ معمول بجلی گئی ہوئی تھی؛ بوڑھا کرم الہیٰ چارپائی سے نیچے اترا، جوتے تلاش کیے ، پاس سوئی ہوئی ثانیہ کو دیکھا اور گھر سے نکل آیا۔ پچھلے پانچ سال سے یہ اُس کا معمول تھا کہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اگر چھٹی نہ ہوتی تو پنشن لینے بنک جاتا تھا۔ وہ گاؤں میں رہتا تھا اور ایک دو بار صبح سات بجے شہر پہنچا تھا تو پنشنرز کی لمبی قطاریں دیکھ کر اُس نے توبہ کی تھی کہ اب دیر سے نہیں آنا اسی لیے اب وہ نماز بھی شہر جا کے ہی پڑھتا تھا۔ رات سے اس کی سات سالہ پوتی ثانیہ نے ضد لگائی ہوئی تھی کہ کہ اس بار دادو اسے بولنے والی گڑیا لے کے دیں۔ جب اس نے وعدہ کر لیا تب وہ سوئی تھی۔

کرم الہیٰ گھر سے نکلا اور گلیوں سے ہوتا ہوا کھیتوں میں گیا؛ ضروری حاجات سے فارغ ہو کر کنویں کے پاس آیا اور لوٹوں سے پانی نکال کے غسل کیا۔ گھر واپس آ کے بیوی کو جگایا اور ناشتہ کرنے کے بعد گاؤں کے بس سٹاپ پر پہنچا؛ تھوڑی دیر کے بعد اس کے تینوں دوست، فضل، خدا بخش اور عبداللہ بھی آ پہنچے اور پھر چاروں دوست شہر کی طرف پیدل روانہ ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ مرکزی ڈاکخانے کے پاس پہنچے؛ بنک پاس ہی تھا۔ کرم الہیٰ نے نماز ادا کرنے کے لیے ڈاکخانے کی مسجد کی طرف رخ کیا جب کہ باقی تینوں دوست بنک کی طرف چلے گئے۔

نماز ادا کرنے کے بعد کرم الہیٰ جب بنک کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خلافِ معمول آج پنشنرز کی کثیر تعداد پہلے سے موجود تھی۔ وہ بھی لائین میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی چھ بجے تھے جب کہ بنک نو بجے کھلتا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور گرمی کی شدت میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ جب بنک کھلا تو اس وقت ایک تو لمبی لائین تھی جو بنک کی کھڑکی سے شروع ہوتی ہوئی سیدھی سڑک تک آتی ہوئی سامنے محکمہ تعلیم کے دفاتر تک آتی تھی جب کہ ایک اور لائین بھی تھی جو کھڑکی سے شروع ہوئی تھی اور اب وہ لوگ جو دیر سے آئے تھے اس لائین میں گھستے چلے جا رہے تھے۔

ایک کھڑکی سے سلپ بنوا کے پھر دوسری کھڑکی میں کیش کے لیے جانا پڑتا تھا اور آج پتہ نہیں کیا بات تھی کہ کام کی رفتار بہت سست تھی گیارہ بج رہے تھے اور ابھی صرف دس بارہ بندے کم ہوئے تھے، کرم الہیٰ کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن یہاں کھڑے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ بنک کی کھڑکی کے ساتھ چونکہ برآمدہ بھی تھا اس لیے وہاں پنکھا لگا ہوا تھا درمیان میں جگہ خالی تھی اور پھر دو بڑے درخت تھے جن کے سائے تلے کرسیاں اور دو بنچ لگے ہوئے تھے۔ لائین میں موجود لوگ جب وہاں تک پہنچتے تو بنچوں یا کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔

بارہ بجے کہیں جا کر کرم الہیٰ نے سلپ بنوائی اور پھر لائین میں لگ گیا۔اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں؛اس نے کئی بار سوچا کہ گھر چلا جائے پھر کسی دن آ کے لے جائے، پھر ثانیہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔وہ معصوم سی بچی کتنے دنوں سے گڑیا کی فرمائش کر رہی تھی۔وہ پھر سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر وہیں کھڑا رہا۔پھر جب بات اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے اپنے پیچھے کھڑے آدمی سے درخواست کی کہ اس کی جگہ رکھے وہ پانی پی کے آتا ہے۔پاس ہی ٹھنڈے پانی کا بجلی سے چلنے والا کولر لگا ہوا تھا۔اس نے گلاس کو پکڑ کے جب بٹن دبایا تو پانی تھوڑا تھوڑا برآمد ہوا؛ خیر جب اس نے پینے کے لیے گلاس منہ سے لگایا تو ایک گھونٹ ہی بھر سکا پھر اس نے گلاس رکھ دیا۔پانی بہت گرم تھا۔وہ پھر آ کے لائین میں کھڑا ہو گیا۔

دن کے دو بجے تھے، کرم الہیٰ کا سر چکرا رہا تھا؛ تاہم وہ ضبط کیے کھڑا تھا۔درختوں اور برآمدے کے ساتھ والی جگہ جہاں اس وقت دھوپ تھی خالی تھی۔جو کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھے تھے، مارے نقاہت کے ان کا اٹھنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔کئی بار پیچھے لائین میں موجود لوگوں نے ان کو کہا کہ آگے بڑھ جائیں لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔اسی دوران چار پانچ لوگ جو پیچھے کہیں کھڑے تھے اس خالی جگہ پر جا کے کھڑے ہو گئے۔کرسیوں پر بیٹھے کسی سیانے کی نظر پڑ گئی اور اس نے شور مچا دیا؛ سارے لوگ کرسیوں اور بنچوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر وہ شور مچا کہ الاماں!

بوڑھوں نے اپنی جگہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دینا شروع کر دیا۔اس وقت کرم الہیٰ سے آگے تین بندے تھے جب پیچھے سے ایک زبردست انسانی ریلا آیا اور کرم الہیٰ کے پاؤں نے زمین کو چھوڑ دیا۔تھوڑی دیر بعد جب ہڑبونگ ختم ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی زمین پر تڑپ رہا تھا؛ صاف لگ رہا تھا کہ اس کے سانس گنے جا چکے تھے۔کسی نے 1122 کو تو کسی نے میڈیا والوں کو کال کر دی۔جب تک طبی عملہ پہنچتا، کرم الہیٰ تمام پریشانیوں کو یہیں چھوڑ کر عدم کو سدھار چکا تھا۔ایک شور مچ گیا۔کسی نے بنک کی کھڑکی کی طرف پہلا پتھر پھینکا اور پھر پتھراؤ شروع ہو گیا۔

شام کو ایک نجی ٹی وی چینل کی رپورٹر کرم الہیٰ کی پوتی سے انٹرویو لے رہی تھی جو روتے ہوئے کہہ رہی تھی:"دادو! میں گڑیا نہیں لیتی، دادو! اٹھ جاؤ نا، میں گڑیا نہیں لیتی دادو !" سات سالہ ثانیہ بلک بلک کے رو رہی تھی؛ دوسری طرف جغادری رپورٹر حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کر رہی تھی؛ تیسری طرف ملک کے حساس اور ہمدرد وزیرِ اعظم نے تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دے دی تھی کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا؟ اور کرم الہیٰ کے اہلِ خانہ کو پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔

◆◆◆

خوشخبری

محترمہ **عمرانہ مشتاق صاحبہ** اور پروفیسر **نبیل احمد نبیل** نے حال ہی میں پی ایچ۔ڈی (PH.D) کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ماہنامہ ''تخلیق'' کے تمام قارئین کی طرف سے اِن دونوں کو مبارک باد۔ (ادارہ ''تخلیق'')

Good Old Days

(کتنے اچھے تھے دن)

پنجابی تحریر: اظہر جاوید

ترجمہ : حنیف باوا

میں ساٹھ برس کا ہو گیا ہوں۔

لیکن کبھی کبھی ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں ابھی بھی آٹھ سال کا بچہ ہوں، محرومیوں کا مارا اور پیار کے لئے ترستا ہوا بچہ میں ایسے ہی بات بات پر رو پڑتا ہوں..... کسی نے ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچے کا قصہ سنایا، یا والدین کی آپس کی لڑائی میں پسنے والے بچوں کا ذکر آئے تو میں زار و قطار رونے لگتا ہوں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ میری ہی کہانی ہو یا پھر میری محرومیاں بار بار کسی نہ کسی شکل میں میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

شائد پیدا ہوتے وقت انسان کی سائیکی میں قدرے فرق آ جاتا ہے۔ گھٹی کی تاثیر ہوتی ہے یا ستاروں کی گردش کا اثر ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں سمندر بھرے ہوتے ہیں اور وہ اندر ہی اندر اس سمندر میں رہنے کی سعی کرتے ہیں۔ میں جب چھوٹا سا تھا تب بھی میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ نہیں، ایسے نہیں..... میں بات کو ذرا نتار کر بیان کرنا چاہتا ہوں..... ویسے تو میں بڑا خوش باش اور خوبصورت بچہ ہوتا تھا۔ میری خالاؤں کی سہیلیاں اور میرے ماماؤں کے یار بیلی میرے ساتھ بڑی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ مجھ سے انگریزی کی چھوٹی چھوٹی نظمیں سنتے تھے۔ اور مجھے کھانے پینے کے لئے بہت کچھ دیتے تھے..... لیکن بچوں میں کبھی مقابلے بازی کی کوئی بات ہوتی اور میری طرف کوئی بھی توجہ نہ دیتا تو میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ میاں محمد صاحب نے کیا خوبصورت بات کہی ہے.....

لِسّے دا کیہہ زور محمد، یا نَسّ پینا یا رونا

مجھے یاد ہے..... میں اور میرا بڑا بھائی دونوں ماں کے ساتھ پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے۔ ماں ہمیشہ میرے بڑے بھائی سے پیار کرتی تھی..... کیوں.....؟ اس کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے رونے والی بات سن لیں..... ماں کسی جگہ کا پتا پوچھ رہی تھی یا پھر کوئی ویسے ہی بات ہو رہی تھی۔ میرا بڑا بھائی جو مجھ سے صرف اڑھائی تین سال بڑا تھا کہنے لگا۔ ''اُدھر سے جاتیں تو دائیں جانب مُڑتے وقت ادھر ایک راستہ جاتا ہے۔'' میں اس وقت سات آٹھ سال کا ہوں گا اور میرے بڑے بھائی کی عمر اس سے دس گیارہ برس کی ہو گی۔ ہم دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور ماں ہنستے ہوئے بھائی کی بات پر توجہ دے رہی تھی۔ میں یک لخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے آج بھی

یاد ہے اُس وقت میری ماں کی نانی جو میری پڑنانی تھی، آئی۔ اس نے آتے ہی میری ماں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ''کیوں بیچارے کو رلا رہی ہو'' اور مجھے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا۔

یہ باتیں یاد کر کے میں پھر رونے لگ پڑا ہوں..... آنسو اور قلم کو ایک ہی وقت میں سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ بھلے اب میں عمر رسیدہ ہوں۔ اللہ نے مجھے نو سے نواسیوں اور پوتے پوتیوں سے نوازا ہوا ہے۔ لیکن میرے اندر کا سسکتا اور بلکتا ہوا بچہ ابھی نہیں مرا اور آنکھوں کے سمندر ابھی نہیں سوکھے۔

مجھے نہیں معلوم، میں اُس وقت تین سال کا تھا جب یہ واقعہ ہوا۔ میرے ماں باپ آپس میں روٹھے ہوئے تھے۔ میری ماں ہم دونوں بھائیوں کو لے کر ہمارے باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے والد کے ہاں چلی گئی۔ مرنے تک نہ دونوں میں طلاق کا مرحلہ آیا اور نہ ہی کبھی ان کا آپس میں ملاپ ہوا۔ دونوں جانب کے بڑے گھروں کی آنکھ نے دونسلوں کو بربادی کے کنارے تک پہنچا دیا۔ میرے ننھیال والوں کا کہنا تھا۔ کہ دادا کے گھر کوئی بندہ آئے تو بچوں اور ان کی ماں کو لے جائے..... میرے دادا کے اس بات پر اڑے ہوئے تھے، کہ وہ خود گئی تھی اور خود ہی واپس آ جائے۔ ہم نے کون سے اس کے لیے گھر کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

دروازے بند ہوئے یا نہ ہوئے۔ لیکن میرے جیسے شخص کے لئے سوچوں کے پٹ کھل گئے تھے۔ میری ماں کو بڑے بیٹے سے زیادہ پیار تھا۔ اس بات کا مجھے ہوش سنبھالنے پر پتا چلا۔ اور میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ میرے بھائی کی شکل ہو بہو میرے والد سے ملتی تھی۔ یہ بات مجھ پر اس وقت کھلی جب میں نے اپنے والد کی تصویر دیکھی۔ بیس اکیس برس کا ہونے پر میں اپنے والد کو ملا تھا۔ جوانی کے دنوں میں میں اس بات پر تلملا اٹھتا تھا۔ اور اب جب میں بہت دنیا دیکھ چکا ہوں اور میں نے کافی عمر گزار بھی لی ہے تو مجھے اپنی ماں کی مجبوری اور اس کے جذبوں سے آگاہی ہوئی ہے۔

میری ماں کی کل پونجی ایک جستی ٹرنک اور ایک الماری پر مشتمل تھی۔ الماری کتابوں سے بھری رہتی اور ٹرنک میں اکا دکا کپڑے ہوتے تھے۔ اس نے نہ تو کبھی الماری کو تالا لگایا تھا اور نہ ہی کبھی ٹرنک کو..... میں جب دسویں جماعت میں تھا تو اماں کی الماری کی تمام کتابوں کے مطالعہ کے بعد مجھے زندگی کی تھوڑی بہت شُد بُد ہو گئی تھی۔ گھر کے پچھلے کمرے میں ماں کا ٹرنک پڑا ہوتا تھا۔ ایک روز اس کمرے میں میرا جانا ہوا تو ماں ایک تصویر کو لگاتار دیکھے جا رہی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

وہ تصویر میرے باپ کی تھی..... میں نے آگے بڑھ کر ماں کی گردن کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کا منہ چوم لیا..... ماں نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور تصویر کو واپس ٹرنک میں رکھ دیا۔ تصویر کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ good old days آج جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو میں زار و قطار رونے لگ پڑتا ہوں۔ اپنی بیچارگی پر نہیں اپنی ماں کی مجبوری اور محرومی پر وہ جوانی، بھرپور جوانی، میں اپنے گھر اور گھر والے سے الگ ہو گئی تھی یا کر دی گئی تھی۔ میری ماں انتہا کی خوبصورت تھی۔ خاندان میں تو کیا پوری برادری میں اُس کی خوبصورتی کی دھوم تھی۔ میرا باپ ولایت سے پڑھ کر آیا تھا۔ اور بہت بڑا افسر تھا۔ نوکر چاکر، بنگلا اور ساری آسائشیں میسّر تھیں..... لیکن میری ماں اب تو وہ اپنے والدین کے گھر کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی پر معمور تھی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو ننھیال کی محتاجی سے بچائے رکھنے کے جتن کرتی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ ٹرنک کھول کر تصویر کو ایک نظر دیکھ لیتی۔ یا پھر آتے جاتے اپنے بڑے بیٹے کی شکل میں میرے باپ کا عکس دیکھ کر اس پر صدقے واری ہو ہو جاتی۔

میری خالائیں یا گھر میں کام کرنے والیاں اس بات کو جتانے کی کوشش کرتیں تو وہ ہنس دیتی تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے ماں سے کبھی یہ شکایت نہ کی۔ اور وہ بڑے پیار سے کہتی۔ پتر وتم دونوں میری دو آنکھیں ہو، ایک دائیں اور ایک بائیں آنکھ۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ایک آنکھ سے زیادہ دیکھوں.....'' میرے ماموں کی شادی تھی۔ بری تکمیل اور دیگر تکلّفات کے بعد کھانا کھاتے ہوئے میری ماں کو تڑپا دینے والے درد نے ایسا اپنی آغوش میں لیا کہ تمام لوگ پریشان ہو گئے۔ بڑی تگ و دو کے بعد ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ میں سائیکل پر دور دراز سے دوا لے کر آیا اور ماں کے پاؤں کی جانب بیٹھ گیا..... بڑا بھائی رات کے گیارہ بارہ بجے کے قریب آیا۔ ہم تمام لوگوں نے اسے ماں کی تکلیف کے بارے میں آگاہ کیا..... وہ کچھ دیر تو ماں کے پاس بیٹھا۔ پھر اُس نے کھانا کھایا اور سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے تمام رات جاگتے ہوئے ماں کے پاؤں میں بیٹھ کر گزار دی۔ صبح سویرے جب کام کرنے والی صغرا اٹھی تو میرے پاس آ کر سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ ''آپ تمام رات نہیں سوئے۔؟ میں صدقے جاؤں۔ جا کر آرام کریں..... باجی کی دیکھ بھال میں خود کرلوں گی''۔

دو تین روز کے بعد جب میری ماں تندرست ہو گئی تو صغرا نے کہا ''باجی..... میں نے ہمیشہ دیکھا ہے..... آپ نے سدا بڑے صاحب کی تعریف کی اور پیار بھی زیادہ انھیں سے کیا..... لیکن آپ کو معلوم ہے۔ اس رات، بڑے صاحب آئے۔ پل بھر کے لئے آپ کو دیکھا، پھر کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چھوٹے صاحب کو سحری کے وقت میں نے بڑی مشکلوں سے آرام کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ انھوں نے تو آپ کے پاؤں میں بیٹھ کر تمام رات بتا دی تھی۔'' اس وقت میری ماں نے مجھے جس طرح دیکھا تھا اور اُن کی آنکھوں میں جو پیار تھا اسے جب میں یاد کرتا ہوں تو رو دیتا ہوں۔ چلیں۔ پھر کیا ہوا اگر ماں بڑے بیٹے سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ کرتی رہتی لیکن ہمارے سروں پر چھاؤں تو کئے رکھتی۔

یہ تمام باتیں یاد آنے پر ایک ساٹھ سالہ شخص بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب کچھ ایک اخباری خبر پڑھ کر ہوا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ سردیوں کی چھٹیوں کے پیش نظر عدالتیں بند ہو گئی ہیں۔ ماں باپ کے مابین طلاق کے جھگڑوں کے اور بچوں کے لینے اور نہ لینے کے مسئلوں کے بارے میں مقدمے ادھورے رہ گئے ہیں۔ چھٹیوں کے بعد عدالتیں کھلیں گی تو پھر فیصلے ہوں گے کہ کس بچے نے باپ کے پاس رہنا ہے اور کس نے ماں کے ساتھ جانا ہے..... خبر لکھنے والے نے خبر کو بڑے درد بھرے انداز سے لکھا تھا کہ جب عدالتیں بند ہوئیں اور چھوٹے چھوٹے بچے چیخ رہے تھے اور رو رو کر کہہ رہے تھے..... ابو جی..... پھر کب ملیں گے..... امی جی..... مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں.....!''

خبر کو پڑھے ہوئے دو تین روز ہو گئے ہیں اور میں اسی روز سے اب تک روئے چلا جا رہا ہوں اور سوچ میں پڑا ہوا ہوں کہ یہ اور ان جیسے اور کتنے بچے میری طرح محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی سائیکی گڑبڑا جاتی ہے اور ان کی آنکھوں میں سمندر ٹھکانا کر جاتے ہیں۔ وہ آٹھ سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک بات بات پر روتے ہی رہیں گے اور تمام زندگی یہی سوچتے رہیں گے کہ ان کے حصے کا پیار کوئی اور لے گیا ہے۔

میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ ان میں سے کسی کی ماں کے ٹرنک میں کوئی تصویر تو ہو گی جس کے عقب یہ لکھا ہو گا۔

''گڈ اولڈ ڈیز Good old days''۔

◆◆◆

غزلیں

سیّد مشکور حسین یاؔد

O

خود کو ہم اس طرح بھی کھو دیں گے
اجنبی آسماں میں بو دیں گے

دینے پر آئیں گے تو پھر پیارے
ایک کے بدلے پورے سو دیں گے

ہم نئے پن کے ہیں بہت قائل
جو بھی دینا ہے نو بہ نو دیں گے

مطمئن رہیئے پاس ہے جو بھی
آپ کو صرف آپ کو دیں گے

یہ ہماری غذائے خاص ہے یاؔد
ہم نہ گندم کے بدلے جو دیں گے

OOO

ناصؔر زیدی

O

زمیں بچھائی گئی آسماں بچھایا گیا
ہمارے واسطے سارا جہاں بچھایا گیا

دِلوں میں دل ہے نمایاں بس ایک دل اپنا
ہر ایک سمت جِسے بے گماں بچھایا گیا

زمیں کا فرش ہے انساں کی رفعتوں کی دلیل
برائے چارۂ بے چارگاں بچھایا گیا

فلک پہ چاند ستاروں کو ٹانکنے کے لئے
مہ و نجوم کا اک کارواں بچھایا گیا

تمام رنگ ہیں قوس و قزح کے زیرِ نگیں
بنا کے اِن سے رہِ کہکشاں بچھایا گیا

شعورِ شعر ہے پروردگار کی سوغات
اسی حوالے سے یہ بے نشاں بچھایا گیا

سمندروں میں رَواں کشتیاں ہوئیں ناصؔر
برائے عُمرِ رواں خاک داں بچھایا گیا

OOO

کنول فیروز

O

جن سے اک عمر سے یارانے ہیں
بات مشکل سے میری مانے ہیں

بند آنکھیں ہوں تو سپنے دیکھیں
یہ جو کھل جائیں تو میخانے ہیں

نہ کوئی بات نہ قصہ کوئی
ایسا لگتا ہے وہ بیگانے ہیں

زندگی ہم کو کہاں لے آئی
بے شجر شہر میں ویرانے ہیں

اپنا ایمان بچائیں کیسے
جس طرف دیکھئے بُت خانے ہیں

مَیں نے اک بار محبت کی تھی
کُو بہ کُو میرے ہی افسانے ہیں

ہر طرف شہرِ خموشاں ہے کنولؔ
بارگاہیں ہیں، عزا خانے ہیں

OOO

حفیظ انجم نگری (انڈیا)

O

روح میری جب نِکل کر رہ گئی
ہر تمنّا ہاتھ مل کر رہ گئی!

ساتھ تھیں ماں کی دعائیں اس لئے
ہر مصیبت میری ٹل کر رہ گئی

شہر سے وہ گاؤں جا کر بس گیا
گاؤں کی صورت بدل کر رہ گئی

جو ہوا اچھا ہوا، کیونکر ہوا!
برف نفرت کی پگھل کر رہ گئی

خواب میں جو اک نظر دیکھا انہیں
کیفیّت اپنی بدل کر رہ گئی

جب سے دُنیا تج دی ہم نے دوستو
ہر ضرورت ہاتھ مَل کر رہ گئی

اتنا کہنا تھا وضو کر لیجئے!!
بات میری سب کو کھل کر رہ گئی

جب بھی لاٹھی چل پڑی اللہ کی!!
ایکڑی ساری نِکل کر رہ گئی!!

آپ انجم آ گئے، اچھا ہوا
کچھ طبیعت بھی بہل کر رہ گئی

OOO

شاہین (کینیڈا)

O

اُٹھا کے آپ ہی طوفاں درود پڑھتی ہے
جنم جلی! تجھے کچے گھڑے کی چڑھتی ہے

نہ آنکھ ہی میں ہے آنسو نہ خاکِ دل ہے نم
یہ بیل سوکھتی رہتی ہے اور بڑھتی ہے

اترنے لگتے ہیں کچھ بد قماش سائے بھی
جن آنگنوں میں دُعا بن کے دھوپ چڑھتی ہے

وہ آنکھ جان کے بھی ہے مرا مخاطب کون
غزل غزل مجھے بین السطور پڑھتی ہے

اجل ہے پاس کھڑی جس کو ٹالنے کے لئے
فسانے آج بھی ہر شہرزاد گڑھتی ہے

ہوا نہیں جو ابھی تک وہی نہیں سب کچھ
کبھی کبھی تو ندی بے حساب چڑھتی ہے

مری کڑھن تو ہے شاہینؔ میری اک اُفتاد
غلافِ کہنہ یہ دنیا فضول مڑھتی ہے

OOO

شارترابی

O

جو مقابل ہے وہ زنجیر بدل سکتی ہے
زندگی خواب کی تعبیر بدل سکتی ہے

کس لیے رانجھے کا کردار بدل سکتا نہیں
آج کے دور میں جب ہیر بدل سکتی ہے

اور سے اور اُٹھا سکتے ہیں دیوار و در
اور سے اور بھی تعمیر بدل سکتی ہے

اس کے قبضے میں زمانے کی ہے گردش ساری
وقت کے پھیر میں تقدیر بدل سکتی ہے

لاکھ تو شیریں سخن ہو، شعر ادا کرتے ہوئے
تیرے لہجے کی بھی تاثیر بدل سکتی ہے

اب بھی تاریخ کے اوراق ہیں شاہد اس کے
فیصلہ آج بھی شمشیر بدل سکتی ہے

تیرے جیسا تو زمانے میں نہیں ہے کوئی
کیسے تصویر سے تصویر بدل سکتی ہے

OOO

گوہر کریم نگری (انڈیا)

O

بہار کر کے جو سولہ سنگھار رقص میں ہے
جُنوں کا پیرہنِ تار تار رقص میں ہے

مِری نگاہ کا سارا حصار رقص میں ہے
میں دار پر ہوں مِرا اعتبار رقص میں ہے

پیالہ رقص کُناں ہے خُمار رقص میں ہے
قدومِ ساقی پہ ہر بادہ خوار رقص میں ہے

فلک کو معترفِ عظمتِ زمیں پا کر
زمیں کی فطرتِ بے اختیار رقص میں ہے

مِلی اُسی کو جو کشکولِ دل بڑھا کے لیا
ازل سے رحمتِ پروردگار رقص میں ہے

نظر میں نُور تو دل میں سُرور ہے رقصاں
تو آ رہا ہے، مِرا انتظار رقص میں ہے

ہُنر جبیں پہ لئے اپنے اپنے خالق کا
وفورِ شوق میں ہر شاہکار رقص میں ہے

ہے جس کے زیرِ اثر آج بے ضمیر بشر
مدارِ گردشِ لیل و نہار رقص میں ہے

نگاہِ بحرِ تلاطم سے دور اے گوہرؔ
ہر ایک موج لبِ جوئے بار رقص میں ہے

OOO

ارمان نجمی (انڈیا)

O

کچھ نہیں کرنے کا احساس دلاتے ہوئے دن
دیکھتا رہتا ہوں میں ہاتھ سے جاتے ہوئے دن

برف باری کی دعا مانگ رہا ہوں کب سے
سرد ہوتے ہی نہیں آگ لگائے ہوئے دن

قریہ، جاں میں عمل داری ہے سنّاٹوں کی
کھو گئے جانے کہاں شور مچاتے ہوئے دن

دن گزرتے ہی بدل جاتی ہے رنگت ان کی
ایک جیسے نہیں، آتے ہوئے جاتے ہوئے دن

دور ہی دور کا رشتہ ہے ابھی تک ان سے
ہاتھ آتے نہیں آواز لگاتے ہوئے دن

کٹ گئے اس کی رفاقت میں نہ جانے کیسے
دھوپ کے دشت میں وہ چھاؤں بچھاتے ہوئے دن

گم ہوئے ان کی حقیقت کے سبھی نقش و نگار
بہتے پانی پہ تھے تصویر بناتے ہوئے دن

اشک آلودہ شبوں سے ہے مگر کام ابھی
میں نے دیکھے ہیں بہت ہنستے ہنساتے ہوئے دن

ایک اک کر کے بجھے عظمتِ رفتہ کے چراغ
خندہ زن مجھ پہ ہیں اندھیر مچاتے ہوئے دن

OOO

ابصار عبدالعلی

O

پریم ناگ کا ہر دَے ڈسنا اچھا لگتا ہے
وِش کنُیا میں جینا بسنا اچھا لگتا ہے

سُر اَبرو، مدھ بینا آنکھیں، لب بنسی کے بول
اپنوں میں تم جیسا اپنا، اچھا لگتا ہے

آنکھیں غنچے، باہیں آنگن، لب لالہ کے پھول
ہار تری باہوں کا پہنا اچھا لگتا ہے

سورج بِندیا، بارش پائل اور دھنک دوپٹہ
کیا اِن سے بھی تم کو سجنا اچھا لگتا ہے

ہوا مُلائم، سُرمہ بادل، ہری سجیلی دوُب
منظر کا یہ زیور گہنا اچھا لگتا ہے

مجھ سے ہیر کہانی سن کر تم سے مِل کر لوٹا
بچے کے لہجے میں رانجھنا اچھا لگتا ہے

برہا آنگن یاد تری جب ساون سیڑھی اُترے
پریت پُھوار میں بھیگے رہنا اچھا لگتا ہے

OOO

محمد ممتاز راشد (دوحہ۔قطر)

O

وہاں رونقیں ہیں، وہاں زندگی ہے
جہاں اہلِ دل میں وفا پَل رہی ہے

شبِ تار بھی اُس نگر کی بھلی ہے
محبت جہاں روشنی دے رہی ہے

نوید اُس کو شاید کوئی مِل گئی ہے
سُکوں سے وہ زُلفیں بکھیرے پڑی ہے

وہ گڑیا ہماری عجب چُلبلی ہے
شرارت کی پُڑیا ہے اک پھلجھڑی ہے

وہی میرا محور، وہی میری منزل
یہ جس کا نگر ہے، یہ جس کی گلی ہے

مجھے یاد رہتی نہیں اپنی ہستی
تِری یاد اتنا ستانے لگی ہے

دلوں پر چلائے ہیں نشتر اُسی نے
ابھی سامنے سے جو آفت گئی ہے

محبت میں کیا شکوۂ کج ادائی
محبت تو قربانیاں مانگتی ہے

کوئی حیلہ ڈھونڈوں بھٹکنے کا راشدؔ
سُنا ہے کہ منزل قریب آ گئی ہے

OOO

کرامت بخاری

O

دہکتی خواہشوں میں جل رہا ہوں
کبھی قاتل کبھی مقتل رہا ہوں

مرا پیچھا نہ کر اے زندگانی
میں راہِ رفتگاں پر چل رہا ہوں

میں ایسا اژدہا ہوں خواہشوں کا
خود اپنا خون پی کر پل رہا ہوں

رہا ہوں واقفِ رازِ حقیقت
بظاہر بے خبر پاگل رہا ہوں

ہوا پورا نہ تیرا کل کا وعدہ
میں جس کے واسطے بے کل رہا ہوں

گواہی کے لیے کافی رہے گا
خود اپنا خون مُنہ پہ مل رہا ہوں

روائے تشنگی اوڑھے ہوئے ہوں
سمندر کے کنارے چل رہا ہوں

مسلسل اشک جاری ہیں کرامتؔ
کسی کی یاد میں جل تھل رہا ہوں

OOO

اسد بیگ

O

جب سفر کا خیال گزرا ہے
اپنے گھر کا خیال گزرا ہے

پھر پرندے فضا میں اُڑتے ہیں
پھر شجر کا خیال گزرا ہے

تیرے آنگن کی رات ہے باقی
تیرے در کا خیال گزرا ہے

جس میں آباد ہیں تمنّائیں
اُس نگر کا خیال گزرا ہے

وہ فقیری کرے گا کیا جس میں
مال و زر کا خیال گزرا ہے

بستیوں میں نہیں سکوں کوئی
جب سے ڈر کا خیال گزرا ہے

کیوں پڑا ہے اسدؔ خیالوں میں
چل جدھر کا خیال گزرا ہے

OOO

امتیاز کاظمی

O

سب کے پاس یہ آتی ہے
دنیا بے ثباتی ہے

ہم مٹی سے کھاتے ہیں
مٹی ہم کو کھاتی ہے

بندہ ہے یہ گھاٹے میں
عِزت آتی جاتی ہے

پھولوں کے اندر ہے تُو
خوشبو یہ بتلاتی ہے

شب کو روتا رہتا ہوں
اُس کی یاد ستاتی ہے

ڈھونڈ رہی ہے ساتھی کو
کونج کہیں کُرلاتی ہے

فکرِ فردا بھی کچھ کر
بجھنے کو یہ باتی ہے

OOO

ریاض ندیم نیازی

O

بھیدوں بھرا یہ شہر طلسمی اثر میں تھا
سب لوگ تھے رُکے ہوئے رستہ سفر میں تھا
وہ خوف و اضطراب جو ہر اک نظر میں تھا
جیسے چھپا ہُوا کوئی آسیب گھر میں تھا
گر دیکھنا ہی تھا تو پسِ چشمِ دیکھنا
اِک عکسِ آرزو جو مِری چشمِ تر میں تھا
لٹکایا جا رہا تھا ہُنر کو صلیب پر
کھویا ہُوا یہ شہر فریبِ نظر میں تھا
جتنا سُرور و کیف ہُنر سے مِلا مجھے
اتنا سکونِ قلب کہاں مال و زر میں تھا
سڑکوں پہ پھر رہی تھیں لہو رنگ وحشتیں
ہر شخص وقتِ شام سے ہی قید گھر میں تھا
جھکتا نہیں تھا یہ کسی ظالم کے سامنے
سودا کسی کے عشق کا جب میرے سر میں تھا
جس کی ہر ایک بات ہی ثابت ہوئی تھی سچ
وہ شخص بھی تو حلقۂ نامعتبر میں تھا
کرتا رہا جو تیز ہَوا سے مقابلہ
کتنا ندیمؔ جوش چراغِ سحر میں تھا

OOO

رشیدہ عیاں (امریکہ)

O

جب جب راتیں اپنا آنچل کھولنے لگتی ہیں
کیوں پلکیں اشکوں کے موتی رولنے لگتی ہیں

یوں تو ساری زیست ہے جیسے اک جنگل سنسان
تنہا رات میں یاد کی چڑیاں بولنے لگتی ہیں

نومیدی کے غار میں جب دل گرنے لگتا ہے
آرزوئیں کیوں اپنی باہیں کھولنے لگتی ہیں

جب تنہا ہوتی ہوں، کوئی ساتھ نہیں ہوتا
مٹّی گارے کی دیواریں بولنے لگتی ہیں

دل کہتا ہے ان کا نام ہتھیلی پر لکھواؤں
سکھیاں ہنس ہنس کر جب مہندی گھولنے لگتی ہیں

میں تو عیاںؔ ان کی محفل میں چپ ہی رہتی ہوں
اُٹھتی گرتی پلکیں جذبے تولنے لگتی ہیں

OOO

محمد نصیر ہمایوں (امریکہ)

O

اُتر گیا تنِ نازک سے پتیوں کا لباس
کسی کے ہاتھ نہ آئی مگر گلاب کی باس

اب اپنے سائے میں خود آپ تھک کے بیٹھ رہو
کہیں درخت نہیں راستے میں دُور نہ پاس

ہزار رنگ کی ظُلمت میں لے گئی مجھ کو
بس اِک چراغ کی خوشبو بس اِک شرار کی آس

کسی کی آس تو ٹوٹی کوئی تو روٹھ گیا
کہ نیم باز دریچوں میں روشنی ہے اُداس

یہ کیا طلسم ہے کہ جب سے کنارِ دریا ہوں
کچھ اور بڑھ گئی نصیرؔ مِری رُوح کی پیاس

OOO

پروین سجل

O

رنگ اُڑتے ہیں جب بھی خوابوں سے
واسطے پڑتے ہیں عذابوں سے
تجھ کو تیرا دِیا ہی لوٹا کر
جاں چھڑائی تیرے حسابوں سے
عمر دیوار چاٹتے گزری
بات کیا کرتے ماہتابوں سے
شہر سارا سوال پر اُترا
شام پڑنے لگی جوابوں سے
دیکھنا احتیاط رکھنا ذرا
نام نکلے گا انتسابوں سے
ابلقِ خاک، دھول حدِّ نظر
پانو باہر پڑے رِکابوں سے
وقت سر پر جو آ پڑے بابا!
بچنا مشکل ہے پھر خرابوں سے
کھاری شبنم سے رات بھیگی رہی
صبح خوشبو گئی گلابوں سے
کتنے اوراق گرد چاٹ گئی
ذہن اُلجھے رہے نصابوں سے
رات کا خوف جان کھائے سجلؔ
دشت لپٹا رہا سرابوں سے

OOO

فرحین چودھری

O

تنہا دل کی دیواروں پر مدہم سا اک سایہ ہے
تیرے پیار میں ہم نے جاناں اتنا کچھ ہی پایا ہے

پہروں ملبے پر یوں بیٹھا سوچتا رہتا ہے اب کیا
شاید تیرا اپنا تھا یہ گھر جو تو نے ڈھایا ہے

چھائے ہیں برفیلے بادل چاروں اور اُداسی کے
وہ بھی کس موسم میں اپنا قرض چکانے آیا ہے

جب بھی پھوٹ بہے یہ سوتے خشک نہ ہوتے دیکھے ہیں
کہنے کو ہم پتھر تھے پر زخم کوئی جب کھاتے ہیں

آئے بیٹھے، آنسو پونچھے، دے کے تسلی چل بھی دیے
رات کے پچھلے پہروں ہم نے یہ دھوکا بھی کھایا ہے

ہم نے زیست کا ہر اک لمحہ جس کے نام لکھا فرحینؔ
ہنس کر یہ بھی مان لیا وہ اپنا نہیں پرایا ہے

OOO

منورسلطانہ بٹ

O

کُنج لب کھولنے نہیں دیتی
بے بسی بولنے نہیں دیتی

کس قدر سنگدل ہے آج ہوا
مجھ کو پَر تولنے نہیں دیتی

کیا بتائیں علیحدگی میں اَنا
اشک بھی رولنے نہیں دیتی

اُس کی ہلکی سی اِک تسلّی بھی
دِل مرا ڈولنے نہیں دیتی

زندگی تلخیوں میں سلطانہؔ
راحتیں گھولنے نہیں دیتی!

OOO

ڈاکٹرمقصودہ حسین

مقدّر

مقدّر میں جولکھا ہے
وہ اک دن ہو کے رہتا ہے
میں لڑ تو لوں زمانے بھر سے
مگر میں لڑ نہیں سکتی
ان ہاتھوں کی لکیروں سے
مرا جیون عبارت ہے
اک جہد مسلسل سے
کہ ہر طوفان سے پہلے
کئی طوفان جھیلے ہیں
مری خواہش فقط یہ تھی
کہ جیون چین سے بیتے
چلو یہ مان لیتی ہوں
کہ اب میں لڑ نہیں سکتی
مقدّر میں جولکھا ہے
وہ اک دن ہو کے رہنا ہے

OOO

غلام شبیر اسدؔ

O

ذات کا صحرا، سفر اور بیش تر تنہائیاں
تہ بہ تہ سنسان راہیں، سر بہ سر تنہائیاں

میں ازل سے بے اماں اور تُو ابد تک بے اماں
اپنے حصّے میں رہیں گی بے ثمر تنہائیاں

تو کلیمِ شہر تھا اور میں نشانِ بے زباں
اس لیے تو آ ملی ہیں پُرخطر تنہائیاں

میں سکوتِ بے کراں کی بارگاہ میں پیش تھا
مجھ کو کرتی رہ گئیں زیر و زَبر تنہائیاں

آ مآلِ کار اپنی محفلوں کے درمیاں
کب تلک چھائی رہیں گی اپنے سر تنہائیاں

میں اسدؔ لاؤں کہاں سے آفتابِ☆ شعر کو
اب دیارِ یار میں ہیں عمر بھر تنہائیاں

OOO

☆ شاعرِ غزل، آفتاب حسین

قمر علوی

O

سفر تشکیک میں اُلجھا ہوا ہے
چراغِ دَہر بھی بجھنے لگا ہے

نہیں جی جی کے مرنے میں تلذّذ
مگر مَر مَر کے جینے میں مزا ہے

نہیں ہوں حِدّتِ غم سے ہراساں
مرے سَر پر دعاؤں کی رِدا ہے

کریں احباب اب ترکِ تعلّق
مِری قسمت کا سورج ڈھل گیا ہے

قمرؔ کس سے محبت ہو گئی ہے
لہو کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے

OOO

علی اعظم بخاری

O

نمازِ عصر سے شب کے شروع ہونے تک
وہ ایک رات سَحر کے طلوع ہونے تک

ہمارے ہاتھوں کے کاسے رہیں گے کیا خالی؟
ہمارے قلب میں پیدا خشوع ہونے تک

گُزر ہی جائے گی عمرِ عزیز تو اِک دن
پر ہم کو کشفِ اصول و فروع ہونے تک

امیرِ شہر خبر ہے تری سخاوت کی
یہ لوگ ہوں گے کہاں ردِّ جوع ہونے تک

کوئی کریم ہے ایسا، اس انتظار میں ہے
مرے سراپا خشوع و خضوع ہونے تک

اس ایک برف بدن کا بنے گا کیا آخر
شُعاعِ لطف و کرم کے رَجوع ہونے تک

کھڑے تھے اُس کی حفاظت کو جو علی اعظم
گزر گئے ہیں وہ جاں سے رکوع ہونے تک

OOO

احمد حجازی

O

سجا ہے کون رنگوں کے نگر میں
عجب رونق ہے یادوں کے نگر میں

وہ آیا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے
بہار آئی ہے پھولوں کے نگر میں

ہر اک لمحہ خیالوں میں ہی گزرا
بسا ہے کون آنکھوں کے نگر میں

کسی کی یادِ پیہم آ رہی ہے
بہت گرمی ہے جذبوں کے نگر میں

در و دیوار روشن ہو گئے ہیں
وہ آئے ہیں اندھیروں کے نگر میں

چُھپا ہے کون سوچوں میں ہماری
عجب ہلچل ہے خوابوں کے نگر میں

وفا ملتی نہیں کیوں مجھ کو احمدؔ
کیوں آ پہنچا فریبوں کے نگر میں

OOO

قاسم خیال

O

بھنور کی مست موجوں کو کنارے چھین لیتے ہیں
کہ اپنوں سے یہاں اپنے سہارے چھین لیتے ہیں

یہ کیسی بات کرتے ہو یہ کیسا عدل ہے واعظ
یہاں بچوں سے خود منصف غبارے چھین لیتے ہیں

کسی مقروض پہ آتا عروجِ زندگی کب ہے
کہ مفلس کی ہنسی تک بھی خسارے چھین لیتے ہیں

کہاں کے یہ مدارس ہیں جہاں پہ ظلم پلتا ہے
کہ ملاّ خود یتیموں سے سیپارے چھین لیتے ہیں

میں کیسے اپنے لوگوں سے تعلّق کو بڑھاوا دوں
مری آنکھوں سے اپنے ہی نظارے چھین لیتے ہیں

OOO

رؤف ایاز

O

میرے ہونے کا تماشہ کیا ہے
زندگی سے میرا رشتہ کیا ہے

جنسِ بے مایہ لیے پھرتا ہے
دلِ خوش فہم سمجھتا کیا ہے

تیری ہستی ہے وجودِ ہستی
تو نہیں ہے تو تمنّا کیا ہے

میری ہر سانس میں تو بستا ہے
میری سانسوں کا بھروسا کیا ہے

تشنہ گامی ہے کہ ہے تشنہ لبی
ابر کیسا ہے، یہ دریا کیا ہے

جانِ بے دل کی نگہبانی ہے
کچھ نہیں ہے تو یہ دھڑکا کیا ہے

ایک دو سخت اصولوں کے سوا
دامنِ زیست میں رکھا کیا ہے

OOO

انٹرویو

ایک مصاحبہ

ماریہ سہیل

سوالات : **ماریہ سہیل** جوابات : **انور سدید**

O **بچپن کی یادوں میں کیا کچھ ہے جواب بھی تازہ ہے؟**

☆ بچپن کی یادوں میں سے یہ بات میں کبھی نہیں بھلا سکا کہ پانچویں جماعت میں املاء نویسی میں حرف ''نون'' ''ن'' کی قوس کتابت کے اصولوں کے مطابق نہ بنانے پر ماسٹر ہاشم الدین صاحب نے جو ماہرِ اقبالیات مرزا محمد منور کے والدِ محترم تھے، مجھے ایک تھپڑ رسید کیا تھا جب کہ دوسرے لڑکوں کو کچھ نہیں کہا تھا۔ اس ''تھپڑ'' نے ماسٹر صاحب کے خلاف میرے دل میں نفرت پیدا نہیں کی بلکہ بعد میں ان کے بارے میں یہ بات میں نے بارہا لکھی کہ انہوں نے ہمیں پانچویں جماعت میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''قصص الہند'' جو نصاب میں شامل نہیں تھی سبقاً سبقاً پڑھائی اور میرے ادب کے ذوق کو سنوارا۔

O **آپ نے جس دور میں بچپن جیا وہ آج سے بہت مختلف تھا، اس پر کیا کہیں گے؟**

☆ میں نے پہلی جماعت میں داخلہ 1935ء میں لیا تھا۔ مڈل کا امتحان 1942ء میں پاس کیا۔ ان نو برسوں کو میرے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ شمار کریں تو اب یہ زمانہ سنہری نظر آتا ہے۔ سرگودھا میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی شاید ایک لاکھ پر مشتمل تھی۔ اور ان میں سکھ اور عیسائی بھی شامل تھے لیکن فرقہ وارانہ منافرت کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا میں مسلمان اساتذہ مولوی محمد بخش، ماسٹر عبدالعزیز اور مرزا عبدالحمید کے ساتھ میں سائنس ماسٹر تلک رام اور حساب کے ماسٹر امیر سنگھ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ یہ اساتذہ محض تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ بلاتمیز مذہب وملّت طلبا کی شخصیت سازی بھی کرتے تھے۔ میرے ادبی ذوق کو ڈرائنگ ماسٹر شاہ دین شاد صاحب نے سنوارا۔ اور عروض کی تعلیم ماسٹر عبدالکریم نے دی تھی۔ سیاسی اور مذہبی جلسے بھی ہوتے تھے جن میں ہر شخص اپنی ذوقِ طبع کے مطابق شامل ہوتا تھا۔ سیاسی مناظرے بہت کم ہوتے تھے۔ انگریزی حکومت ہونے کے باوجود شہر کا ماحول متوازن تھا۔ میرے دل میں تمبا کو نوشی سے نفرت ملتانی رام سنیاسی نے پیدا کی جو کچہری بازار سرگودھا میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے ہاضمے کی گولیاں بیچنے کے لیے مجمع لگاتا تو حقے کے خلاف بھی تقریر کرتا تھا۔

O **عمر کا وہ کون سا لمحہ یاد ہے جس میں تمام عمر جینا چاہتے ہوں؟**

☆ میرا خیال ہے کہ گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا میں پانچویں اور چھٹی اور پھر نویں اور دسویں کا دور اور گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ

غازی خان میں ساتویں اور آٹھویں جماعت کا دور میری تعلیمی کامیابیوں کا بہترین دور تھا۔ اساتذہ کی شفقت اور تعلیم میں راہنمائی فراوانی سے حاصل تھی۔ اس دور میں ہی کتاب کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اردو کا بیشتر کلاسیکی ادب پڑھ ڈالا۔ پہلی کہانی بچوں کے رسالہ ''گلدستہ'' میں شائع ہوئی جس کے مدیر لالہ رگھوناتھ سہائے تھے۔ میرے دوستوں میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب شامل تھے لیکن یہ غیر متعصّب حلقہ نہیں تھا۔ اور ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتے تھے۔ مقابلے کی فضا موجود تھی۔ حسد کی فضا مفقود تھی۔ ایسا دور پھر نصیب نہیں ہوا۔

O لڑکپن کا دور کیسا رہا۔ مزاج میں شوخی تھی یا سنجیدگی؟

☆ مجھے اپنے لڑکپن میں کھلنڈرے لڑکوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اساتذہ ہر طالب علم کے دوستوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور کسی کو غیر سنجیدہ سرگرمیوں کی طرف رخ نہیں کرنے دیتے تھے۔ میں نے سرگودھا ہائی سکول میں ''بزمِ ادب'' کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ ڈیرہ غازی خان سکول میں طلبا میں انتخابات کرا کے ایک انتظامی اسمبلی بنانے کا تجربہ کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے تین حریفوں پر سبقت حاصل کی۔ اس ''سٹوڈنٹ اسمبلی'' میں سید اسد علی شاہ کو جو بعد میں ریونیو بورڈ کے ممبر کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے، وزیر تعلیم منتخب کیا گیا۔ مجھے ان کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ نویں جماعت کے طالب علم منوہر لال زتشی ہمارے وزیر اعلیٰ تھے۔ اسمبلی کا اجلاس ہر مہینے ہوتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر رسول بخش صاحب ساری کارروائی کی نگرانی کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے کے یہ سب کام سنجیدہ نوعیت کے تھے۔

O ہمارے ادبا کی اکثریت ابتدا میں شاعری میں دلچسپی رکھتی تھی۔ آپ کی پہلی محبت بھی شاعری تھی یا نثر؟

☆ جی ہاں۔ نصاب کی نظمیں پڑھ کر مجھے بھی شاعری میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈیرہ غازی خان میں مجھے اسی دور کے مشہور شاعر شفقت کاظمی سے، جو اپنے نام کے ساتھ ''خاکپائے حسرت موہانی'' لکھتے تھے۔ فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ میرے دوست آفتاب احمد خان کے اتالیق تھے۔ ڈیرہ غازی خان کے ایک مشاعرے میں ہی میں نے اختر رضوانی کو سنا جن کی غزل کے دو شعر مجھے بھولے نہیں۔

سلسلہ در سلسلہ ہے اس کا حسنِ دل فروش عشق میرا داستاں در داستاں ہے آج تک

.....

اب کہاں اہلِ جہاں کے دل میں سوزِ عاشقی ایک اخترؔ ہے، سو مصروفِ فغاں ہے آج تک

سرگودھا میں مشاعروں کا اہتمام راجا جوہر نظامی کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں ساحر لدھیانوی بھی آئے تھے اور انہوں نے ''تاج محل'' کے علاوہ اپنی نظم ''ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟ (چکلے) بھی پڑھی تھی۔ اس دور میں سرگودہا کے مشہور شاعروں میں الطاف مشہدی، اور انور معمول شامل تھے۔ لیکن شاعری میری محبت نہیں بن سکی۔ نثر میں فلمی رسائل چترا۔ گورد گفٹال، اداکار، پکچر، اور پارس نے میری کہانیاں شائع کیں اور مجھے شہرت کا پہلا ذائقہ چکھایا۔ بعد میں ''بیسویں صدی'' جیسے نیم ادبی رسالہ میں میرا ہاتھ خوشتر گرامی اور یزدانی جالندھری نے تھاما اور میں ''ہمایوں''، ''آج کل''، ''چمنستان''، ''مشہور'' اور ''نیرنگِ خیال'' جیسے رسائل تک پہنچ گیا۔ 1966ء میں ڈاکٹر وزیر آغا مجھے باقاعدہ اور مستقل طور پر ادب کی طرف لے آئے اور راستہ دکھانے والے ستارے کا فریضہ ادا کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید میں محکمہ آبپاشی کے ایک انجینئر کی حیثیت ہی میں ریٹائر ہو جاتا۔

O اس دور میں رومان کے جگنو بھی جھلملاتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں محبتوں کے نقوش کس قدر نمایاں رہے؟

☆ ''لڑکپن اور جوانی کا لاابالی دور پابند معاشرے میں گزرا۔ یہ حسرت موہانی کا دور تھا جس میں لڑکیاں گھر کے آنگن سے داخلی ابال کے تحت گھر کے کوٹھے تک تو پہنچ گئی تھیں لیکن سرگودہا کے بازار لڑکیوں اور عورتوں سے خالی تھے۔ لاہور میں بھی اینگلو انڈین لڑکیاں ہی مال روڈ پر محوِ خرام نظر آتی تھیں جنہیں لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے۔ میں اس نظر بازی سے سابقہ تربیت کے تحت محفوظ رہا''۔

O بیوی سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟

☆ آپ ضرور حیران ہوں گی کہ میری منگنی میری بیوی نصرت کی پیدائش سے بھی پہلے ہوگئی تھی۔ میرے سسر میاں بشیر احمد کی پرورش میری والدہ نے کی تھی۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ بشیر احمد کی پہلی بیٹی میری بیوی بنے گی۔ سو نصرت سے میری پہلی ملاقات اس کی پیدائش پر ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش پر محلے میں مٹھائی تقسیم کرنے والوں میں مَیں بھی شامل تھا۔

O شادی آپ کی پسند سے ہوئی یا گھر والوں کے مرضی ہے؟

☆ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ میری شادی میری والدہ کی مرضی سے ہوئی تھی۔ بلکہ میرے سسر میاں بشیر احمد کی شادی بھی میری والدہ کی پسند سے ہوئی۔

O ادب میں تو تنقید کا حوالہ خوب ہے، گھر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے؟

☆ گھر کا اندرونی نظام میری بیوی نے سنبھال رکھا ہے۔ سرکاری کام کرنے کے بعد میں گھر آتا تو نئی کتابیں میرا دامن تھام لیتیں۔ مطالعے کے دوران بیوی میری ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور ضروری وقفوں سے چائے بھجوا دیتی ہے۔ مہمان کی تواضع کے لیے ضروری چیزیں گھر میں موجود رکھتی ہے۔

O کھانے میں کیا پسند ہے؟

☆ میں کھانے میں ہر چیز شوق سے کھا لیتا ہوں۔ ''آج کیا پکانا ہے؟'' اس کا فیصلہ بیوی کرتی ہے۔ کھانے کے بعد موسم کے تازہ پھل کی طلب ضرور ہوتی ہے اور یہ بالعموم فراہم ہوتا ہے۔

O موسیقی میں کیا سنتے ہیں؟

☆ موسیقی میری روح کی غذا تو کبھی نہیں بنی۔ لیکن خواجہ خورشید انور کی موسیقی میں نور جہاں نغمہ ریز ہو تو دل کے تار لرز اٹھتے ہیں۔ مہدی حسن اور غلام علی کی غزل سرائی بھی کتب سے توجہ ہٹا دیتی ہے۔ نوجوانی کے دور میں مجھے پنکج ملک کا گیت ''جگ میں چلیں پون کی چال'' بہت پسند تھا۔

O پسندیدہ گیت یا غزل کونسی ہے؟

☆ میں عرض کر چکا ہوں کہ موسیقی میرے دل کے تاروں کو لرزاں کرتی ہے لیکن یہ شناسائی واجبی سی ہے۔ اور چنداں قابل ذکر نہیں۔ فلمی اداکارہ ثریّا کی آواز میں مرزا غالب کی اس غزل۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا'' کی گائیکی نے معنویت کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ طلعت محمود کی آواز میں یہ غزل میں نے انجینئرنگ کی تعلیم کے زمانے میں جی، ایس، ای، رسول (ضلع منڈی بہاؤالدین) میں سنی تھی۔

ہونٹوں سے گلفشاں ہیں وہ، آنکھوں سے اشکبار ہم ساون سے وہ ہیں بے خبر، بے گانۂ بہار ہم

اوراسی کے لئے آج تک دل سے دماغ تک کا جادو جگا رہی ہے۔

O نثر میں کسے پسند کرتے ہیں اور کون سب سے برا لگتا ہے؟

☆ میں رومانوی نثر کا شیدائی ہوں۔اس کا پہلا نقش پانچویں جماعت میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''قصص الہند'' نے قائم کر دیا تھا۔ بعد میں ''آب حیات'' میری محبوب کتاب بن گئی۔میرا خیال ہے کہ آزاد کا اسلوب مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' کے وسیلے سے وزیر آغا صاحب تک پہنچا۔اوران سے میں نے اکتساب کرنے کی کوشش کی۔آپ اسے ''جمال ہم نشیں'' بھی کہہ سکتے ہیں۔اردو کے دوسرے ادیبوں میں سے مجھے ڈاکٹر خورشید الاسلام۔سجاد انصاری (مصنف ''محشر خیال'')۔عبدالعزیز فلک پیما۔مختار مسعود اور ایک غیر معروف مصنف گیان سنگھ شاطر کی نثر بھی پسند ہے۔ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی نثر کو بھی میں ناپسند نہیں کرتا۔اوراسے دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔میں کسی نثر نگار کو بُرا کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

O کون سا شاعر اچھا لگتا ہے؟

☆ کسی ایک کو اچھا شاعر کہنا ممکن ہی نہیں۔آج ہی ڈاکٹر آصف ریاض قدیر کی کتاب ''نادر و نایاب اشعار'' ملی اس میں ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ اشعار درج ہیں جو مختلف شعرا کے ہیں۔اس کتاب کا ہر شعر میرا پسندیدہ ہے میں نے ارتجالا یہ کتاب کھولی تو صفحہ 150 پر پہلا شعر ساغر نظامی کا نظر پڑا۔

معطّر معطّر، خراماں خراماں نسیم آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

O کوئی ایسا شاعر جسے سنتے یا پڑھتے وقت کراہت محسوس ہوتی ہو؟

☆ صرف ایک شاعر جس کا تخلّص تھا۔چرکین ..... یہ انسانی زندگی کی غلاظتوں پر شعر لکھتا تھا۔پچھلے دنوں بھارت میں چرکین کا دیوان بڑے تزک و احتشام سے چھاپا گیا اوراس کی شاعری پر بھارت کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے مضمون بھی لکھا تھا۔

O ایسی خواہش جو پوری نہیں ہوئی؟

☆ ایک حسرت دل میں ابھرتی ہے کہ میں اسّی (80) سے زیادہ کتابیں تالیف و تصنیف کرنے کے بعد بھی اپنا پورا اظہار نہیں کرسکا۔ اظہار کی خواہش ناتمام باقی ہے۔اب عمرِ پیری کی بیماریوں نے یلغار کر دی ہے اور میں اپنے ان کرم فرماؤں کے ارشادات کی تعمیل نہیں کرسکتا جو کتاب کا دیباچہ یا پیش لفظ لکھوا کر رسید بھی نہیں دیتے۔تاہم مجھے اپنی شکست کی آواز سنائی دینے لگی ہے اور معذوری جاں کاہ محسوس ہوتی ہے۔

O بیگم کس قدر شکی مزاج ہیں؟

☆ بیگم قطعاً شکی مزاج نہیں ہے۔ہم نے اپنی عائلی زندگی کے ساٹھ سال اعتماد کی پختہ فضا میں گزارے ہیں۔

O لاہور سے محبت کا حوالہ کس قدر مضبوط ہے۔اس شہر کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

☆ میرا خیال ہے کہ میں نے لاہور میں اپنا سرگودہا آباد کر رکھا ہے۔دوسری طرف لاہور اب لاہوریوں کا نہیں رہا۔لاہور کا آخری ادیب شاید مرزا ادیب تھا۔اب کسی لکھنے والے کے نام کا لاحقہ ''لاہوری'' نظر نہیں آتا۔میری نظر میں لاہور ادب کا ایک منفرد دبستان ہے جس کا بانی محمد حسین آزاد کو قرار دیا جاسکتا ہے۔متعدد تخلیقی اصناف کو اس دبستان نے فروغ دیا۔

O دوستوں کی محفلیں بھلی لگتی ہیں یا گھر میں وقت گزارنا؟

☆ محکمہ آبپاشی کی چالیس برس کی ملازمت نے مجھے ادبی محفلوں سے دور رکھا اور میں نے دور افتادہ دیہاتوں میں زندگی کتابوں کی معیت میں بسر کی۔ مجھے ادیبوں سے مکالمے کی فضا میسر نہیں آئی اور میں ''انٹرووِرٹ'' (Introvert) بن گیا۔ مطالعے کو ذوق کے مطابق وسعت دی لیکن باقاعدہ ادبی تربیت سے محروم رہا۔ یہ کمی کسی حد تک ڈاکٹر وزیر آغا کی ''شامِ دوستاں'' نے پوری کی۔ آغا صاحب میرے حقیقی ادبی راہنما تھے۔ 2008ء میں ریڑھ کی ہڈی میں خلاء پیدا ہو گیا جس نے شیاٹیکا درد کی افزائش کی اور میں گھر میں محصور ہو گیا۔ اب معذوری کی حالت میں چلنا پھرنا موقوف ہے۔ اور سارا وقت گھر پر ہی گزرتا ہے۔

O سیاست میں کتنی دلچسپی ہے؟ کون سا سیاسی رہنما پسند ہے؟

☆ دسمبر 1988ء میں محکمہ آبپاشی سے ریٹائر ہوا تو میں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ جناب مجید نظامی نے مجھے ''نوائے وقت'' کے ادارتی بورڈ میں شامل کیا۔ اور اداریہ لکھنے کے لیے سیاسی واقعات کا تجزیہ کرنے کی تربیت بھی دی۔ سیاست اب میرے مطالعے کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں قائداعظم محمد علی جناح کے بعد پاکستان کے سیاسی افق پر کوئی مخلص لیڈر نہیں ابھرا۔ آج کے سب سیاسی راہنما اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہیں اور پاکستان دوستی کے تقاضے پورے نہیں کر رہے۔ اس کی سزا اٹھارہ کروڑ عوام بھگت رہے ہیں۔

O خوشبو کون سی پسند ہے، اور کیوں؟

☆ مجھے گندم 591 کی خوشبو پسند تھی جواب نایاب ہے۔ گندم کی روٹی پیٹ کی بھوک کو مٹاتی تھی اور اس کی خوشبو جسم و جاں کو معطر کرتی تھی۔ اب جو گندم دستیاب ہے وہ خوشبو سے محروم ہے۔

O لباس میں کیا پسند ہے؟

☆ میں کرتہ اور شلوار میں کام کاج اور نقل و حرکت کی آسانیاں محسوس کرتا ہوں۔

O رنگ کونسا پسند ہے؟

☆ سفید رنگ..... جو سب رنگوں کی آمیزش سے بنا ہے۔

◆◆◆

کچھ آپ کا بھی ادبی فرض ہے

1- جب آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو تو اطلاع دیجئے کہ آپ کو آئندہ سال کے لئے خریداری منظور ہے یا نہیں۔
2- بہت ضروری ہے کہ آپ رہائش منتقل کریں تو تبدیلی پتہ کی اطلاع ضرور دیں۔
3- مضامین نظم و نثر بھیجتے وقت ماہنامہ ''تخلیق'' کے معیار کو پیشِ نظر رکھیے۔ مطبوعہ مضامین نہ بھیجئے۔
4- مضامین کی نقلیں اپنے پاس رکھیئے۔ شائع نہ ہونے کی صورت میں ادارہ سے تحریر واپس طلب نہ کریں۔
5- ای میل بھیجتے وقت تخلیق پر اپنا نام، پتہ اور موبائل نمبر ضرور درج کیجئے۔ (ادارہ 'تخلیق')

موسیقار خیام کے بارے میں ڈاکٹر امجد پرویز سے گفتگو

......1......

سحر حفیظ

سوالات : سحر حفیظ جوابات : ڈاکٹر امجد پرویز

ابتدائیہ

موسیقار خیام کا تعلق لاہور سے ہے۔ اگر چہ آپ کی پیدائش مشرقی پنجاب کے گاؤں راہوں میں ہوئی تھی۔ اصل نام محمد ظہور ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ آپ کا فلمی نام خیام' مشہور ہدایتکار ضیاء سرحدی نے تجویز دیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی آپ موسیقی کو ذریعہ معاش بنانے کی خاطر بمبئی منتقل ہو گئے تھے۔ آپ برصغیر کے نامور موسیقار بابا جی۔ اے۔ چشتی کے شاگرد تھے۔ بھارت میں آپ نے نامور موسیقاروں کی جوڑی حُسن لال بھگت رام سے دس ٹھیکے (Rhythm beats) یاد کیے۔

1940ء کی دہائی کے اختتام پر خیام بھی ایک جوڑی کے طور پر ورما جی۔ شرما جی کے نام سے موسیقار مشہور ہوئے۔ شرما جی' خیام تھے اور ورما جی' موسیقار رحمان ورما تھے۔ اس جوڑی نے مل کر چند فلموں میں موسیقی دی۔ رحمان ورما نے چونکہ پاکستان نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے انہوں نے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں چند کامیاب فلموں میں موسیقی دی تھی۔

O سحر حفیظ: **آپ کی تحریریں کس طرح سے ان عظیم موسیقاروں پر دستیاب' میکانیکی معلومات سے' ممتاز کرتی ہیں؟**

☆ ڈاکٹر امجد پرویز: جوبات موسیقاروں میں میری اس تحریر کو ان میکانکی معلومات سے ممتاز اور بالا کرتی ہے، وہ ان شخصیات کی زندگی اور ان کی فنی مہارت کے لیے میری ذاتی پسند اور میرا ذوق ہے اور میں زندگی میں کس طرح ان کے نغموں اور دھنوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ میں جب بھی اپنے باطن سے وابستہ گیتوں کو سنتا یا اب بھی سنتا ہوں تو ان کے طلسماتی نرغے میں ماضی کی مسرت آمیز اداسی میری رگ رگ میں اتر جاتی ہے اور میں ان گیتوں سے وابستہ چہروں کے تصور، مختلف جگہوں اور جذبات واحساسات کے مانوس، نامانوس جہانوں میں، دریا سے بچھڑی لہر کی طرح سرگرداں رہتا ہوں۔

O **موسیقار خیام کو بحیثیت موسیقار آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟**

☆ خیام ان چند عالیشان میوزک کمپوزرز میں سرفہرست ہیں جو میرے لیے نہایت قابلِ احترام ہیں اور اس کی ایک بنیادی وجہ ان کے نغموں کی دھنوں کا دوسروں سے بالکل مختلف اور فنی لحاظ سے یکتا ہونا اور موسیقی میں ان کا اختراعی طرزِ عمل ہے۔ اگر چہ انہوں نے لاتعداد ایسے گیت کمپوز کیے جو فلمی کہانی کے حالات وواقعات سے مکمل طور پر مطابقت رکھتے تھے لیکن انہوں نے موجودہ دور کی موسیقی کے

جھمیلوں میں پڑنے سے انکار کیا۔ خیام میرے زندگی بھر کے ایک ساتھی اور دوست مشتاق ہاشمی کے بڑے بھائی ہیں۔ خیام کی موسیقی نے میری سائیکی پر بہت گہرا اور بالکل انوکھا اور یکتا اثر ڈالا ہے۔ ان کے ریشم جیسے سُروں نے نہ صرف میری بلکہ ہر کسی کی سماعتوں کو ایک تسکین آمیز نرمی اور ملائمت کے ساتھ چُھوا ہے۔ موسیقی کا ایسا احساس صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب سُروں کا ذوق رکھنے اور ان سے محبت کرنے والا واقعی موسیقی کی اصلیت سے آشنا ہو۔ رچنا ڈیوبے کے ساتھ ''ہندوستان ٹائمز'' کے لیے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں چوراسی سالہ خیام نے کہا کہ وہ بولی وڈ میں رائج طرزِ موسیقی کے لیے خدا تعالیٰ سے رحم کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں ''اللہ رحم کرے۔ آج کل میوزک کمپوزرز تضحیک آمیز موسیقی تخلیق کر رہے ہیں۔ یہ صرف ڈھم ڈھم اور ڈھم ہے۔ اب سے کچھ سالوں کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ایسی موسیقی کا نوجوان نسل پر کتنا بُرا اثر پڑا ہے۔ ان کی شخصیت میں ملائمت اور مروت ختم ہوجائے گی۔ موسیقی کا مقصد تو تھکے ماندے اور بے زار ذہن کو تسکین آمیز خوشی اور ملائمت پہنچانا ہے جبکہ آج کی موسیقی آپ کو اور زیادہ تھکا دیتی ہے۔''

O موجودہ دور میں اگر کوئی اوسط درجے کا گیت' تھوڑا بہت melodious کمپوز ہوجائے تو اسے پذیرائی مل جاتی ہے۔ تو کیا یہ اس امر کی غمازی نہیں کرتا جس کی نشاندہی موسیقار خیام نے کی ہے کہ ہندوستانی فلمی موسیقی اس وقت اپنے بدترین بحران سے گزر رہی ہے؟

☆ خیام کا یہ تجزیہ پہلے ہی اپنی سچائی ثابت کر چکا ہے۔ کوئی اوسط درجے کا گیت بھی آج اگر تخلیق ہوجائے تو وہ اس رائج طرزِ موسیقی کی نسبت زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو اس وقت بھارتی فلم اور سینما میں رائج ہے۔ یہاں تک کہ لتا منگیشکر اور آشا نے بھی اپنے حالیہ انٹرویوز میں ہندوستانی موسیقی کے معیار کی ابتر حالت اور اس کے زوال پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ عظیم موسیقاروں اور میوزک کمپوزرز کی فنِ موسیقی سے لازوال محبت اور وابستگی ان کی فنی مہارت اور درخشاں صلاحیتوں کے بارے میں میری تحریروں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ زوالِ موسیقی کے اندھیروں میں ماضی کی روشنیوں کے چراغ جلا کر ہم شاید کچھ راہنمائی حاصل کر سکیں بشرطیکہ کوئی راہرو منزل آمادۂ مسافت ہو۔

O خیام کے بارے میں ان کے دورِ جدوجہد اور فلموں کے متعلق بتایئے۔

☆ خیام کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بابا چشتی کے شاگرد تھے اور موسیقی کے رموز سیکھنے اور اسی میدان میں عملی جدوجہد کرنے کی خاطر وہ دہلی بھاگ گئے تھے، لہٰذا انہوں نے حُسن لعل بھگت رام سے بہت سے ٹھاٹھ اور ٹھیکے سیکھے۔ یہ بات خیام نے مجھے اس وقت بتائی تھی جب میں اپنی ایک البم کی موسیقی کے لیے 1992ء میں ان کے پاس بمبئی گیا تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے انہوں نے کچھ فلموں کے لیے موسیقار جوڑے ورما جی شرما جی کے نام کے تحت کام کیا۔ شرما برائے خیام اور ورما برائے رحمان ورما۔ میوزک کا ذوق شوق رکھنے والوں کو فلم ''بیوی'' میں محمد رفیع کا گایا ہوا یہ گیت ''اکیلے میں وہ گھبراتے تو ہوں گے'' تو یاد ہوگا۔ یہ دراصل خیام کی تیسری فلم تھی۔ اس سے پہلے ''ہیر رانجھا'' (1948ء) اور ''پردہ (1949ء) کے لیے وہ دھنیں تخلیق کر چکے تھے۔ ان فلموں کے لیے خیام نے گیتا دت، آشا بھوسلے، محمد رفیع اور زہرا بائی انبالے والی کی آوازوں کو اپنی موسیقی سے مزّین کیا۔ فلم ''بیوی'' کے اس گیت نے خیام کے فن کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ اس گیت کی مقبولیت کی بنا پر ہی فلم انڈسٹری میں ایک معیاری کمپوزر کی حیثیت میں خیام کی پذیرائی ہوئی۔ اس گیت کے بارے میں حالیہ دنوں میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے خیام نے بتایا کہ ملک کے بہت سے شعرا نے ان کے لیے پسندیدگی اور داد و تحسین کے جذبات کا اظہار کیا۔ میڈیا سے یہ گفتگو انہوں نے سب سے اعلیٰ ایس ڈی برمن انٹرنیشنل ایوارڈ وصول کرنے کے ایک دن بعد کی۔ یہ اعلیٰ ایوارڈ انہیں تخلیقی موسیقی اور آواز کے تخلیقی استعمال کے اعتراف کی بدولت پیونے (Pune) انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کے موقع پر دیا گیا تھا۔

یہ گیت آل انڈیا ریڈیو سے بار بار نشر کیا جاتا رہا۔

O وہ کون سا گیت تھا جو خیام کو شہرت کی بلندیوں کی طرف لے گیا؟

☆ فنِ موسیقی کے لیے لگن اور محنت کے نتیجہ میں انہیں بلندیوں کی جانب بڑھنے کا ایک اور موقع میسر آیا۔ جب انہیں ''فٹ پاتھ'' جیسی ہٹ فلم کی موسیقی کے لیے استدعا کی گئی۔ فلم میں دلیپ کمار پر فلمایا گیا اور طلعت محمود کا گایا ہوا یہ لازوال اور ناقابل فراموش گیت'' شامِ غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم'' میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔

خیام نے مجھے بتایا کہ وہ دن ان کے ''کڑکی'' یعنی سختی کے دن تھے۔ ان دنوں ان کی جیب میں صرف چائے کے لیے ہی چار آنے ہوتے تھے۔ وہ ڈبل ڈیکر بسیں بدل بدل کر سفر کیا کرتے تھے۔ اس دوران سفر میں انہوں نے ماچس پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے اس گیت کی دھن بنائی تھی۔ اس وقت ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ پانچ دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی اس گیت اور اس کی دھن کی وجہ سے ان کو یاد کیا جائے گا۔

O فلم ''فٹ پاتھ'' کے بعد موسیقار خیام کی کون سی فلمیں منظرِ عام پر آئیں؟

☆ ان کی اگلی فلم (1953ء) ''گلِ صنوبر'' پذیرائی سے محروم رہی لیکن 1954ء کی فلم ''دھوبی ڈاکٹر'' کے لیے آشا کے گیتوں کو پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد کی فلم تھی ''گلِ بہار'' (1954ء)۔ 1958ء پروڈیوسر عصمت چغتائی کی فلم ''لالہ رخ'' کی نمائش ہوئی۔ اس فلم میں شیاما اور طلعت محمود نے مرکزی کردار سرانجام دیئے۔ اس فلم کے گیت میں اکثر گنگنایا کرتا تھا۔ خصوصاً آشا کا گانا ''لے جا میری دعائیں'' اور پھر آشا، طلعت کا دوگانہ'' پیاس کچھ اور بھی بھڑکا دی، جھلک دکھلا کے تجھ کو، پردہ رُخِ روشن سے ہٹانا ہوگا'' (ایسی معیاری شاعری کے لیے صرف داد کا ایک لفظ واہ' بہت خوب ہی نکل سکتا ہے، آج کی شاعری ''مُنی بدنام ہوئی'' کے برعکس) یہ گیت لاجواب گیت تھے۔

O موسیقار شنکر جے کشن' نوشاد علی اور لکشمی کانت پیارے لال کے برعکس' موسیقار خیام' کم سازوں کے استعمال سے بھی کامیاب اور لازوال نغمے تخلیق کرتے رہے ہیں۔ اس کی کوئی مثال دیجئے۔

☆ مذکورہ بالا دوسرے گیت پر خیام فخر کیا کرتے تھے کہ اس میں بہت ہی کم ساز استعمال کیے گئے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر نغمہ کی بنیادی نغمگی مضبوط ہو تو اسے بھاری سازوں یا بھاری آرکسٹرا کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لیے انہوں نے اپنے گیتوں میں آرکسٹرا کا استعمال زیادہ نہیں کیا۔ اس فلم کے گیتوں کی شاعری کیفی اعظمی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی۔ آشا بھوسلے اپنی ایک تحریر میں خیام کے بارے میں لکھتی ہیں کہ سازوں کے بہت کم استعمال کی وجہ سے خیام نے اس گیت کے ذریعے کاملیت اور مکمل علیحدہ شناخت کو پالیا ہے۔ 1956ء میں ڈائریکٹر رمیش سیگل نے ہٹ فلم ''پھر صبح ہوگی'' کی موسیقی کے لیے خیام سے رابطہ کیا۔ یہ فلم راجکپور اور مالا سنہا کے مرکزی کرداروں پر مشتمل تھی۔ فلم کی کہانی کا بنیادی موضوع امیر اور غریب کے درمیان پایا جانے والا فرق اور اس سے متعلقہ رویئے کا تھا جو ایک اشتراکی نظریہ پر مبنی کہانی تھی۔ کہانی کے کرداروں کا کٹھور پن اور بے بسی کو خیام نے بہت ہی موزوں اور معقول طریقے سے محسوس کیا اور مکیش کے اس گیت کے ذریعے سے ظاہر کیا۔ ''وہ صبح کبھی تو آئے گی'' اور اس کے علاوہ ''چین وعرب ہمارا'' مکیش کا گیت بھی بہت اچھا تھا لیکن آشا کا گایا ہوا یہ گیت ''دو بوندیں ساون کی'' میرا سب سے زیادہ پسندیدہ ہے اور پھر ایک اور گیت جس میں کم ساز، صرف ستار اور طبلہ استعمال کیے گئے جو مکیش اور آشا نے گایا۔ ''پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گِلہ'' اس گیت نے تو بھارتی پردۂ سیمیں کے لیے غزل کی گائیکی کا

آئندہ کے لیے ایک معیاری رجحان طے کر دیا۔

O موسیقار مدن موہن اور او۔ پی۔ نیر کی طرح موسیقار خیام نے بھی فوک میوزک کو اپنے کچھ گانوں کا base بنایا ہے۔ چند مثالیں دیجئے گا۔

☆ 1960ء کی فلم ''بمبئی کی بلی' کا یہ گیت ''رنگ رنگیلا سانورا موہے مل گئیو جمنا پار'' کا یہ خوشی کا گیت جس کی دھن اور تال میں فوک کا رنگ شامل کیا گیا تھا، بہت خوب تھا اور ''تیری دنیا میں نہیں کوئی ہمارا اپنا''۔ ایک دکھیا من کی پکار تھی۔ جو یتیم بچوں کے دل کی آہ تھی۔ جو ایک سہارے کی اپنے خدا سے ایک پکار تھی، ایک دعا تھی۔

خیام اوسط درجے کی موسیقی تخلیق کرنے پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ عام لوگوں کو موسیقی کی آگہی دینا چاہتے تھے اور جب عام لوگ ان سے ان کے فن موسیقی اور گیتوں کی شاعری کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے تو خیام یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ خیام کی زندگی سخت جدوجہد سے بھرپور تھی۔ انہیں جب کسی فلم کی موسیقی کے لیے استدعا کی جاتی تھی تو وہ اس فلم کے سکرپٹ کو پہلے دیکھتے تھے اور اس کے بعد حامی بھرتے یا انکار کرتے۔ وہ گویا سکرپٹ کے مدِنظر فلم کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ 1961ء میں انہوں نے اپنی شریکِ حیات جگجیت کور کو پنجابی فوک پر مبنی دو گیتوں کے ذریعے بطور پلے بیک سنگر کے متعارف کرایا۔ ''پھر وہی ساون آیا ساجن آئے نہ'' اور ''لڑک رے لڑک تو سے آنکھ جو لڑی''۔ پہلا گیت استاد نیاز حسین شامی کی اِس دھن ''نی سیو کونج وچھڑ گئی ڈاروں تے لبدی سجناں نوں'' پر مبنی تھا اور یہ کئی گلوکاروں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے کئی بار عوام کی سماعتوں کی نذر کیا۔ یہ گیت دراصل 1961ء میں رمیش سیگل کی فلم ''شعلہ و شبنم'' کے لیے تخلیق کیے گئے تھے لیکن جن گیتوں نے انڈین فلم میوزک میں ہلل مچادی وہ رفیع، لتا کے گائے ہوئے کیفی اعظمی کے تخلیق کردہ گیت ''جیت ہی لیں گے بازی ہم تم'' اور رفیع کا یہ گیت ''جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں''۔ رفیع کے اس گیت میں رفیع کی وسیع، کھلی اور بلند آواز کو بہت عمدگی سے استعمال کیا گیا۔ خاص طور پر کلائمکس کے لئے۔

O وہ کون سی فلم تھی جس میں خیام نے سُمن کلیانپور کی آواز بڑی خوبصورتی سے استعمال کی؟

☆ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھا تو اسی دوران میں اپنے دوست مشتاق ہاشمی کے ساتھ 1964ء میں بمبئی گیا۔ وہاں ہم نے خیام کی رہائش گاہ پر قیام کیا تھا۔ زندگی کے ان سہانے دنوں میں مجھے صرف فلمیں دیکھنے کا جنون تھا۔ انہی دنوں میں فلم ''شگون'' دیکھی جس میں وحیدہ رحمان اور کنول جیت مرکزی کردار تھے جو بعد میں حقیقی زندگی میں بھی آپس میں شریکِ حیات بن گئے۔ خیام اور لتا کے درمیان تعلقات میں لازمی طور پر کچھ کھچاؤ پیدا ہوا ہوگا جس کی وجہ سے خیام نے یہ گیت سمن کلیان پور سے گوائے۔ ''پربتوں کے پیڑوں پر'' (رفیع کے ساتھ) ''زندگی ظلم سہی'' اور ''بجھا دیئے ہیں'' (علیحدہ علیحدہ گیت) اس فلم کے تمام گیت خیام اور ساحر لدھیانوی کے اشتراک کے کمالِ فن کا نتیجہ تھے، لہٰذا اب خیام، ساحر اشتراک استوار اور مضبوط ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ لاہور ریڈیو کے ایک فرمائشی پروگرام میں یہ گیت 78 سپیڈ ریکارڈ کے ساتھ بار بار دہرائے گئے۔ میں ان دنوں میں شاہ عالمی گیٹ، لاہور کے علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔ ان دنوں میں اس علاقہ میں رات کو مکمل خاموشی اور سکون ہوا کرتا تھا اور اس پُرسکون ماحول اور فضا میں ریڈیو سے نشر ہوتے یہ گیت لوگ بہت شوق اور پسندیدگی کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ ایک اور فلم 'محبت اس کو کہتے ہیں' جس کے ستارے ششی کپور اور نندا تھے' میں رفیع اور سُمن کا دوگانہ ''ٹھہریئے ہوش میں آلوں' تو لے جایئے گا' اور سُمن کا سولو گیت 'جو ہم پہ گزرتی ہے' سوز و گداز سے بھرپور گیت تھے۔

O لتا کے گیت ''بہارو میرا جیون بھی سنوارو'' نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا تھا۔ یہ کون سی فلم تھی اور کس سچویشن پر فلمایا گیا تھا۔

☆ 1966ء میں چیتن آنند نے فلم ''آخری خط'' میں ایک تجربہ یہ کیا کہ ایک چھوٹا رینگتا ہوا بچہ اپنی ماں کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ خیام نے پہاڑی راگ کو استعمال کرتے ہوئے ایک گیت کی لازوال دھن تخلیق کی۔ یہ لتا کا گایا ہوا ان کا اپنا پسندیدہ گیت تھا، گیت کے الفاظ یہ تھے: ''بہارو میرا جیون بھی سنوارو'' فلم ''آخری خط'' ایک غیر کاروباری اور غیر معمولی پروڈکشن تھی۔ ایسی فلم صرف چیتن آنند جیسے ڈائریکٹر کے فہم وفراست کا ہی نتیجہ ہوسکتی تھی۔ انہوں نے خود ہی اس فلم کا سکرپٹ لکھا۔ یہ راجیش کھنہ کی پہلی ریلیز ہونے والی فلم تھی۔ دراصل ان کی پہلی فلم تو ''راز'' تھی لیکن یہ فلم ''آخری خط'' کے ایک سال بعد سینما کی زینت بن سکی۔ فلم کے گیت کیفی اعظمی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔ چیتن آنند نے صرف سکرپٹ کی آؤٹ لائن سے ہی فلم بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک پندرہ ماہ کے نومولود معصوم بچے کو شہر میں کھلا چھوڑ دیا۔ بچے کے پیچھے پیچھے کیمرہ اور خصوصاً دستی کیمرہ جس کے ذریعے شہر کی لوکیشن اور آوازوں کو عکس بند کیا اور جال مستری کی ڈائریکشن میں سینمائی زاویوں سے شہر کی عکس بندی کی گئی۔ اس فلم کو اگرچہ دسویں اکیڈمی ایوارڈ برائے فارن لینگویج فلم کے لیے منتخب کیا گیا لیکن اسے نامزدگی کے لیے قبول نہ کیا گیا۔ فلم کہانی کے اعتبار سے بالکل انوکھی اور منفرد تھی۔ فلم میں نوجوان سنگ تراش\ مجسمہ ساز گوند (راجیش کھنہ) کو لہو کے علاقہ میں اپنے قیام کے دوران اس کی ملاقات لاجو (اندرانی مکھر جی) سے ہوتی ہے اور گوند کو اس سے محبت ہوجاتی ہے۔ وہ دونوں گاؤں کے مندر میں خفیہ طور پر شادی کر لیتے ہیں۔ قسمت کا کرنا ایسا ہوا ہے کہ گوِند کو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر جانا پڑتا ہے۔ اسے اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ کسی بھی مخصوص خاندانی نظام کے رواج کے مطابق لاجو کی ساس اسے بطور بہو مسترد کر دیتی ہے اور اسے فروخت کر دیا جاتا ہے جہاں اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بچے کو جنم دیتی ہے جیسے بٹُو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد لاجو اپنے چھوٹے بچے کو ساتھ لیے بمبئی میں گوِند سے ملنے آتی ہے۔ گوِند سے ملاقات نہ ہونے پر وہ اس کے گھر کی سیڑھیوں پر ایک خط چھوڑ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک سالہ بچے کو بھی وہاں چھوڑنا چاہتی ہے مگر ایسا نہیں کر سکتی اور اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اِدھر اُدھر بھوکی پیاسی گھومتی رہتی ہے۔

اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بچے کو دنیا میں اکیلا چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ یہاں سے کہانی کا دلچسپ حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹے معصوم بچے کی کہانی ہے جو شہر میں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ وہ بچہ اپنے گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اسے جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، وہ کھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک گولی بھی کھا جاتا ہے جس کو کھا لینے سے وہ اونگھنا شروع کر دیتا ہے۔ جب گولی کا اثر ختم ہوتا ہے تو وہ شہر میں اور زیادہ اِدھر اُدھر پھرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں گوِند کو اپنی بیوی کے چھوڑے ہوئے آخری خط کے ذریعہ سے یہ سب معلوم ہوجاتا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ پولیس کے ذریعے اپنی بیوی اور بچے کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اسے صرف بیوی کی لاش ملتی ہے۔ وہ پولیس انسپکٹر نائیک (مینوندر اچیٹنس) کو اپنے سٹوڈیو میں رکھا ہوا مجسمہ دکھاتا ہے۔ بچے کو ایک یتیم خانے کا اہلکار بچاتا ہے لیکن بچہ رات کے وقت وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ کافی دیر اِدھر اُدھر آوارہ پھرنے کے بعد کچھ لوگوں کی مدد سے بچہ گھر پہنچتا ہے اور اپنی گمشدہ ماں کے مجسمہ کو دیکھتا ہے۔ وہ دودھ پینے کے لیے مجسمے سے لپٹ جاتا ہے۔

O کاروباری لحاظ سے خیام کی کون سی فلم سرِ فہرست ہے؟

☆ فلم ''کبھی کبھی'' کے ریلیز ہونے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیام کی سخت جدوجہد کے دن بھی گزر گئے۔ 1976ء میں

کاروباری لحاظ سے کامیاب ترین اور موسیقی کے اعتبار سے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دینے والی یہی فلم تھی۔ یہ بات خیام نے مجھ سے ایک گفتگو کے دوران بتائی کہ ان کی دو غزلوں میں ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں'' اور ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' سے متعلق ساحر نے یہ چیلنج کیا تھا کہ کوئی میوزک کمپوزر ان کی شاعری کے لمبے بحور اور معیار کے مطابق انصاف نہیں کر سکے گا لیکن خیام نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے بے حد کامیابی کے ساتھ اسے پورا کیا۔ خاص ور پر تال (ردھم) کے انداز اور شاعری اور موسیقی کی ہم آہنگ دھن کے ذریعے۔ مکیش نے ان غزلوں کو بہت شوق اور حیران کُن طریقے سے بہت خوب گایا ہے۔ یش چوپڑا کی اس فلم میں کئی اور گیت بھی ہٹ ثابت ہوئے مثلاً ''میرے گھر آئی اک ننھی پری'' (لتا) ''پیار کر لیا تو کیا'' (کشور) اگرچہ خیام فلموں کے چناؤ کے طرز عمل پر شروع ہی سے عمل پیرا رہے مگر ''کبھی کبھی'' کی کامیابی کے بعد ان کو یکے بعد دیگرے کئی فلموں میں موسیقی دینے کی دعوت دی گئی۔

O کیا فلم ''کبھی کبھی'' کے ساتھ شروع ہونے والا دَور، ان کا کامیاب ترین دَور گردانا جا سکتا ہے؟

☆ 1977ء میں فلم ''شنکر حسین'' کے لیے انہوں نے دو بہت ہی خوبصورت اور باکمال گیت دیئے۔ ایک کیف بھوپالی کا گیت ''اپنے آپ راتوں میں چلمنیں سرکتی ہیں'' اور دوسرا ''آپ یُوں فاصلوں سے گزرتے رہے۔'' یہ دونوں گیت لتا کی خوبصورت آواز کا جادو ہیں۔ یہ فلم کمال امروہی کے بیٹے تاجدار کی پروڈکشن تھی۔ ان دونوں گیتوں کی دُھنیں، رات کے پُراسرار ماحول کی بہت خوب عکاسی کرتی ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے کہ فلم کامیاب تھی یا ناکام لیکن ان گیتوں کے لازوال اور ناقابلِ فراموش ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔

O یش چوپڑا کی کئی فلموں کی کامیابی میں موسیقار خیام کی موسیقی کا بہت عمل دخل رہا ہے۔ ذرا وضاحت فرمایئے۔

☆ اس کے بعد 1978ء میں یش چوپڑا کی ایک اور فلم ''ترشول'' ریلیز ہوئی جو باکس آفس ہٹ فلم تھی۔ اس فلم کی کہانی امیتابھ کے انتقام کی کہانی ہے۔ امیتابھ وحیدہ رحمان اور سنجیو کمار کے درمیان ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بچہ ہے۔ سنجیو کمار ایک دولت مند دوسری خاتون کی خاطر، وحیدہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ایکٹنگ کے اعتبار سے بہت ہی عمدہ فلم تھی جس میں انتقام کی پُکار کو لتا نے اپنی آواز میں ڈھالا ہے۔ ''تو میرے ساتھ رہے گا مُنے'' گیت کے یہ الفاظ ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے۔ اس میں کشور کمار اور لتا کا ایک گانا ''اور کبھی قسمیں نہ توڑیں'' یہ خوبصورت گیت پنجابی لوک موسیقی پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ لتا اور کشور کا ایک اور دوگانہ ''کہتے ڈرتی ہو'' ہیما مالنی اور ششی کپور پر فلمایا گیا تھا اور رومانس کا ایک نمائندہ شاہکار تھا لیکن یسوداس، کشور کمار اور لتا منگیشکر کا گایا گیت ''محبت بڑے کام کی چیز ہے'' ایک تکرار پر مبنی گیت ہے جس میں ہیما مالنی اور ششی کپور، امیتابھ بچن کو محبت کی افادیت پر سبق دیتے نظر آتے ہیں۔ امیتابھ کا کردار ایسا ہے جس کے اندر انتقام کا زہر بھرا ہوتا ہے۔ یہ نغمہ ایک سوئمنگ پول کے اردگرد ایک پارٹی کے منظر میں خوبصورتی سے فلمایا گیا تھا۔ اس فلم کا ایک اور گیت نوجوان سچن اور پونم ڈھلون پر فلمایا گیا جو کہ لتا اور کشور کمار نے گایا اور اس کے بول تھے ''گا پو جی گا پو جی گم گم''۔ ابھی خیام کی کامیابیوں کا بول بالا ہو ہی رہا تھا کہ ایک خوبصورت دوگانے ''سمٹی ہوئی یہ گھڑیاں'' جسے محمد رفیع اور لتا نے گایا تھا، نے جنم لیا۔ یہ گیت فلم ''چنبل کی قسم'' سے تھا اور اس خوبصورت رومانوی گیت میں مشرقی ساز سنتور نے اپنے کرشمے دکھائے۔

O خیام اور یش چوپڑا کا اشتراک کب اور کیسے ختم ہوا؟

(جاری ہے)

◆◆◆

انشائیہ

غم

سلیم آغا قزلباش

غم دو طرح کے ہیں۔ جامد غم اور متحرک غم۔ اوّل الذکر کسی ایک نقطے پر ٹکے رہتے ہیں' جب کہ ثانی الذکر نقل مکانی پر مائل نظر آتے ہیں۔ تاہم مستقلاً ایک ہی نقطے پر مرتکز رہنے والا غم اپنی مقامیت کی وجہ سے اذیت ناک شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے برعکس ٹھکانہ بدلنے والا غم' مبتلائے غم کو سیّاحت کے بھرپور مواقع فراہم کرتا ہے اور یوں وہ بہت سے مقاماتِ آہ و فغاں سے گزرنے کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اصل میں عارضی نوعیت کا غم' بعض دفعہ کالی آندھی کی طرح آناً فاناً اٹھتا ہے اور فرد کا حلیہ بگاڑ کر غائب ہو جاتا ہے، لیکن مستقل ڈیرے ڈالنے والا غم ایک کائیاں دشمن کا کردار پوری دلجمعی سے ادا کرتا ہے اور اپنی اس کارگزاری کی وجہ سے مسلسل کرب کا باعث بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس طرز کا غم نرگسیت میں مبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہمہ وقت اس پر نگاہ رکھی جائے اور گھر بھر میں فقط اسی کا ذکرِ خیر ہو' اس کے سوا کسی اور کو قطعاً کوئی اہمیت نہ ملے۔ آہستہ آہستہ اس نوع کا غم ایک ضدی بچے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

دیکھنے سننے میں یہی آتا ہے کہ محبوب کی طرف سے ارسال کیا گیا غم' وصول کنندہ کا بہت من بھاتا ہے' مگر بعد ازاں جب یہ غم سوا ہو جائے اور غم کا پہاڑ میں تبدیل ہونے لگے تو اس سے چھٹکارا شادی خانہ آبادی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تاہم شادی سے فیضیاب ہونے والے' آگے چل کر جب مختلف طرح کے گھریلو اور معاشی مسائل کے گرداب میں گھر جاتے ہیں تو پھر ان پر صحیح معنوں میں اس غم کی حقیقت منکشف ہوتی ہے' لیکن تب تک واپسی کے سارے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ مگر ایک بات طے ہے کہ کچھ غم انسان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوتے ہیں' جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتے ہیں' جب کہ دوسرے بہت سے غم اس کی اپنی کارستانیوں کا ثمر ہوتے ہیں گو کہ اس معاملے میں انسان اپنی غلطیوں کو کھلے بندوں تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوتا' مگر اندر سے بخوبی جانتا ہے کہ وہ غم اس کی انہی کارستانیوں کا نتیجہ ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ غم بن بلائے مہمان کی طرح اچانک آ دھمکتے ہیں اور پریشانیوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان سے پیچھا چھڑانے کی جتنی کوشش کی جائے یہ اتنے ہی زیادہ ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اور مختلف ہتھکنڈوں کو آزماتے ہوئے اپنے قیام کو طول دینے کی سعی کرتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ ان کو برداشت کرتے کرتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر کبھی وہ اپنی موجودگی کو ظاہر کرنا کچھ دیر کے لئے موخر کر دیں تو غم کے خوگر شخص کا وہی حال ہوتا ہے جو نشہ کرنے والے کا نشہ ٹوٹنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایسی

برگزیدہ ہستیاں بھی ہوگزری ہیں' جن کے آستانوں پر طرح طرح کے دنیاوی غموں کا تریاق ڈھونڈنے کے لئے حاجت مند جوق در جوق آتے رہتے تھے،مگر یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ طاغوتی قوتیں غریب ملکوں کی اقتصادی معاونت کرنے کے لئے کچھ زیادہ ہی غم گساری کا مظاہر کرتی ہیں اور آہستہ آہستہ ان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ غم گساری کا چوگا کانٹے میں لگا کر پھانسنے کا گُر ان طاقتوی قوتوں کا ایک آزمودہ حربہ ہے اور غریب ممالک مچھلیوں کی طرح اس کے کانٹے میں اکثر پروئے جاتے ہیں۔تاہم کچھ خاص وضع کے غم..... مثلاً قوم اور غریبوں کا غم بعض پہنچی ہوئی شخصیات کے حصے میں آتے ہیں، چنانچہ وہ لاتعداد تنظیموں، انجمنوں اور فلاحی اداروں کی صدر بن جاتی ہیں، علاوہ ازیں اپنی تقریروں، تحریروں اور بین الاقوامی دوروں کے ذریعے قوم اور اس کے غریبوں کے غموں کا حل ڈھونڈنے کی کوششیں بھی کرتی ہیں۔

درد اور غم میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ غم کو بانٹا جاسکتا ہے' مگر درد ہر حال میں جھیلنا پڑتا ہے۔غم کے اظہار سے جہاں غم غلط ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں وہاں دوسروں کی شمولیت سے اس میں تنوع آجاتا ہے' یوں بھی غم جزو سے کل کی جانب مائل بہ ارتقاء ہوتا ہے۔ذاتی غم جب اجتماعی میں مُدغم ہوجائے تو اس میں آفاقیت راہ پانے لگتی ہے۔اس کے برخلاف درد ایک نسبتاً محدود دائرے میں گردش کرتا ہے اور اس کو برداشت کرنا بظاہر ہر ایک بخی معاملہ لگتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ درد کی حالت میں آپ کسی کو آسانی سے اس میں شریک نہیں کرسکتے۔اس کے چرکوں پر پھاہا آپ کو خود ہی رکھنا پڑتا ہے۔اسی طرح درد جب مزمن شکل اختیار کرلے تو ایک طرح سے ناقابلِ علاج ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں فرد چڑچڑا، غصیلا اور زندگی میں بیزار نظر آنے لگتا ہے، جب کہ غم کی بھٹی میں سے گزرنے والے بعض اوقات معرفت کے ایک اونچے مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہی نہیں غم زدہ رہنے سے فرد کے اندر فلسفۂ غم کے نت نئے ذائقوں سے روشناس ہونے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔اس کے برعکس درد ایک کال کوٹھڑی کے مانند فرد کو خارج کی روشن دنیا سے منقطع کرکے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔

عام طور پر درد کے توڑ کے لئے دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے' مگر غم کو بھلانے یا بہلانے کے لئے شاعری' موسیقی' مصوری اور رقص سے مدد لی جاتی ہے اور جب یہ چاروں فنونِ لطیفہ غم کی ترجمانی کرنے پر آمادہ ہوجائیں تو غم کی جُون تک تبدیل ہوجاتی ہے اور اس کی پھوار میں بھیگ کر اہلِ ذوق ترفع سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں۔ فی الاصل غمِ ہستی کا ادراک' غم کے تجربے میں سے گزرے بغیر ممکن نہیں ہے' لہٰذا.....غم' فرد کو ذہنی وفکر طور پر کشادہ نظر بناتا ہے اور اسے بھیتر سے پگھلا کر موم کردیتا ہے۔اس کے برعکس درد اسے تنگ نظر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر پتھر جیسی بے اعتنائی اور سنگلاخیت پیدا کردیتا ہے۔

اردو کی غزلیہ شاعری میں غم کے وجود کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ایک مضطرب شاعر اس سے معانقہ کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں اس کی شاعری میں سوز وگداز اسی غم کا مرہونِ منت ہے۔سو اگر غم کو عشق کا مترادف قرار دے دیا جائے تو پھر ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ کچھ غم حقیقی ہوتے ہیں اور کچھ مجازی' لہٰذا ان کی موجودگی کے بغیر کسی شاعر کے کلام میں پائے جانے والے شعری محاسن کو پوری طرح سے جانچا نہیں جاسکتا۔مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہماری اب تک کی ساری علمی اور سائنسی تگ وتاز کے عقب میں غم کا وجود ہی کارفرما نہیں رہا!!

◆◆◆

خاکہ

میرا ہمراز تاشی ظہیر

اظہر جاوید

کسی معروف شاعر کے بارے میں رائے دینا اور اس کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنا، آسان کام ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بہت سے مناسب لوگوں کی آرا موجود ہوتی ہیں، ان سے اقتباس نہ بھی کریں، چربہ نہ بھی کیا جائے، پھر بھی ایک مجموعی تاثر ضرور دل میں قائم ہوتا ہے۔ اب کوئی شاعر میری طرح بالکل ''گم نام'' اور غیر معروف ہو، اور اُس پر تبصرہ بھی میں پیش کروں تو کیسا لطیفہ ہوگا۔ قارئین پہلے شاعر کا نام دیکھیں گے، پھر میرا یہ مضمون پڑھیں گے، تو اچھی بھلی، معقول اور نہایت عمدہ شاعری کو بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں گے اور مجھ سے ہی پوچھیں گے تاشی ظہیر کون ہیں؟ کہاں ہیں اور اب تک سامنے کیوں نہیں آئے؟

ایک تو بندہ فطری طور پر معصوم ہو، پھر کوئی تین دہائیوں سے امریکا میں خوش حال زندگی گزار رہا ہو، شعر و ادب کے نشیب و فراز اس کی گھٹی میں پڑے ہوں تو بہت ساری الجھنوں کی کیا خبر ہو سکتی ہے، دور سے سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ جیسے ہمیں یہاں پاکستان میں بیٹھے ہوئے کنڈولیسزا رائس بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں نے ''ہم'' کا صیغہ احتیاطاً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس حسنِ ملیح کو پسند کرنے کا مجھے قطعی شوق نہیں، ہمارے بانکے سجیلے سابق وزیراعظم جناب شوکت عزیز کو وہ اچھی لگ گئی تھیں، اور انہوں نے عام محاورے کے مطابق ''لائن مارنے'' کی کوشش کی تھی، جس پر سیاہ چاول (رائس) نے اپنی کتاب میں بھد اڑا دی، کہ موصوف نے ..... GIGOLO بننے کی تمنا کی تھی۔ میں سیدھا سادہ محبِّ وطن ہوں، اپنے وزیراعظم اور اپنے محبوب صدر کے ہر فعل اور عمل کو قبول کرنا میرا پہلا فرض ہے اور وردی پوش صدر اور عالمی بینک سے بلایا ہوا وزیراعظم تو میرے دل پر ہمیشہ کے لیے اپنی تصویر نقش کر دیتا ہے۔ قوم ان کے کارناموں کو کبھی نہیں بھولتی۔

میں نے بات معصوم شاعر کی کرنا تھی۔ درمیان میں امریکا آ ٹپکا۔ یہی تُو اس عالمی قوت کا کمال ہے، جہاں چاہے یا نہ چاہے، ٹپک پڑتا ہے..... ایک تو میرا ممدوح شاعر پہلے ہی گم نام ہے، اس حوالے سے تو اور بھی بے نام ہو جائے گا، کہ امریکا کے نام کے آگے سارے نام ہیچ ہو جاتے ہیں۔

یہ شاعر، تاشی ظہیر ہے..... پہلے اس کی حالتِ زار بیان کر دوں، پھر پس منظر پیش کروں گا..... یہ نوجوان جب لاہور میں تھا، یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم کے سلسلے میں تو خاصا مشہور تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ، سلیقہ شعاری اور وضع داری کے ساتھ تحریر و تقریر میں بھی نام اور مقام رکھتا تھا۔ آج سے تین چار دہائیاں پہلے تک اوپر بیان کی گئیں خوبیاں تقریباً ہر طالب علم کا اثاثہ ہوتی تھیں۔ اب کئی برسوں سے کلاشنکوف، ماڈز راور ٹی ٹی رکھنے والا، مار کٹائی کا مظاہرہ کرنے والا، بسیں روک کر ٹیکس وصول کرنے والا طالب علم جرأت مند، اور مشہور مانا جاتا ہے۔

تب تک یہ وبا معاشرے میں بھی نہیں پھیلی تھی۔

تاشی ظہیر، اس وقت بھی سوچ میں مدحت اور احساس میں ندرت لئے شاعری کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کی فضاؤں سے اس کی آواز کی گونج ادبی حلقوں تک بھی پہنچ گئی تھی..... جب اس نے اپنی انفرادیت لاہور میں قائم کر لی، اپنا منفرد مرتبہ بنا لیا، تو پھر اسے یہ اعلان کرنے میں کوئی جھجک نہیں رہی تھی، کہ وہ برِصغیر کے ممتاز اور نامور شاعر حضرت صابر دہلوی کی اولاد (پوتے) اور نظم میں جدّت کی جوت جگانے والے جواں مرگ شاعر انوار انجم کے بھائی ہیں۔ وہ پہلے اظہار کرتا، تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ بڑے ناموں کی چھاپ لگا کر تعارف حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اور وہ امریکہ چلا گیا جہاں اُس نے بلند عہدوں پر فائز رہنے اور اب اپنا کاروبار کامیابی سے چلانے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور قلبی طور پر شعر و ادب سے رابطہ ٹوٹنے نہیں دیا..... میں نے یہ تو آپ کو بتایا ہی نہیں، کہ ایم اے وغیرہ کرنے کے بعد (یا شاید اسی دوران) وہ معروف رسالے ماہنامہ ''نورونار'' لاہور کا ایڈیٹر ہو گیا تھا..... رسالے کی مالک ممتاز خاتون کلثوم رحمٰن تھیں۔ پرچہ تو بند ہو گیا، مگر کلثوم رحمٰن اب بھی تاشی ظہیر پر حقِ ملکیت رکھتی ہیں، کہ وہ ان کی ساس بن چکی ہیں۔ ناہید رحمٰن (بیگم تاشی) کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر تاشی کے پلّے پڑ کر انہوں نے یہ ''فالتو'' کام بھی اسی کے سپرد کر دیا اور خود بے فکر ہو کر امریکن یونیورسٹی میں پڑھانے لگ گئیں کہ یہ ''کارآمد'' ہے۔

تاشی ظہیر نے اس سارے عرصے میں شعری حلقوں سے ناتا توڑے رکھا مگر شاعری اور مطالعے سے خود کو سیراب کرتا رہا..... ملازمت سے جب نجات ملی، (چاہے کتنا ہی بڑا عہدہ کیوں نہ ہو) اور سر اٹھانے اور زندگی سے دل لگانے کا موقع ملا تو اس نے تقریبات کا ڈول ڈالا۔ وہ جو اس کا بچپن اور نوعمری کا شہر ملتان ہے، جہاں وہ اردو اکادمی میں سیکھنے اور جاننے کے لئے جاتا تھا، اس نے اسے امریکا میں زندہ رکھا اور مشاعرے، سیمینار اور موسیقی کے پروگرام کرنا شروع کر دیئے۔ یوں اس کی شاعری کو جلا اور زندگی کو نئی ردا مل گئی۔

صابر دہلوی صاحب کے ہاں پاک و ہند کے بڑے بڑے شاعر نیاز حاصل کرنے اور سر جھکانے آتے تھے۔ جمیل الدین عالی، اس سے انکار نہیں کر سکتے، یہ تاشی ظہیر خود ہی بیان کرے تو اچھا ہے، لیکن اُس وقت تاشی ابھی کم عمر تھا، وہ اپنے جیب خرچ سے بچوں کا رسالہ، خود لکھ کر، خود ترتیب دے کر تقسیم کرنے لگا تھا، یہ بات صابر دہلوی کو ناپسند تھی کہ ان کے بچے پڑھنے کی بجائے شاعری کے ''مشغلے'' میں پڑ جائیں۔ ایک دو بار کان بھی کھینچے گئے۔ کیا کریں، چشمے نے تو پھوٹنا ہی ہوتا ہے۔

انوار انجم بھری جوانی میں انتقال کر گیا۔ اس وقت تاشی بہت چھوٹا تھا..... لیکن جینز میں صابر دہلوی کی تمازت اور انوار انجم کی حرارت تو رواں تھی۔ میں ابھی، اس کا کچھ کلام پیش کرتا ہوں، کوئی نک چڑھا نقاد اور کوئی کڑی سے کڑی تنقید بھی اس میں سے عیب نہیں نکال سکتی، جہاں اُس کے افکار میں صابر دہلوی کا کلاسیکی رچاؤ ہے، وہیں انوار انجم کا جدید بھاؤ بھی ہے۔ تاشی ظہیر نے غزل کو یوں نکھارا ہے اور نظم میں ایسا بانکپن پیدا کیا ہے، کہ میرے ایسے رشک کرنے لگتے تھے۔ فیضؔ کی نذر اس نے جو نظم کی، اس کی لفظیات (ڈکشن) دیکھیں، تو یقین آ جاتا ہے کہ اس نے فیض کو پڑھا ہی نہیں خوب ہضم بھی کیا ہے، اس کا لہجہ ویسا ہی ہے مگر اسلوب اپنا ہے۔

گلشنِ یاد میں پھر آج مہک ہے تیری　　اک تمنا کہ کھلی ہے سرِ گلشن پھر سے

.....

ڈھونڈتی پھرتی ہے ہر سُو ترے الفاظ کے پھول　　تیری الفت تری چاہت، تری آواز کے پھول

اور یہ نظم اسی حسن اور سلاست سے اختتام تک چلتی ہے۔ایک دوسری نظم کے ابتدائی مصرعے دیکھیں۔

اداس لہجوں کی اس زمیں میں
میں بیج بوتا ہوں آرزو کے
نئے ارادوں کی جستجو کے
نئی امنگوں کی آبرو کے
اُگے گی جب فصل راستی کی
تو اس کے سرسبز بازوؤں میں نئے عزائم کی کونپلوں سے
کھلیں گے مہتاب روشنی کے
نئی امنگوں کی دھوپ ہوگی
نئے ارادوں کے خواب ہوں گے

اس مچلتی ہوئی نظم کا عنوان ہے ''نئی آنکھ، پرانا خواب'' اور دو چار اور مصرعوں کے بعد، نظم کا انجام یہ ہے۔

رہے تھے جو میر کارواں کے
وہ سب کے سب بے نقاب ہوں گے

ہم پاکستانیوں کی یہی بدنصیبی ہے کہ ہم غیر ممالک (خصوصاً امریکا) میں جتنے بھی سکھی ہوں، ہماری روحیں پاکستان ہی میں بستی ہیں، بلکہ وہاں بیٹھے لوگوں کی روحیں زیادہ تڑپتی اور سسکتی ہیں۔ہم سب بھی یہی چاہتے (اور سوچتے) ہیں، کہ میر کارواں بے نقاب ہوں، المیہ یہ ہے کہ انہوں نے نقاب نہیں مکھوٹے پہن رکھے ہیں، اور بے نقاب ہو کر بھی بے نقاب نہیں ہوتے، انہیں بے نقاب کرنے والے خود انہی سے مکھوٹے لے کر پہن لیتے ہیں، اور انہی جیسے ہو جاتے ہیں، شاعر، دانش ور، مسلسل اسی عذاب میں لگے رہتے ہیں۔بقول فیضؔ :

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے　　فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

دردمندی، وطن پرستی اور روشن ضمیری کی جھلکیاں تاشی ظہیر کی غزلوں میں بھی ملتی ہیں۔کہیں کہیں جو ''محبوبہ'' عکس دیتی ہے، اب اُس کا بھانڈا کیا پھوڑنا.....میں سیکنڈل بنا کر اُسے بدنام اور خود کو مشہور نہیں کرنا چاہتا۔ہم دونوں کو گم نامی ہی بھلی.....غزلوں کے شعر دیکھیں:

داسنِ دل سے کوئی درد چرا کر لے جائے　　یا کوئی موج، بدن میرا بہا کر لے جائے
منزلیں دور بہت، راستے تاریک بہت　　ہے جو سورج کوئی ماتھے پہ سجا کے لے جائے

.....

جھوٹ پہ سچ کا لبادہ نہیں دیکھا جاتا　　ہم سے کردار کا سودا نہیں دیکھا جاتا
روشنی گر نہیں باقی تو بجھا دو آنکھیں　　اپنے آنگن میں اندھیرا نہیں دیکھا جاتا

.....

گاؤں کے پنچھی شہر میں آ کے رستا بھول گئے　　گھر جانے کا سمے جب آیا اڑنا بھول گئے
اچھے وقتوں نے ہم کو کچھ ایسا گھیر لیا　　لوگوں کے دُکھ درد میں تاشی جلنا بھول گئے

غزلوں کے 'ٹوٹے' تو میں نے چلا دیئے، آپ پوری فلم کتاب کی صورت میں ملاحظہ کیجئے۔ وہ کتاب جو میں نے ترلے کر کر کے اسے چھپوانے پر آمادہ کیا ہے۔ اس کے چھپنے تک بھی مختلف مراحل آئے۔ اب کیا مسائل درپیش ہیں، رب جانے، کہ خود تاشی ظہیر کو بھی نہیں پتا، کہ اس کا مسودہ کس حال میں ہے۔ جیسے اختر شیرانی نے کہا تھا۔

.....کس حال میں ہیں یارانِ وطن

اسے یقین ہے (اگر چہ اس کے یقین کو بہت دفعہ دھچکا لگ چکا ہے) کہ اب کے اس کے بہت اپنے اس کی کتاب (مجموعہ کلام) چھاپ.....ہی دیں گے۔ میرا ہمراز میرا یار جانی تاشی ظہیر۔ میری دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہیں۔ خدا کرے مقبول بھی ہوتی رہیں۔

(اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے دستیاب ہوا)

◆◆◆

تین گذارشات

1- تمام تخلیق کاروں سے گذارش کی جاتی ہے کہ وہ ادارہ ''تخلیق'' کو بھجوانے والی تحریر کسی اور پرچے کو روانہ نہ کریں۔ پرچہ کی ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر رہ جانے والی تحریروں کو کمپوز کروا کے اگلے پرچوں کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ درخواست یہ بھی ہے کہ مختصر تحریر ارسال کریں تا کہ زیادہ لوگوں کو نمائندگی کا حق مل سکے۔

2- ادارہ ''تخلیق'' اعزازی طور پر کام کرنے والوں کی ایک مشاورتی ٹیم بنانا چاہتا ہے جو اپنی تمام ذاتی خواہشات کو پسِ پردہ رکھ کر ماہنامہ ''تخلیق'' کے پھیلاؤ اور بہتری کے لئے کام کر سکیں۔ ان تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی اعزازی خدمات دینے کے لئے ذاتی خط لکھ کر اس نیک کام کی رضامندی سے مطلع فرمائیں۔

3- ادارہ ''تخلیق'' تمام خریداروں اور اعزازی کاپی حاصل کرنے والوں سے گزارش کرتا ہے کہ وہ پرچہ ڈاک سے وصول ہونے کی اطلاع فوری طور پر ادارہ ''تخلیق'' کو دیں۔ تخلیق ہر دو ماہ کے بعد تیسرا ماہ شروع ہوتے ہی پہلی تاریخوں میں 5 سے 7 تاریخ تک پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔ 15 تاریخ کے بعد مطلع کر کے پرچہ دوبارہ طلب کرنے پر ادارہ پرچہ بھجوانے کا پابند نہیں ہوگا۔

ادب کے اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنا ہم سب کا نصب العین ہونا چاہیے۔ آمین!　　(ادارہ ''تخلیق'')

یادیں

عاشقی صبر طلب

(2001-2013ء)

.....4.....

رشید امجد

پاکستان کے عام لوگ انتہا پسند مذہبی نہیں۔ وہ اس روشن خیال اسلام کے پیروکار ہیں جس نے احترام انسانیت، یگانگت اور اخوت کا درس دیا ہے۔ لیکن چند انتہا پسندوں کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستانیوں کا امیج اتنا خراب ہو گیا ہے کہ ہر پاکستانی کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ بھارت میں اس سے زیادہ انتہا پسندی ہے اور مذہب کے نام پر وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے نہیں۔ امن کی آشا کرنے والے یہ نکتہ نہیں سمجھتے کہ جب انتہا پسند ہندو مسلمانوں کے وجود ہی کو قبول نہیں کرتے تو امن کی یہ آشا محض لفظی نہیں تو کیا ہے۔ بھارت کا حال یہ ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کے رہائشی علاقوں میں گھر تک کرائے پر نہیں لے سکتے۔ شبانہ اعظمی نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا کہ بھارت کے لئے تمام تر وفاداری اور نیک نامی کے باوجود وہ ممبئی کے پوش ایریا میں فلیٹ نہیں خرید سکتیں۔ فخر زمان کی بیگم ڈاکٹر فاطمہ حسین نے مجھے بتایا کہ دہلی کے اچھے علاقوں میں مسلمانوں کو کوئی گھر نہیں دیتا، نہ کرائے پر نہ خریدنے کے لئے۔ چنانچہ بھارت کے مسلمان وسائل کے باوجود درمیانے درجے کے علاقوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ مسلمان بچے بہت اچھے سکولوں میں پڑھنے سے گریز کرتے ہیں کہ ان کے ساتھی بچے ہر وقت انہیں طعنے دیتے ہیں۔ کوئی واقعہ ہو جائے تو مسلمان بچے کئی کئی دن سکول نہیں جاتے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں بھارت کا امیج ایک روشن خیال ملک کا ہے۔ اس میں ان کے سفارت خانوں کا بڑا دخل ہے۔ ہمارے سفارت کار زیادہ تر سیاسی بنیادوں پر تعین ہوتے ہیں۔ کئی تو سفارت کاری کے فن و آداب سے ہی واقف نہیں۔ یہی حال ہمارے ان اداروں کا ہے جن کی شاخیں غیر ممالک میں ہیں۔ میں دبئی میں تھا اور واپسی کے ٹکٹ میں کچھ تبدیلی کرانا چاہتا تھا۔ میرے ہم زلف ہارون الرشید نے کہا کہ پی آئی اے کا منیجر دوست ہے، چل کر تبدیلی کرا لیتے ہیں۔ دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت موجود نہیں۔ دوسرے اور دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ پتہ چلا کہ موصوف یہاں کاروبار کر رہے ہیں۔ سیالکوٹ سے چمڑے کا سامان منگواتے ہیں اور دبئی میں سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ اپنے دفتر میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ یہی حال کئی سفارت کاروں کا ہے کہ وہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ سفارت کاری ثانوی ہو جاتی ہے۔ سیاسی بنیادوں پر ہونے والی یہ تقرریاں ایک قسم کی رشوت ہے جو اپنے دوستوں کو دی جاتی ہے یا پھر ریٹائرڈ جرنیل نوازے جاتے ہیں، جنہیں سفارت کاری کی الف ب بھی نہیں آتی۔

پاکستان میں نظام تعلیم کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ نچلی سطح پر اس کے لئے کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ مفت تعلیم اور مفت کتابوں کے

دعوے کا غذی ہیں۔اس کی وجہ سے مذہبی مدرسوں کو فروغ ہوا ہے، جہاں تعلیم اور ہوسٹل مفت ہے۔غریب لوگ اپنے بچوں خصوصاً بچیوں کی تعلیم کیلئے ان مدرسوں کے جال میں جا پھنستے ہیں، جہاں انہیں جہادی بنا دیا جاتا ہے۔سلام آباد کی لال مسجد کا مدرسہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔اس مدرسے کے منتظمین نے پہلے تو ایک پلاٹ پر قبضہ کر کے عمارت بنائی، سی ڈی اے چپ رہا، پھر ایک لائبریری پر قبضہ کر لیا، اس پر بھی انتظامیہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔اس کے بعد مدرسہ والوں نے اپنے تئیں اسلام آباد میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کر دیا، اس پر بھی زبانی بیانوں کے سوا کوئی حکومتی ردعمل سامنے نہیں آیا۔مدرسے کے لڑکے اور لڑکیوں نے لوگوں کو سزائیں دینا شروع کر دیں تو بھی بات بیان بازی اور لفظی تنبیہ تک ہی رہی۔لیکن جب معلوم ہوا کہ کچھ غیر ملکی انتہا پسند وہاں مقیم ہیں تو اب حکومت کی آنکھ کھلی۔ان دنوں میں نمل میں تھا اور آئی ایس پی آر کے ایک کرنل میرے پاس اکثر آتے تھے۔وہ پرائیویٹ ایم اے اردو کر رہے تھے۔ایک دن انہوں نے دس بجے میرے پاس آنا تھا۔ایک بج گیا، میں گھر جانے کیلئے نکلنے لگا کہ ان کا فون آ گیا کہ دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔میں رک گیا۔آئے تو میں نے کہا ''آپ نے تو دس بجے آنا تھا''۔

بولے ''ساری رات ایک میٹنگ میں رہا''۔

میں نے پوچھا ''خیریت تھی؟''

کہنے لگے ''ایوان صدر میں میٹنگ تھی کہ لال مسجد پر فوجی آپریشن کیا جائے۔جنرل مشرف صدارت کر رہے تھے۔میری وجہ سے آپریشن ملتوی ہو گیا''۔

میں نے استفساری نظروں سے دیکھا تو بولے ''بہت سے لوگ آپریشن کے حق میں تھے۔میں نے جنرل صاحب سے کہا کہ مولوی تو ہمیشہ اپنی قیمت رکھتے ہیں۔انہیں اگر یہ قیمت دے دی جائے تو آپریشن کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔'' میں ہنس پڑا اور کہا ''کرنل صاحب! آپ بڑے بھولے ہیں، میں آپ کی جگہ ہوتا تو جنرل صاحب کو فوراً آپریشن کا مشورہ دیتا۔'' انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''جناب عالی! وہ دن گئے جب مولوی کی قیمت حلوے کی ایک پلیٹ ہوتی تھی۔اب مولوی کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ الٹا آپ کو خرید سکتا ہے۔اب وہ حکومت میں اپنا حصہ مانگتا ہے''۔

مشہور ہے کہ حکومت نے بیت اللہ محسود سے بات کرنے کی کوشش کی اور اسے ایک بڑی رقم کی پیشکش بھی کی۔پیغام سن کر بیت اللہ محسود ہنس پڑا اور کہنے لگا، یہ رقم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔میرے پاس اتنے ڈالر ہیں کہ میں کئی سالوں تک پاکستان کا سالانہ بجٹ چلا سکتا ہوں۔میں اقتدار چاہتا ہوں۔سنا ہے امریکیوں، اسرائیلیوں اور بھارتیوں نے اسے شہ دی تھی کہ وہ فاٹا کے علاقے پر قبضہ کر کے اپنی علیحدہ مملکت قائم کر کے خلیفۃ المومنین کا لقب اختیار کر لے۔اس کے لئے پاکستان کے چند لاکھ یا کروڑ کیا معنی رکھتے تھے۔

پاکستان کی عمومی صورتحال کی خرابی کی ذمہ دار مذہبی جماعتیں ہیں جو اب باقاعدہ سیاست کرتی ہیں۔ایجنسیوں کی پیداوار یہ جماعتیں ترازو کے وزن کو خراب کرنے کا مجرب نسخہ ہیں۔ایم کیو ایم بھی ایجنسیوں کی پیدا کردہ ہے اور اس سے بھی یہی کام لیا جاتا ہے۔لیکن یہ ضرور ہے کہ ایم کیو ایم نے تعلیمی میدان میں روشن خیالی کی کبھی مخالفت نہیں کی۔اس کے ماننے والوں کی اکثریت درمیانے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور ان کے پاس ترقی کا واحد راستہ تعلیم ہے۔سب سے زیادہ ظلم مذہبی جماعت نے کیا ہے۔تالاب میں بند یہ جماعتیں ہر منظر نامے کو اپنی عینک سے آگے دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ان کا سب سے بڑا ہتھیار پروپیگنڈا ہے جس کے زور پر جسے چاہیں غدار بنا

دیں جسے چاہیں اسلام قرار دے دیں۔ طالبان کے ساتھ ان کے گہرے روابط ہیں۔ اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ طالبان کون ہیں۔ ان میں بے شمار غیر مسلم بھی ہیں جو اسلامی نظام کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ فاٹا اور سوات میں پکڑے جانے والے کئی طالبان مسلمان نہیں تھے۔ یہ منشیات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ پاکستان کا اصل حکمران کون ہے؟ عوام یا بالا دست چھوٹا سا طبقہ۔ یہ چھوٹا سا بالا دست طبقہ اسٹیبلشمنٹ کا پروردہ ہے سو اصل حکمران فوج ہے۔ سکندر مرزا کے زمانے سے جو فوجی مداخلت شروع ہوئی تھی وہ اب ایک منظم صورت اختیار کر گئی ہے اور فوج باقاعدہ ایک سیاسی جماعت ہے جس کے پاس قوت بھی ہے چنانچہ کبھی مارشل لاؤں کی صورت میں ظاہرا اور کبھی سویلین حکومت میں پردے کے پیچھے سے اصل حکمرانی فوج کرتی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی سویلین حکومت بنیادی فیصلے نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے کہ صرف پنجاب پاکستان کا نام لیتا ہے۔ وہاں بھی سرائیکی تحریک موجود ہے۔ سرحد ہر وقت طالبان کی زد میں ہے۔ سوات پر ایک عرصہ تک ان کی عملی حکمرانی رہی ہے۔ پاکستانی فوج شاید اب بھی کچھ نہ کرتی لیکن صورت یہ ہوئی کہ سوات سے طالبان شاہراہ ریشم کا رخ کرنے لگے۔ سنا ہے اس پر چین نے فوج کو خبردار کیا اور مجبورا آپریشن کرنا پڑا۔ سوات میں طالبان کا قبضہ بھی عجیب وغریب کہانیاں لئے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک دن کامران سرفراز بیگ سے، جو نصاب کمیٹی میں ہمارے ساتھ تھے اور سوات کے رہنے والے تھے، پوچھا، یہ مسئلہ ہے کیا؟

اس نے کہا، آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، خود ہی سمجھ لیں۔

کہنے لگے، ''ایک صاحب کی تقرری سوات میں ہوئی۔ اسے ایک چوکی کا چارج دیا گیا۔ دوسرے دن ہی اسے پیغام ملا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت کے درمیان چوکی خالی کر دی جائے، اس دوران اس پر فائرنگ ہو سکتی ہے۔ چوکی خالی کر دی گئی۔ دو تین دن بعد اسی طرح کا پیغام دوبارہ ملا، چنانچہ اس دن بھی چوکی خالی کر دی گئی۔ دونوں دفعہ مقررہ وقت پر خوب فائرنگ ہوئی۔ تیسری دفعہ اسی طرح کا پیغام ملا تو ان صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے چوکی تو خالی کر دی لیکن ذرا فاصلے پر مورچہ لگا کر بیٹھ گئے۔ فائرنگ سامنے کی پہاڑی سے ہوتی تھی۔ فائرنگ شروع ہوئی تو ادھر والوں نے گن فائر کئے۔ چند لمحوں بعد دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ جا کر دیکھا تو سی مرغ والا معاملہ پایا''۔

یہ آپریشن سے پہلے کی صورت حال ہے جو ظاہر ہے پیدا کردہ تھی لیکن جب بڑا آپریشن شروع ہوا تو طالبان بھاگنے لگے یا مارے گئے۔ ان کا لیڈر فضل اللہ آرام سے نکل گیا۔ لاقانونیت اور تعصب کی سب سے بدتر صورت بلوچستان میں ہے، جہاں غیر بلوچیوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ ان میں وہ اساتذہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں علم کی روشنی پھیلانے میں صرف کر دی۔ اب یہ حال ہے کہ بسوں اور گاڑیوں کو روک کر لوگوں کے شناختی کارڈ چیک کئے جاتے ہیں۔ پنجاب کے شناختی کارڈ والوں کو نیچے اتار لیا جاتا ہے اور سڑک کے کنارے قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دی جاتی ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا المیہ بدانتظامی ہے۔ گڈ گورنس کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حالی نے کہا تھا کہ برائی اوپر سے نیچے آتی ہے۔ پاکستان میں یہی ہوا ہے۔ اوپر والا طبقہ خود کو کسی بھی قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔ تقریبا پانچ چھے سو خاندان کے تین چار ہزار لوگ، فوج اور بیوروکریسی اصل طاقت کے مالک ہیں۔ اب دادا کی جگہ پوتے نے لے لی ہے۔ ساری سیاست اور اسمبلی انہی کے تابع ہے۔

مشرف دور میں اسمبلی میں خواتین کی نامزد نشستوں کی تعداد بڑھائی گئی تو انہی خاندان کی خواتین نامزد ہوئیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کی طرف سے بھی جماعت کے سربراہ قاضی حسین احمد کی بیگم اور بیٹی کو نامزد کیا گیا۔ میں نے اپنے ایک جماعت دوست سے کہا، ''یار! باقیوں کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی بیٹیاں، بھانجیاں، بہوئیں اور بہنیں نامزد ہوئی ہیں، جماعت تو ایک نظریاتی پارٹی ہے، جماعت کی

کوئی دوسری رکن اس قابل نہ تھی کہ اسے نامزد کیا جاتا؟''

اس نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔

دراصل پاکستانی سیاست پر ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' کی اصطلاح پوری اترتی ہے۔اس صورت حال سے فوجی افسر اور اعلیٰ بیوروکریسی پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔فوج کا نام لیں تو اس سے مراد عام فوجی نہیں، صرف جرنیل ہیں۔فوج میں بیوروکریسی بریگیڈیئر سے شروع ہوتی ہے۔عام سپاہی اور جونیئر آفیسر تو بھوکے مرتے ہیں۔انہیں نہ ریٹائرمنٹ کے بعد مکان ملنے کی سہولت ہے نہ کوئی پلاٹ ملتا ہے۔ جرنیلوں نے تو اب بزنس شروع کر دیئے ہیں۔گذشتہ سال میں فیصل آباد گیا تو جی سی یونیورسٹی کی میٹنگ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر پروین کلو کے ایک عزیز کے ساتھ کپڑے والے بازار چلا گیا۔الرجی کی وجہ سے میں گرمیوں میں کلف لگی قمیض نہیں پہن سکتا۔عام کاٹن کی استری نہیں رہتی، مجھے ایسی کاٹن کی تلاش تھی جس میں تھوڑا سا پولیسٹر بھی ہو۔ایک دکان پر، جو پروین کے عزیز کا جاننے والا تھا، ایک سوٹ مل گیا۔ میرے ساتھی نے تعارف کرایا تو دوکاندار نے چائے منگوالی۔ میں نے اپنی ضرورت بتائی تو کہنے لگے، یہ ترکی کاٹن آئی ہے، آپ کے مطلب کی ہے۔ بہت عمدہ اور ملائم کاٹن تھی لیکن صرف دو ڈیزائن تھے، وہ بھی دھاری دار۔ میں نے کہا، میں استاد ہوں، اس طرح کا شوخ کپڑا نہیں پہن سکتا۔لیکن کوئی شک نہیں کہ یہ کاٹن بہت عمدہ ہے۔بولے ''سستی بھی ہے، اس کاٹن نے تو ہماری صنعت کو برباد کر دیا ہے''۔

میں نے استفسار سے دیکھا تو کہنے لگے ''ہماری کاٹن مہنگی پڑتی ہے، یہ سستی ہے جس کی وجہ سے ہماری کاٹن کی صنعت بری طرح متاثر ہوئی ہے''۔

میں نے کہا، ''تو منگواتے کیوں ہیں؟''

بولے ''جرنیلوں کو کسی طرح پتہ چل گیا۔انہوں نے اپنے بیٹوں، دامادوں اور دیگر رشتہ داروں کے نام پر امپورٹ پرمٹ لائسنس بنا لئے ہیں اور پوری مارکیٹ ان سے بھر دی''۔

پاکستان کے تمام وسائل ان چند ہزار لوگوں کے تصرف میں ہیں۔قوت، دولت اور حکمرانی سب کچھ ان کے پاس ہے اور یہ ایسے بے رحم لوگ ہیں کہ نچلے طبقوں کو زندہ رہنے کے لئے معمولی سا حصہ بھی دینے کیلئے تیار نہیں۔طبقات دنیا کے ہر ملک میں ہیں، اور اوپر والا طبقہ لوٹ کھسوٹ بھی کرتا ہے لیکن روپے میں سے چار آنے نچلے طبقوں کے لئے بھی چھوڑ دیتا ہے، لیکن ہمارا اوپر والا طبقہ ایک آنہ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔صنعت کار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مزدور کو اتنا ضرور دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور اس کی مشین چلاتا رہے۔جاگیردار کا بھی یہی حال ہے، لیکن ہمارا اوپر والا طبقہ ان چوہوں کی طرح ہے جو بھوک سے ستائے ہوئے ایک گودام میں گھس گئے۔پہلے پیٹ بھرا، پھر مستی میں آ کر بوریاں کترنے لگے اور پھر گرتی ہوئی گندم کے نیچے مر گیا۔قانون کی علمداری میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی طبقہ ہے۔ پولیس کو جرأت نہیں کہ ان کی گاڑیوں کے کالے شیشے اتروالے، غلط ڈرائیونگ یا پارکنگ یا چالان کر دے۔ان کی بیگمات کئی بار ایسی گستاخی کرنے والے پولیس والوں کو تھپڑ تک مار چکی ہیں۔ان کے پالے ہوئے بدمعاش دندناتے پھرتے ہیں۔

کسی معاشرے میں چار طرح کے خوف ہوتے ہیں۔اول قانون کا خوف، دوسرے معاشرے کا ڈر یا دباؤ، تیسرے ضمیر کا خوف اور چوتھا خدا کا خوف۔ ہمارے معاشرے سے یہ چاروں خوف ختم ہو چکے ہیں۔قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔ پہلے تو پولیس ہی پیسے لے کر چھوڑ دیتی ہے، ایف آئی آر ہی درج نہیں ہوتی۔ایک کارپینٹر میرا جاننے والا تھا، گھر کا کوئی کام ہوتا تو میں اسے فون کر دیتا۔ایک دو

دوروازے ٹھیک نہیں تھے،فون کیا تو آ گیا۔ میں نے حال احوال پوچھا تو بولا، پچھلے دنوں سخت پریشان رہا ہوں۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا ''میں نے ایک سکینڈ ہینڈ گاڑی خریدی تھی۔ پورچ تو تھا نہیں، گلی میں کھڑی کرتا تھا۔ ایک دن گاڑی چوری ہوگئی۔ میں تھانے پہنچا کہ رپورٹ درج کراؤں، کیونکہ آج کل اس طرح کی گاڑیاں تخریب کاری کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ تھانیدار نے کہا کہ پہلے تو ثابت کرو کہ یہ گاڑی تمہاری ہے، پھر بتاؤ کہ کس نے چوری کی ہے۔ میں نے کہا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کس نے چوری کی ہے تو خود میں برآمد کرا لیتا، مجھے کیا معلوم؟ تھانیدار نے ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا۔ میرا برا حال کہ ایف آئی آر درج نہ ہوئی اور اس دوران گاڑی کہیں پکڑی گئی تو مجھے دھر لیا جائے گا۔ تھانے کے ایک محرر نے کہا کہ دس ہزار روپے دو، ابھی ایف آئی آر درج کر لیتے ہیں۔ میں دیہاڑی دار مزدور دس ہزار کہاں سے لاتا۔ مجبوراً ایک دوست کے کہنے پر ایس ایس پی آفس چلا گیا اور درخواست دی۔ ایف آئی آر تو درج ہوگئی لیکن آئے دن تھانیدار تھانے بلا کر الٹے سیدھے سوال کرتا ہے۔ میری دیہاڑی ٹوٹ جاتی ہے۔'' پولیس پرچہ درج بھی کر لے تو مجسٹریٹ پیسے لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ کئی وکیلوں کا تو اب کاروبار ہی یہی ہے کہ مقدمہ لڑنے کی بجائے جج سے معاملات طے کرا دیتے ہیں۔ سو قانون کا کوئی خوف نہیں۔

رہ گیا معاشرے کا خوف، تو سب یہی کچھ کر رہے ہیں اس لئے کوئی کسی کو نہیں ٹوک سکتا۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ اس خوف سے کچھ نہیں کرتے تھے کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ اب حمام میں سب ننگے ہیں اس لئے معاشرے کا خوف بھی بے معنی ہوگیا۔ ضمیر کی جہاں تک بات ہے وہ مدت ہوئی بے نام یعنی بے ضمیر ہوگیا ہے۔ خدا کا خوف بھی باقی نہیں رہا، تو پھر کون سا پانچواں خوف ہے جو برائی سے روکے۔ ایسے ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کہانی لگتے ہیں۔ تھرمیں کوئلے کی کانوں پر اس لئے کام نہیں ہوسکتا کہ بعض بڑوں کے مفاد میں نہیں۔ بجلی کا بحران اتنی شدت اختیار کر گیا ہے کہ صنعتیں بند ہونے لگی ہیں۔ مزدور بیکار ہو رہے ہیں۔ صنعت کار کہتے ہیں ہمیں اپنی بجلی خود پیدا کرنے دیں، لیکن یہ واپڈا کے مراعت یافتہ بڑے حکام کے فائدے میں نہیں۔ پاکستان معدنی دولت سے مالا مال ہے لیکن مفادات انہیں نکالنے نہیں دیتے۔ ایک صاحب نے جو ماحولیات کے محکمہ میں ہیں، بتایا کہ اسلام آباد کی بیلٹ میں تیل کے ایک بڑے ذخیرے کا پتہ چلا ہے۔ ایک غیر ملکی کمپنی کو ابتدائی کھدائی کا ٹھیکہ دیا گیا۔ یہ ٹھیکہ پٹرولیم کی وزارت نے دیا لیکن قانون کے مطابق محکمہ ماحولیات سے این او سی لینا ضروری ہوتا ہے چنانچہ متعلقہ کمپنی نے رابطہ کیا۔ ٹیم کے ساتھ معائنہ کرنے گیا۔ کمپنی کے آفیسر نے بتایا کہ اسلام آباد سے ہزارہ تک اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ پاکستان سعودی عرب بن سکتا ہے۔ ٹیم نے آ کر مثبت رپوٹ دی۔ رپورٹ تیار ہو رہی تھی کہ محکمہ ماحولیات کا ڈی جی وزیر کے ساتھ کراچی کے دورے پر گیا۔ این او سی دستخطوں کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ کراچی سے ڈی جی کا فون آیا کہ این او سی جاری نہیں کرنا، میرے آنے کا انتظار کرو۔ تیسرے دن ڈی جی نے واپس آ کر بتایا کہ میں نے باتوں باتوں میں اس منصوبے کا ذکر وزیر صاحب سے کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ این او سی روک لو اور کمپنی کے نمائندے کو میرے پاس بھیجو۔ ہفتہ گزر گیا، کمپنی کا نمائندہ آیا اور کہا کہ ان کا لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے، اگر این او سی نہ ملا تو وہ اپنی رگیں یہاں سے لے جائیں گے اور جتنی کھدائی ہو چکی ہے اسے بند کر دیں گے۔ پوچھا۔ وزیر صاحب سے آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نمائندہ بولا ''وہ پانچ کروڑ رشوت کے مانگتے ہیں، جو کمپنی دینے کے لئے تیار نہیں''۔

کافی دنوں بعد میں نے ان صاحب سے پوچھا ''کیا ہوا اس پروجیکٹ کا؟''

بولا ''بند ہوگیا، کمپنی اپنا سامان سمیٹ کر لے گئی''۔

اگر اسلام آباد سے اتنا تیل نکل آتا تو پاکستان کی قسمت بدل جاتی۔ بلوچستان کا یہی حال ہے، سرحد میں کئی قیمتی معدنیات منتظر

ہیں، لیکن شخصی اور گروہی مفادات آڑے آرہے ہیں۔ یہ طبقہ نہ صرف یہ کہ ملکی وسائل کو بڑھنے نہیں دے رہا بلکہ موجود وسائل کو لوٹ رہا ہے۔ ایک ایک سیکرٹری اور وزیر کے پاس دس دس سرکاری گاڑیاں ہیں جو ایک حوالے سے غریب عوام کے خون سے چل رہی ہیں۔

کسی ایک شخص یا جماعت کے بس میں نہیں کہ اس نظام کو ٹھیک کر دے۔ کوئی شخص کوشش کرے گا تو راتوں رات مروا دیا جائے گا۔ جماعت اس لئے نہیں کر سکتی کہ ہر جماعت جاگیرداروں، وڈیروں، صنعت کاروں، ریٹائرڈ جرنیلوں اور ریٹائرڈ بیوروکریسی پر مشتمل ہے۔ ایک آدھ ٹھیک شخص آ بھی جائے تو اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے کہ درکان نمک رفت ہر شے نمک شد۔ نیب اور اس طرح کے دوسرے ادارے گندے ساتھیوں کو سبق سکھانے کیلئے ہیں۔ پہلے تو ایسے لوگوں کے خلاف کچھ ہوتا ہی نہیں، اب اگر سپریم کورٹ کچھ کرنا بھی چاہتی ہے تو آگے عمل نہیں ہوتا۔ اقربا پروری کی یہ صورت ہے کہ نااہل پسندیدہ لوگوں کو بڑے بڑے اداروں کا سربراہ مقرر کیا جاتا ہے۔ دبئی کے ایک نائٹ کلب کے میٹرک پاس شخص کو نیشنل انشورنس کمپنی کا سربراہ بنا دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے اس کے فراڈ کا نوٹس لیا تو نیب اس لئے اسے پکڑنے میں ناکام رہی کہ اس نے ایک وزیر کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی اور سپریم کورٹ کی واضح ہدایات کے باوجود یہ شخص بااثر افراد کے ذریعے تمام قوانین توڑ کر دبئی فرار ہو گیا۔ یہی صورت پی آئی اے، سٹیل مل اور ریلوے جیسے محکموں کی ہے جو ایسے لوگوں کی وجہ سے دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

سکھوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کوئی کام کرنے کے بعد سوچتے ہیں۔ ہم وہ ہیں جو کام کوئی کرنے سے نہ پہلے سوچتے ہیں اور نہ کرنے کے بعد سوچتے ہیں۔

(جاری ہے)

◆◆◆

بیرون ممالک اور اندرون ادبی دنیا میں مسلسل 45 سال سے سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادبی رسالہ ماہنامہ "تخلیق" کے 2013ء اور 2014ء میں شائع ہونے والے شمارے

مارچ 2013 — جون 2013 — ستمبر 2013 — دسمبر 2013

مارچ 2014 — جون 2014 — ستمبر 2014 — دسمبر 2014 (آنے والا پرچہ)

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک

.....5.....

علی سفیان آفاقی

ٹکٹ خریدنے کے بعد جواد بھائی سامان ٹرکوں میں لاد کر دلی کے سٹیشن تک آئے۔ سامان کو لگیج میں رکھ دیا۔ ہمیں بہت سی ہدایات دیں کہ دیکھو، احتیاطاً سفر کے دوران میں کسی سے بلاضرورت بات نہ کرنا، امرتسر کے سٹیشن پر ٹرک لے کر اٹاری کے بارڈر تک احتیاط سے جانا وغیرہ وغیرہ۔ اعیسہ آپا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سامان کے کسی صندوق کے اندر بیٹھ کر ہمارے ساتھ ہی آ جائیں۔ یہ جدائی ہم دونوں کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی۔

ٹرین کے ذریعے دلی سے امرتسر کا سفر ایک رات کا تھا۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد صبح سویرے ہم زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے، یہاں ٹرین کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ ڈبے سے باہر نکل کر ہم نے قلیوں کو بلایا ایک بڑی عمر کے معتبر قسم کے قلی سے کہا کہ ہمارا سامان بہت زیادہ ہے۔ آپ کو ٹرالی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ جب چند قلیوں نے بڑے بڑے صندوق، گولائی میں لپٹے ہوئے قالین اور دوسرا سامان باہر نکالا تو وہ خود حیران تھے کہ ایک تنہا مسافر کا اتنا ڈھیر سارا سامان کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سامان کو گنتی کے بعد ٹریلرز میں رکھ لیا گیا۔ اس کے بعد تمام قلی ایک دائرے میں ہمارے آس پاس کھڑے ہو گئے مطلب یہ کہ اب کیا کرنا ہے؟

ہم نے معمر قلی سے کہا ''بڑے صاحب ہمیں دراصل پاکستان جانا ہے۔ یہ سامان لاہور لے جانا ہے''۔

وہ بولے ''اس کے لئے تو آپ کو ٹرک کا بندوبست کرنا ہوگا؟'' پوچھا کیا باہر ٹرک مل جائے گا؟

''نہیں جی۔ آپ کو ٹرکوں کے اڈے پر خود جانا پڑے گا۔ ہم اتنا بہت سامان سٹیشن پر کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ بڑے صاحب نے کہا ''بابو جی آپ فکر نہ کریں میں سامان کی دیکھ بھال کروں گا۔'' اجنبی شہر.....اجنبی ریلوے اسٹیشن پھر بھی اللہ کا نام لے کر ہم پلیٹ فارم سے باہر نکلے۔ تانگے والے سے کہا کہ ہمیں ٹرک کے اڈے پر پہنچا دے۔ اس سے کرایہ طے کر کے ہم امرتسر کی سڑکوں پر چل پڑے۔ علی الصبح سڑکیں ویران تھیں۔ ٹرک اڈے پر ہم نے دیکھا تو پتا چلا کہ قریب قریب سبھی ٹرک ڈرائیور سکھ تھے۔ اس وقت تک سکھوں کے بارے میں مسلمانوں کے تاثرات اچھے نہیں تھے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک معقول قسم کے سردار جی کو چھانٹ کر ہم نے پوچھا کہ ریلوے سٹیشن سے ٹرک اٹاری کے بارڈر تک لے جانا ہے۔ اس نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ کرایہ طے کرنے کے بعد ہم اس ٹرک میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ بڑے صاحب بڑی مستعدی سے ہمارے سامان کی حفاظت کر رہے تھے۔ قلیوں کی مدد سے سامان ٹرک میں ٹھونس دیا گیا ورنہ دوسرے ٹرک کی ضرورت پڑ جاتی۔ بڑے صاحب کو ہم نے معمول سے زائد معاوضہ دیا اور دوسرے قلیوں کو بھی خوش کر دیا۔ ان کی دعاؤں کی

چھاؤں میں ہم سردار جی کے ٹرک میں بیٹھ کر سامان کے ساتھ اٹاری بارڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔

فسادات کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ خصوصاً سکھوں کے بارے میں مسلمانوں کو بہت تحفظات تھے۔ ہم اتنے زیادہ سامان کے ساتھ ایک سکھ ٹرک ڈرائیور کے ساتھ انجان راستوں پر سفر کر رہے تھے اور خیالی خطرات میں گھرے ہوئے تھے لیکن ٹرک ڈرائیور نے ہمیں بحفاظت اٹاری تک پہنچا دیا۔ قلیوں نے سامان اتارا۔ سامنے ایک معقول عمارت میں کسٹم والوں کا دفتر تھا۔ وہاں پاکستان جانے والے مسافروں کی ایک قطار پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ سبھی پاکستان جانے کے مشتاق کھڑے تھے۔ پتلون قمیض میں ملبوس ایک افسر سامان چیک کر رہے تھے وہ سب کا سامان کھلوا کر ایک نظر دیکھتے اور چاک سے اس پر نشان لگا دیتے۔ بہت دیر بعد ہماری باری آ گئی۔

ہم اکیلے ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ ''سامان کہاں ہے''؟ ہم نے ایک جانب سامان کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیا۔ انہوں نے تعجب سے ہمیں اور پھر سامان کو دیکھا۔ ''آپ اتنا بہت سارا سامان لے جا رہے ہیں؟''

''جی ہاں'' وہ سامان کی طرف بڑھے۔ قالین بہت کس کے لپیٹے گئے تھے جنہیں رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ صندوقوں پر قفل لگا کر ان پر لاکھ کی مہریں لگی ہوئی تھی۔ ''میں اس کی تلاشی کیسے لوں گا۔ یہ سامان کھولنا پڑے گا''۔ ہم نے کہا۔ ''سامان کی فہرست میرے پاس ہے جس کی منسٹری آف کامرس نے منظوری دی ہے۔''

پھر تین صفحات پر مشتمل فہرست ان کے حوالے کر دی انہوں نے غور سے شروع سے آخر تک پڑھا پھر سیکرٹری کامرس کے دستخط اور مہریں دیکھیں۔ ''ٹھیک ہے آپ سامان لے جا سکتے ہیں''۔ انہوں نے ان پر نشانات لگا دیئے۔

اب ایک نیا مرحلہ سامنے تھا۔ یہاں سے ہندوستانی قلی سامان اٹھا کر ''نو مینز لینڈ'' تک لے جاتے تھے وہاں سے پاکستانی قلی سامان اٹھا کر واہگہ کے کسٹم ہاؤس تک لے جاتے تھے۔ خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ سورج اونچا ہو گیا تھا اور گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ کسٹم آفس کی عمارت ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل تھی۔ اس دفتر کے سامنے مسافروں کی ایک طویل قطار منتظر کھڑی تھی بچے رو رہے تھے، بوڑھے تھک ہار کر زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برقعہ پوش عورتیں بچوں کو بہلانے میں مصروف تھیں کسٹم آفیسر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چپڑاسی نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''وہ اندر میٹنگ کر رہے ہیں''۔

ہم اپنی عادت کے مطابق فوراً دفتر کی طرف گئے۔ ''بھئی آفیسر صاحب کہاں ہیں؟'' ہم نے چپڑاسی سے پوچھا۔

''سر تو میٹنگ کر رہے ہیں''۔

''کس سے میٹنگ کر رہے ہیں، باہر کیوں نہیں آتے؟'' یہ ہمارا اپنے جنت نشاں ملک میں افسر شاہی کا پہلا تجربہ تھا۔

ہم آفس کی طرف بڑھے تو چپڑاسی نے روکنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو اندر کسٹم آفیسر دو تین دوستوں کے ساتھ چائے نوشی اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ہمارا خون کھولنے لگا۔ انہوں نے افسرانہ شان سے پوچھا ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ہم نے کہا ''اور آپ کیا کر رہے ہیں۔ باہر مہاجرین انتظار میں کھڑے ہیں اور آپ دوستوں کے ساتھ چائے پی رہے ہیں''۔ وہ بھونچکے سے ہو گئے۔

''ہم لوگ ہندوستان سے اپنے ملک آئے ہیں اور آپ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ باہر نکل کر تو دیکھئے''۔

انہیں ناگوار تو گزرا مگر وہ بدمزاجی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سارا غصہ انہوں نے مسافروں پر اتارا۔ ہر ایک کا سامان کھلوا کر ایک چھڑی سے ایک ایک کر کے سب باہر نکال پھینکا۔ اس کے بعد نشان لگایا۔ ظاہر ہے کہ دیر ہو رہی تھی اور پھر طریقہ بھی ہمارے لئے

خطرناک تھا۔ جب انہوں نے ایک برقعہ پوش خاتون کا سوٹ کیس کھلوانے کا اشارہ کیا تو ہم ان کے پاس چلے گئے۔

''آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟'' انہوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

''دیکھئے۔ یہ سب اپنا ملک اور سب کچھ چھوڑ کر کچھ ضروری سامان لے کر لٹ پٹ کر پاکستان آئے ہیں۔ ان کے پاس آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ اور فرض کیجئے اگر یہ کچھ قیمتی سامان لائے بھی ہیں تو اس میں آپ کا اور پاکستان کا کیا نقصان ہے۔ فائدہ ہی ہے۔ آپ ان سب کو بلاوجہ کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ یہ سمگلر نہیں مہاجر ہیں۔ پہلی بار پاکستان آئے ہیں۔ ان سے محبت کا برتاؤ کیجئے''۔

وہ ساکت رہ گئے، مگر دوسرے تمام لوگوں نے بھی بولنا شروع کر دیا۔

''واہ۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ اپنے ہی ملک میں تلاشیاں''۔

''یہ کیسا پاکستان ہے؟''

''انڈیا میں تو ایسا سلوک نہیں ہوا تھا''۔

''بہت دیر ہوگئی۔ اب ہم اور نہیں رکیں گے''۔

غرضیکہ بغاوت ہوگئی۔ کسٹم افسر صاحب بوکھلا گئے۔ سرسری سا جائزہ لے کر انہوں نے سب کے سامان پر نشان لگا دیئے۔ پھر ہماری باری آئی۔

''آپ کا سامان کدھر ہے؟''

''وہ۔ اس طرف'' ہم نے سامان کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیا۔

''یہ۔ یہ سارا سامان؟''

''جی ہاں۔ اس میں گھریلو استعمال کی چیزیں ہیں۔ انڈیا کی منسٹری آف کامرس نے دیکھنے کے بعد اجازت نامہ دیا ہے''۔

ہم نے سامان کی فہرست انہیں دکھا دی۔ ''یہ تو انڈین گورنمنٹ کی منظوری ہے۔ ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ یہ سامان کھول کر دکھائے''۔

''یہ نہیں ہوسکتا''۔ انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ ''بہت سے مزدوروں نے بڑی محنت سے یہ سامان پیک کیا ہے اور قالین لپیٹے ہیں۔ اب انہیں کھول کر دوبارہ کون رکھے گا''۔

''مگر ہمیں دیکھنا تو یہ ہے کہ اس میں کیا ہے''۔

''اس میں سونا اور ہیرے جواہرات ہیں۔ بہت قیمتی سامان ہے مگر ہم یہ انڈیا کی حکومت سے اجازت لے کر وہاں سے لائے ہیں۔ ہم پاکستان میں کچھ لے کر ہی آئے ہیں لے کر تو نہیں جا رہے؟ اور پھر آپ دیکھے لیجئے صندوقوں پر قفل لگے ہوئے ہیں اور لاکھ کی مہریں ہیں۔ یہ سب کچھ دوبارہ کون کرے گا؟''

وہ کچھ لاجواب سے ہوگئے۔ ''پھر بھی''

ہم نے کہا ''دیکھئے جناب ہم صبح امرتسر پہنچے تھے۔ اب شام ہونے لگی ہے۔ ایسی تلاشی تو انڈیا والوں نے بھی نہیں لی ہم اپنا سامان نہیں کھولیں گے۔ چاہے رات ہو جائے کل صبح ہمارے عزیز، رشتے دار آ جائیں گے وہ خود ہی آپ سے بات کر لیں گے اور اخبار والوں کو بھی بتائیں گے کہ پاکستان آنے والے مسلمانوں سے یہاں کیا سلوک کیا جا رہا ہے''۔ انہیں غصہ تو بہت آیا مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ جھلاّ

کر بولے ''ٹھیک ہے آپ اپنا سامان لے جائیں''۔ پھر باقی ماندہ مسافروں سے مخاطب ہوئے آپ بھی ''ویلکم ٹو پاکستان''۔

ایک مشکل مرحلہ حل ہوا تو معلوم ہوا کہ ٹرک وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ صرف چند ریڑھے کھڑے ہیں، ریڑھے والوں سے بات چیت کی۔ چار پانچ ریڑھوں پر سامان لادا گیا۔ ایک ریڑھے میں سامان کے ساتھ ہی ہم بھی بیٹھ گئے۔ لاہور کے بارے میں ہمارے رنگین خوابوں کی پہلی تعبیر اتنی رنگین نہیں تھی۔ باٹا کی فیکٹری، مغل پورہ، شالامار باغ پھر یہ سفر نہر کے کنارے کنارے شروع ہوگیا۔ فسادات کی وجہ سے لاہور اجڑا اجڑا سا نظر آیا۔ سڑکیں بھی ویران تھیں۔ آخر ایک جگہ ہم نے پوچھا ''مال روڈ کہاں ہے؟'' ریڑھے والے نے کہا ''اس وقت ہم جس سڑک کو پار کر رہے ہیں یہی مال روڈ ہے''۔ ہمارا دل بیٹھ سا گیا۔

کافی لمبے سفر کے بعد ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوئے یہاں بھی کوٹھیاں بیوہ کے سہاگ کی طرح اجڑی ہوئی تھیں۔ ویرانی اور بے سروسامانی کا سماں تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا مگر یہ وہ ماڈل ٹاؤن نہیں تھا۔

29۔ بی پہنچے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ ہم اطلاع کے بغیر اچانک پہنچے تھے۔ سب کے لئے ایک خوشگوار حیرت کی بات تھی اور پھر سامان کو دیکھ کر تو سبھی حیران رہ گئے۔ ہماری روانگی کا جو تار جواد بھائی نے دہلی سے بھیجا تھا وہ ہماری آمد کے دو دن بعد لاہور پہنچا تھا یہی وجہ تھی کہ واہگہ بارڈر پر کوئی یہاں لینے کیلئے موجود نہ تھا۔

پاکستان ہمارے لئے ایک خوبصورت رنگین فلم کی طرح تھا مگر جب یہاں آئے تو یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ کے گھسے پٹے پرنٹ کی طرح نظر آیا۔ جو 1949ء کا تذکرہ ہے اور یہ سطور نومبر 2010ء میں لکھی جا رہی ہیں۔

ہم پاکستان آئے تو لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ ان کو قتل کیا گیا تو ہم روزنامہ ''آفاق'' میں کام کر رہے تھے۔ ہمارے خصوصی نمائندے عرفانی صاحب نے اس سانحہ کا آنکھوں دیکھا حال بہت تفصیل سے بھیجا تھا۔ پھر انہوں نے قاتل سید اکبر اور اس کے پس منظر کے بارے میں بھی ایک بہت اچھی رپورٹ بھیجی تھی۔ گولی چلنے کے بعد وہ بھی سٹیج پر پہنچ گئے تھے جہاں ان کی آنکھوں کے سامنے انہوں نے آخری الفاظ کہے۔ ''اللہ پاکستان کی حفاظت کرے'' اور زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ اس مضمون کو سیاسی بنانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہم جیسے لاکھوں کروڑوں پاکستانیوں کے لئے موجودہ صورتِ حال ناقابل برداشت ہے اور اس کے ذمہ دار ہمارے لیڈر فوجی آمر اور بیوروکریسی ہے۔ لیاقت علی خان کی آنکھ بند ہوتے ہی پاکستان کی تقدیر اور رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ ابن الوقت، طالع آزما، مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ سازشوں کے ذریعہ ''میوزیکل چیئر'' کے کھیل میں مصروف ہوگیا جو آج تک جاری ہے اور نہ جانے آئندہ کب تک جاری رہے گا۔

قائداعظم نے دعویٰ کیا تھا کہ برصغیر کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اس وقت کے کلچر، روایات اور مذہب کی آزادی کے لئے یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ بدقسمتی سے ان کی اور پھر مختصر عرصہ بعد لیاقت علی خان کے قتل کی وجہ سے جمہوریت کا خاتمہ ہوگیا اور ابن الوقت، مفاد پرست طالع آزماؤں کا دور شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ سیاست اب ایک منافع بخش کاروبار بن چکی ہے جو مٹھی بھر خاندانوں اور مراعات یافتہ طبقے تک محدود ہے۔ قائداعظم کے بعد ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا اور ملک مختلف سمت میں چل پڑا۔ کرپشن کا زہر قوم اور معاشرے کی رگوں میں دور تک پھیل چکا ہے۔ قومی کردار تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب کرپشن، منافقت، منافع خوری اور لوٹ کھسوٹ کسی مخصوص طبقے تک محدود نہ رہی۔ ہر شخص دوسرے شخص کو لوٹنے کی تاک میں رہنے لگا۔ اوپر سے نیچے تک۔ یہ نظام بوسیدہ، فرسودہ اور دیمک زدہ ہو چکا ہے۔ قائداعظم نے اپنے کلچر اور اقدار کی حفاظت اور عام مسلمان کو عزتِ نفس اور خوشحالی دینے کیلئے پاکستان بنایا

تھا اور ہم رفتہ رفتہ ان ہی سے محروم ہو رہے ہیں۔ انگریز کی ذہنی غلامی کیا کم تھی کہ اب بھارت کے ذہنی غلام بھی بن چکے ہیں۔ صرف عریانی، فحاشی اور بے حیائی میں ہم نے ترقی کی ہے۔

حکمرانوں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ پاکستانیوں کو ایک قوم بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ قوم کیلئے ایک قومی زبان ضروری ہے۔ قائداعظم نے ڈھاکہ میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہی ہوگی۔ ہندو نواز عناصر نے اس پر صوبائیت کا شور بلند کر دیا۔ حکمرانوں نے بنگلہ کو بھی قومی زبان بنا لیا۔ اس طرح صوبائیت اور فساد کا ایک نیا بیج بو دیا گیا۔ انڈیا میں انتہائی ترقی یافتہ علاقائی زبانوں کی مزاحمت کے باوجود ہندی اور صرف ہندی انڈیا کی زبان ہے۔ انڈین رہنماؤں نے عوام میں قومیت کا احساس اجاگر کر دیا ہے مگر ہم دوسری سمتوں میں جا رہے ہیں۔ پاکستانی قوم مخلص اور بصیرت انگیز قائدین کی عدم موجودگی کے باوجود ایک عظیم قوم ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ جب بھی کسی شعبے میں پاکستانیوں کو مخلص، دیانتدار اور قابل رہنما ملا قوم نے معجزے کر دکھائے۔ کھیلوں کی دنیا میں پاکستان جیسا چھوٹا ملک دنیا کے چند ممتاز ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ کافی عرصے تک ہاکی اور سکوائش میں پاکستان عالمی چیمپئن رہا۔ ہاکی میں پاکستان کا نام تابندہ رہا۔

جب ایک مخلص محنتی سائنسدان سربراہ ملا تو بے سروسامانی اور شدید پابندیوں کے باوجود پاکستان دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت بن گیا۔ پاکستان کے میزائل اور جنگی طیارے ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک مار کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر پاکستانیوں نے دنیا میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔ کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو یہ قوم سینہ سپر ہو کر مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہمارے حکمران اس کو ایک غریب ملک کہتے ہیں، یہ درست ہے کہ ملک میں اکثریت انتہائی غریب ہے لیکن ایک عالمی سروے میں بتایا گیا ہے کہ پاکستانی دنیا کی مخیّر ترین قوم ہیں۔ اسی ملک نے عبدالستار ایدھی، عمران خان اور دیگر ممتاز خدمت خلق کرنے والی ہستیاں پیدا کی ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مٹی نرم بھی ہے اور زرخیز بھی ہے مگر حکمرانوں نے (جن میں ہر قسم کے حکمران شامل ہیں) اس کو بنجر اور ویران بنا دیا ہے۔ عوام کو اب کسی سیاستدان پر اعتماد نہیں رہا اور انہوں نے بھی بارہا ثابت کیا ہے کہ ذاتی مفادات کی خاطر وہ سب ایک ہیں۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ جس ملک میں قائداعظم کی جگہ آصف زرداری براجمان ہوں اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا؟

ہمارے ایک انتہائی محبّ الوطن دوست بے شمار ترغیبات کے باوجود پاکستان چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھے لیکن پھر ایک دن انہوں نے بھی بوریہ بستر باندھا اور کینیڈا چلے گئے۔ ہم نے انہیں خط لکھ کر حیرت کا اظہار کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''بروٹس۔ تم بھی؟'' ان کا جواب کافی طویل تھا۔ لیکن اس کی آخری سطر ہمارے دل و دماغ کو زخمی کر گئی۔ انہوں نے لکھا تھا۔

''آفاقی صاحب! جس ملک کے چودہ کروڑ افراد میں ایک بھی مخلص اور دیانتدار لیڈر نہ ہو کیا وہ رہنے کے قابل ہے؟''

ہمیں ان سے اتفاق نہیں ہے۔ ایسا لیڈر اور مسیحا ایک دن ضرور نمودار ہوگا۔ پاکستان اللہ کی دین ہے۔ وہی اس کی حفاظت کرے گا۔ انشاءاللہ۔ (ختم شد)

◆◆◆

روح افزا
اور کیا چاہیئے!

سفر نامہ

سورج کے رُخ پر

......5......

ڈاکٹر ابدال بیلا

ہائیں!

میرا دماغ شائیں شائیں کرنے لگا۔

لیکن مرینڈا، دس پندرہ منٹ پہلے یا بعد اگر میری گاڑی آئی تو میں تو کسی اور ٹرین میں چڑھ گیا۔تیس چالیس منٹ آگے پیچھے اگر گاڑی منزل پہ رُکی تو میں کہیں اور اُتر گیا۔

بولی، مسٹر بیلا، یہی نام ہے نا۔اس نے کمپیوٹر سکرین پہ دیکھا اور ایک ڈمی پرنٹ نکال کے ایک طرف رکھ لیا۔ بولی، یہ میں سووینئر سمجھ کے رکھ رہی ہوں کہ ایک ناول آتھر نے مجھ سے ٹکٹ لیا۔تم منٹوں کی بات کر رہے ہو۔ جانتے ہو، جرمنی میں وقت کے بارے میں ہماری ٹالرینس، ہماری قوت برداشت کتنی ہے؟

کتنی؟

دس سیکنڈ۔

دس سیکنڈ سے زیادہ ٹرین لیٹ نہیں ہوسکتی۔ یہ قانون ہے۔ یہ جرمنی ہے۔

کیا؟

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

یعنی گاڑی لیٹ نہیں ہوگی۔

نہ، آؤٹ آف کیوسچن۔

اُف، اب سمجھ میں آیا راز، تم لوگوں کی عظمت کا، میں بڑبڑایا۔

کیا؟ مرینڈا سُن کے مسکرائی۔

یہ دس سیکنڈ۔

بولی۔نو مسٹر بیلا۔دس سیکنڈ تو آخری لمٹ ہے۔حد ہے ہماری برداشت کی۔ہم ایک ایک سیکنڈ کو اہم مانتے ہیں۔تم فکر نہ کرو۔ بار بار پسینہ نہ پونچھو۔ یہ برابر والے پلیٹ فارم پہ تمھاری گاڑی آئے گی۔ وہ سامنے جو گلاسی کیبن نظر آ رہا ہے ادھر تمھارا کمپارٹمنٹ ہوگا، اور ابھی

سوا گیارہ منٹ باقی ہیں۔ جسٹ ریلیکس، پتہ ہے سوا گیارہ منٹ کتنے ہوتے ہیں۔ میرا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔

ہمارے دیس میں تو گیارہ پشتوں سے وہی دھول اُڑی، نصیبوں میں رکی کھڑی ہے اور یہ سوا گیارہ منٹوں کی بات کر کے ریلیکس ہونے کو کہہ رہی ہے۔ میں نے اس کی بات سُن کے بے چارگی میں کچھ نہ جاننے والے کی طرح ہاتھ اِدھر اُدھر لہرا دیے، جیسے کچھ نہیں پتہ، سوا گیارہ منٹ کتنے ہوتے ہیں۔ وہ مسکرائی، آنکھیں ذرا سی نچائیں اور سرگوشی کے انداز میں بولی، بہت ہوتے ہیں۔ اپنی بات کہہ کے اس نے عین میری آنکھوں کے اندر دیکھ کے عجیب طرح کا ایک سنسناتا، خون کو اباتا سپارک دیا، ایک آنکھ دبائی اور مسکرا کے پھر بولی۔ واقعی بہت ہوتے ہیں۔ اس کی بات سن کے ماتھے کے علاوہ بھی کئی جگہوں پہ پسینہ آ گیا۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پہ ڈالا، ٹکٹ ہاتھ میں لیے اور اس سے جدا ہونے کا سلام کیا اور بولا، سو کائینڈ آف یو، مرینڈا۔

یو آر ویل کم۔ ریمیمبر آئی وِل ٹریک یو۔ جب لوٹو اِدھر تو مل کے جانا۔

میں ایک لمحے کو رُکا، مڑا اور دل جمعی سے مسکرا کے بولا، شیوُر۔ وہ اُٹھ کے کھڑی ہوئی، شیشے کی کھڑکی سے اپنا گورا ملائم سا ہاتھ باہر نکال کے مجھ سے مصافحہ کیا اور بوسہ دینے کے انداز میں ہونٹ ہلا کے دبائے اور مسکرائی۔ میں نے سر ہلا کے اسے دیکھا۔ میں سہم گیا۔ مجھ سے مسکرایا نہ گیا اور میں چلتا ہوا۔ دونوں بیگمات کے پاس آ گیا۔ دونوں کے چہروں پہ غصے سے بھونچال آئے ہوئے تھے۔ وہ کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھیں، مگر ضبط کر کے بولیں۔

گاڑی نکل تو نہیں گئی؟

کیسے نکل سکتی ہے، آپ کے بغیر، آئیں میرے ساتھ۔

کون سا پلیٹ فارم ہے؟ وہ میرے پیچھے پیچھے اپنی اپنی ٹرالی کھینچتی ہوئیں غصے سے کپکپا رہی تھیں۔

بس میرے ساتھ ساتھ آتی رہیں۔

اُدھر نہیں، اِدھر، بس یہیں رُک جایئے۔

گاڑی نے آنا کب ہے؟

میں نے جرمن ریسٹ واچ پر نظر ڈال یاور مرینڈا کے انداز میں بولا، ابھی رہتے ہیں پونے دو منٹ۔

اُف۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ٹرین کا ڈرائیور تمھارا چاچا ہے۔

ان کا طعنہ سن کے میں شائستگی سے مسکرایا اور بولا اتار لیں، اپنے اپنے اٹیچی کیس ٹرالی سے۔ یہ کہہ کے میں نے دونوں خواتین کے اٹیچی کیس ٹرالیوں سے اُتار دیے۔ پلیٹ فارم شفاف شیشے کے فرش کا بنا لگتا تھا۔ اوپر چھت بھی پتہ نہیں شیشے کی تھی یا فائبر کی۔ روشن چھت اور دیواروں سے، ہر طرف سے بڑی لطافت سے آ رہی تھی۔ وقت کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ دن ہے یا رات۔ اُجالا ہی اُجالا تھا۔ روشنی، پیلی پیلی روشنی۔ تھوڑے سے لوگ پلیٹ فارم پہ تھے۔ اِکا دُکا کوئی مسافر نظر آتا۔ لگتا تھا سارا شہر سو رہا ہے۔ کوئی سوا کلومیٹر لمبے پلیٹ فارم پر گنتی کے چند لوگ، نہ کوئی دھکم پیل نہ کوئی بھاگ دوڑ۔

ہے کدھر بون؟ دائیں طرف یا بائیں طرف؟ ایک خاتون نے پوچھا۔ علم تو مجھے بھی نہیں تھا۔ گھڑی دیکھی۔ پھر میرے اندر سے

مرینڈا بولی پینتالیس سیکنڈ رہتے ہیں۔گاڑی کا جدھر منہ ہوگا ادھر ہی بون ہے۔

دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو ایسے دیکھا جیسے میں اپنے ہوش میں نہیں۔ڈاکٹر رشید کی کپکپاہٹ بھی بڑھ گئی۔بولا یار بتاؤ نا، کون سی گاڑی ہے، کون سا پلیٹ فارم، کون سی جگہ، اور کب؟

وہ دیکھو، میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

ایک طرف سے گولی کی طرح چکنے پلیٹ فارم پہ ایک ریشمی ناگن کی طرح سرسراتی چم چم کرتی۔بے آواز سی ٹرین فراٹا بھرتی آتی ہوئی چمکی۔ٹرین انجن کے ماتھے پہ چھت کی سنہری روشنیوں سے چوبیس کیرٹ سونے کے جھومر جھلملا رہے تھے۔ایک سریلی سی سیٹی اس نے ماری جیسے کوئی گرل فرینڈ واک پر ساتھ چلنے کا اشارہ کر رہی ہو۔آناً فاناً وہ ہمارے سامنے تھی۔چند لمحے وہ ہمارے سامنے سرکتی رہی۔پھر رکی، ہمارے سامنے کے شیشے کی دیواروں والے چمکتے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھٹ سے کھلا اور میں نے کہا، یہ آ گیا، ہمارا ڈبہ، آئیں۔خواتین کے اٹیچی کیس چڑھانے میں مَیں نے مدد کی۔رشید اپنا سوٹ کیس خود اٹھا کے چڑھ گیا۔ہم چاروں ڈبے کے اندر آئے۔سیٹوں پہ بھی نمبر لکھے تھے۔یہ رہیں آپ کی سیٹیں۔خواتین کے نشستوں پہ بیٹھتے ہی، چند لمحوں میں کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ٹرین فرانکفرٹ سے بون کی طرف چل پڑی۔دونوں خواتین اور ڈاکٹر رشید ابھی تک مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے انہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ میں، میں ہی ہوں۔تھوڑی دیر پہلے تک جن کی آنکھیں اعلانیہ میرے پاگل پن کا اعلان کر رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ اس پاگل کا کورٹ مارشل پاکستان پہنچنے کے کتنے دن بعد ہو، وہ ایسی شگفتہ حیرانی سے اب دیکھ رہی تھیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ اپنے اپنے جرنل سے وہ میرے لیے کب تمغۂ حسن کارکردگی کی سفارش کریں۔

گاڑی چل پڑی۔دس پندرہ نشستوں والے اس اُجلے چکنے چمکتے کمپارٹمنٹ میں تقریباً سبھی سیٹیں خالی تھیں۔صرف ایک کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پہ ایک نیلی آنکھوں والی نیم سنہرے ملائم بال کندھوں پہ پھیلائے اپنی گود میں ایک کتاب رکھے محویت سے اسے پڑھے جا رہی تھی۔اس کی سکائی بلیو رنگ کی ٹی شرٹ اس کی جین سے کچھ باہر نکلی ہوئی تھی۔گلابی گلابی سی سفید اجلی اس کی کمر اس کی شرٹ کے نیچے اور ڈارک نیوی بلیو جین کے اوپر بلور کی طرح چمک رہی تھیں۔اٹھائیس تیس سال کی نظر آنے والی اس سفید فام لڑکی کی سکن ٹائٹ نیلی جین کے پائنچے پنڈلیوں کے درمیان میں تھے۔اپنی آدھی آدھی ننگی بلوری پنڈلیاں اور اپنے سفید گلابی پاؤں آپس میں الجھا کر اس نے بے خیالی میں اپنے سامنے والی خالی سیٹ پہ رکھے ہوئے تھے۔لال دھاریوں والے نیلے جوگر اس نے اُتار کر اپنی سیٹ کے پاس رکھے تھے۔ہم چاروں کے اس ڈبے میں سوار ہوتے سمے اس نے ایک لمحے کو بھی ہماری طرف نہ دیکھا تھا۔میں نے اس کے ہاتھوں میں پکڑی کتاب دیکھ کے اندازہ لگا لیا کہ وہ کتنا توجہ جذب ناول ہے اور وہ ناول پڑھتی پڑھتی اس لمحے ناول کے کس نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہے کہ اس کی محویت کا یہ عالم ہے۔

میں نے اپنا نے اپنا ہینڈ بیگ اس کے سامنے والی کرسی پہ رکھے اس ننگے پیروں کے عین اوپر دیوار پہ لگی سٹیل گرل میں رکھا اور چپکے سے سرکتا اسی نشست کے پاس کھڑا ہو گیا۔اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔اس نے میرے گھٹنوں سے اوپر نظر نہ اٹھائی اور ہاتھ میں پکڑی کتاب پڑھتے پڑھتے اپنی ملائم سفید چکنی اُنگلیوں کے نیلے رنگے ناخنوں کی خفیف سی جنبش سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دھیرے دھیرے کرسی پہ رکھے اپنے پاؤں سمیٹنے لگی۔میں نے اس کے سمٹتے ہوئے پیروں سے کوئی پونے سات انچ اوپر اپنی ہتھیلی کھول کے ہوا میں تھپتھپی دی، جیسے کہا ہو، پاؤں یہیں رکھے رہو اور اس کرسی کے ایک کونے پہ چپکے سے بیٹھ گیا۔اس کے ہاتھ میں پکڑے ناول پہ بنے

ٹائٹل کو دیکھ کے مجھے اس ناول کی ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ وہ اپنی نشست پہ تھوڑا سنبھل کے بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پاؤں کرسی کی بغل میں چھپا کے دیوار سے لگا لیے۔ مگر بار بار اس کے پیروں میں ایک غیر ارادی سی حرکت ہو رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو، ہٹا لوں پاؤں۔ اس کے مخملی براق دمکتے پاؤں اور سفید گلابی ننگی پنڈلیاں اس کی نیلی ڈینم جین کے ادھڑے پانچوں کے مسکراتے دھاگوں میں صبح دم باغیچے میں کھلی پھول پتیوں کی طرح سرسرا رہی تھیں۔ کرسی کی درز سے سمٹنے کو تھیں کہ میں نے اس بار اس کی ننگی دہنی پنڈلی کے دو انچ اوپر سے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی کہ پاؤں رکھے رہو اور خود کھڑکی کے شیشے میں اس کا عکس دیکھتے ہوئے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کے ایک سگریٹ منہ میں لے لیا۔ ابھی لائٹر میں نے جلایا نہ تھا کہ میرے سگریٹ کا احساس ہوتے ہی اس نے پاس ہی دیوار سے لگی ایک چھوٹی سی شیشے کی میز سے اپنی سگریٹ کی ڈبی سے سگریٹ نکال کے اپنے ہونٹوں میں لے لیا۔ کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے وہ اپنا لائٹر ڈھونڈنے لگی جو اس وقت اس کی میز سے نیچے گرا پڑا تھا۔

میں نے لائیٹر جلا لیا تھا۔ مگر اپنا سگریٹ سلگھانے سے پہلے میں جلتا اپنا لائیٹر اس کے چہرے کی طرف لے گیا، ابھی لائیٹر کا جھلملاتا شعلہ اس کے شعلہ رنگ رنگے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کی کنی کو چھو نہ پایا تھا کہ میں نے لائیٹر کا شعلہ بجھایا اور اسی لائیٹر پکڑے ہاتھ کی اُنگلیوں سے اس کے نارنجی لپ اسٹک لگے ہونٹوں میں دبے اس کے سگریٹ کو دھیرے سے باہر کھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھلنے چونک کے میری طرف کھلے اور اس کی حیران ہوئی نیلی آنکھوں نے پہلی بار مجھے سٹپٹا کے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کا سگریٹ سیدھا کیا اور سگریٹ کا فلٹر اس کے لبوں میں دبا دیا۔ وہ عجیب طرح سے مسکرائی، اپنی نیلی آنکھوں میں حیرت میں مٹھاس یک چٹکی ڈالی پھر نگاہوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسے سرعت سے گھمایا جیسے نگہ میں رکھی شیرینی میں چمچہ ہلا رہی ہو۔ اس کے سنہرے بالوں کے خم و پیچ ایک لمحے کے لیے جاگے اور اس کے سفید گلابی چہرے کی کنیوں پر جھلملائے اور کچھ کہے بغیر یہ کہہ گئی کہ کتاب پڑھنے کی محویت میں اکثر اُلٹا سگریٹ سلگا کے فلٹر جلا لیتی ہوں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں جیسے نیلم کے مہکتے بلور تھے۔ اس کے چہرے پہ شکریہ کہنے والی مسکراہٹ آئی اور اس نے اپنے لبوں میں سگریٹ دبائے دبائے، اپنا چہرہ میری طرف بڑھایا اور میں نے ٹھک سے لائیٹر جلا کے اس کا سگریٹ سلگا دیا۔ اس نے لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا اور اپنی نیلی آنکھوں کو دھوئیں کی سرمئی بدلیوں سے مہکا کے سگریٹ انگلیوں میں لے کر بولی، تھینک یو، یو آر ویل کم اور میں نے اپنا سگریٹ بھی سلگا لیا۔ اس نے مسکرا کے اپنی نیلی آنکھوں میں دوستانہ سب بتی جلائی جیسے کہہ رہی ہو، کہو جو کہنا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔ کہا تو اتنا ہی کہ آپ جو ناول پڑھ رہی ہیں اسے دیکھ کے لگتا ہے آپ کو انگریزی آتی ہے۔'' وہ ہڑبڑا کے ناول کے ٹائٹل کو دیکھ کے بولی، ہاں آتی ہے انگریزی مجھے، مگر یہ ناول تو جرمن زبان میں ہے۔ جرمن زبان میں ضرور ہے مگر کہانی اس کی انگریزی ایڈونچر رومانس کی ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ناول، درمیان میں ایک انگلی دے کے بند کیا اور سگریٹ کا لمبا کش لے کر مجھے غور سے دیکھتی ہوئی بول۔ ''آپ نے یہ ناول پڑھا ہوا ہے؟''.....نہیں!

میں کھڑکی سے باہر تکنے لگا، گاڑی ایک سرنگ سے نکل کے اوپر سطح زمین پر نمودار ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں باہر شام کی دھوپ میں دور دور تک سبز میدان تھا۔ دور اونچے نیلے پہاڑوں کی قطار دھیرے دھیرے ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ پہاڑ اور ہماری ٹرین کے درمیان میں ایک سہانے سپنے جیسا نیلگوں آسماں میں رنگا ایک دریا رواں دواں تھا۔ دریا میں شوخ رنگوں والے دلکش بالکونیوں سے بھرے بحری جہاز بچوں کے کھلونوں کی طرح آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ پہلی نظر میں پتہ نہ چلتا تھا کون سا جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

◆◆◆

(جاری ہے)

طنز و مزاح

ٹیئر ولوجی

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

مرد لاکھ برتری کے دعوؤں سے خود کو بہلاتا رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرد کے دل سے لے کر شاپنگ کے بل تک سِکّہ بہر حال عورت کی برتری کا ہی چل رہا ہے۔ ابلاغ کا فن تو عورت کی زبان تک پہنچ کر باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ جیسا مؤثر ابلاغ عورت کر سکتی ہے مرد بے چارہ اس کی محض حسرت کر سکتا ہے۔ چاہے وہ اپنے نام کے ساتھ ''شیخ الاسلام'' وغیرہ کا سابقہ ہی کیوں نہ لگا لے۔ مردوں کی مجبوری یا کمزوری یہ ہے کہ وہ ابلاغ کے لیے صرف الفاظ پر انحصار کرتے ہیں جبکہ عورتیں خود کو متعدد آلات سے لیس رکھتی ہیں۔ غالبؔ نے اپنے محبوب کے حوالے سے چند آلاتِ ابلاغ کا دکھڑا اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا تھا۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اکبرالہٰ آبادی نے عورتوں کے ماورائے الفاظ ابلاغ کی کامیابی اور مردوں کی بے بسی کو یوں رقم کیا۔

انہیں غمزوں میں آساں ہے معانی کا ادا کرنا مجھے لفظوں میں مشکل ہے بیانِ مدّعا کرنا

تاہم عورتوں کے ابلاغی ہتھیاروں میں آنسو کو ''جوہری اہمیت'' حاصل ہے۔ ہم نے بڑے بڑے سخت جان اور سور ماصفت شوہروں کو اپنی کمزور اور مسکین صورت بیوی کے ایک آنسو پہ پگھلتے دیکھا ہے۔ ایک طرف آنسو ابھی پوری طرح نکلنے نہیں پاتا کہ دوسری طرف فشارِ خون کم اور سرِ تسلیم خم ہو جاتا ہے۔ عورتیں اپنے آنسوؤں کو بڑی نزاکت اور مہارت کے ساتھ ابلاغ کے آخری حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ جب ان کی تمام دلیلیں، خوشامدیں، دھمکیاں اور گُھرکیاں ناکام ہو جاتی ہیں تو آنسو امید کی آخری کرن بن کر آنکھ میں چمکتا ہے اور قیامت ڈھا دیتا ہے۔ اس کیفیت کا آنکھوں دیکھا حال میرؔ صاحب کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔

کیا جانیے کہ دل پر گزرے ہے میرؔ کیا کیا کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پُرآب کر کے

ابلاغ کے میدان میں آنسو جیسی دھانسو ٹیکنالوجی کا کوئی نعم البدل اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ ایک مغربی ماہر ابلاغ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ آنسو کا ایک قطرہ دس ہزار الفاظ سے زیادہ بولتا ہے اور ایک دانشور کا یہ قول ریکارڈ پر ہے کہ الفاظ روتے ہیں، آنسو بولتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ کم حیرت انگیز نہیں کہ فرمائش یا فہمائش کے نازک موقعوں پر عورتیں کس طرح اپنے آنسوؤں کو مطلوبہ مقدار اور رفتار میں جب چاہتی ہیں حاصل کر لیتی ہیں۔ میرؔ صاحب کے مندرجہ بالا شعر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں پُرآب کی جاتی ہیں، ہو نہیں جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا حاضر اسٹاک انہیں یقین دلاتا رہتا ہے کہ

ع مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس وقت

ہمیں بھی گزشتہ ہفتے آنسوؤں کا کاری زخم لگا تھا جس کے باعث ہم اب تک ''مجروح سلطان پوری'' بنے ہوئے ہیں۔ ہوا یوں کہ ہمارے ٹی وی سیٹ میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ پہلے وہ ریڈیو میں تبدیل ہوا (یعنی تصویر غائب ہوئی) اور پھر آواز رخصت ہوئی یعنی بالکل ہی ڈبا بن گیا۔ گھر کے دیگر افراد اس صورت حال پر یوں بوکھلائے ہوئے تھے جیسے انہیں پتھر کے دور میں دھکیل دیا گیا ہے لیکن ہم ذاتی طور پر خوش تھے کہ علم وادب کی خدمت زیادہ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ کرسکیں گے بلکہ ہمیں یہ خوش فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ شاید قدرت ہم سے کوئی شاہکار تخلیق کروانا چاہتی ہے۔ مگر گھر کی ''کور کمانڈر'' کا پروگرام کچھ اور ہی تھا۔ وہ اپنے طور پر سیٹ کو ایک میکینک کو دکھا کر مایوس ہو چکی تھیں۔ اب ہم پر یہ دباؤ تھا کہ اسے کسی اچھے سے کاری گر کی دکان پر لے جائیں۔ ہم نے اس سلسلے میں سرکاری روّیہ اپنایا یعنی شکایت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے رہے اور اپنے ''شاہکار'' کے بارے میں سوچتے رہے۔ ایک روز جب موصوفہ کے لہجے میں ترشی اپنے معمول کے معیار سے زیادہ ہوگئی تو ہم نے انہیں دلاسا دیا کہ میکینک کو فون کر دیا گیا ہے اور آئندہ بہتّر گھنٹوں میں وہ ہمارے دروازے پر ہوگا۔ ''بہتّر گھنٹے؟'' ان کی چیخ نکل گئی ''کیا وہ کینیڈا سے آرہا ہے؟'' ہم نے چیخ پر سیخ پا ہوئے بغیر کہا ''دراصل آج کل ٹی وی سیٹ کچھ زیادہ ہی جارحانہ موڈ میں ہیں اور میکینک حضرات کو مصروفیات نے پاگل کر رکھا ہے۔''

بیگم نے ہمارے موقف کو رد کرتے ہوئے جواب دیا ''تمہارا خیال ہے ٹی وی سیٹ اپنے مطالبات کا دس نکاتی ایجنڈا دے کر ہڑتال پر چلے گئے ہیں؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا'' ہم نے ان کے نیم سیاسی بیان کی تردید کی ''درحقیقت یہ سب موسم کا اثر ہے۔''

''موسم کو کیا ہوا؟'' انہوں نے آنکھیں نکال کر سوال کیا۔

ہم نے مکمل طور مدافعتی روّیہ اختیار کرتے ہوئے انہیں سمجھانا چاہا ''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ آج کل فضا میں آلودگی بہت بڑھ گئی ہے۔ اوزون کی تہ روز بروز پتلی ہوتی جارہی ہے اور اس میں کئی شگاف پڑ گئے ہیں۔ موسم گرم اور خشک چل رہا ہے۔ مختلف النّوع بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ الیکٹرانک آلات بھی انسانوں کی طرح موسمی اثرات قبول کرتے ہیں۔ ہمارا ہی نہیں، علاقے کے سینکڑوں ٹی وی سیٹ خراب پڑے ہیں لیکن صبر کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

یہ بقراطیت بگھار کر ہم نے اپنی اُسی رائیٹنگ ٹیبل پر سر جھکا لیا جسے بیگم اپنی سوکن قرار دیتی ہیں۔ وہ ہماری وضاحت سے مطمئن تو نہ تھیں لیکن ہماری باتیں اتنی فلسفیانہ یعنی الجھی ہوئی تھیں کہ انہیں سلجھانے کا خیال چھوڑ کر وہ وقتی طور پر خاموش ہوگئیں۔ ہم نے سوچا کام بن گیا۔ لیکن دوسرے دن جو ہم کام سے گھر لوٹے تو بیگم کے مزاج کو قصر سلطانی کے گنبد کی کلغی پر پھڑکتا ہوا پایا۔ ہم نے بہ مشکل تمام اپنا بریف کیس نیچے رکھا تھا کہ اس عفیفہ نے آستینیں چڑھا کر ہمارا ''پیر مقدم'' کیا۔ ہم سمجھ گئے کہ آج خیریت نہیں۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

(غالبؔ)

ہم نے پوچھا ''خیر تو ہے، کیا پراپرٹی ٹیکس والے آگئے تھے؟ فکر نہ کرو یہ سروے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

مشتعل خاتون ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگیں ''سروے تو میں نے خود کیا ہے۔''

''کہاں کا؟''

''محلے کا۔''

''بھلا کیوں؟''

''میں بتاتی ہوں''انہوں نے کھڑے کھڑے اُس زبانی جھڑپ کا آغاز کیا جس میں انہیں خداداد صلاحیت حاصل ہے''تم کہتے ہوٹی وی سیٹوں نے اجتماعی طور پر کام کرنا چھوڑ دیا ہے؟''

''ہاں''ہماری زبان لڑکھڑائی''لیکن دراصل...''

اپنی بات اور خود اپنے آپ کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں''اور تمہارا کہنا ہے کہ ماحول کی آلودگی اور گرم و خشک موسم کے باعث ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں''ہم نے اعتراف جرم کیا''اس لیے کہ...''

''اور تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ الیکٹرانک آلات انسانوں کی طرح حسّاس ہوتے ہیں حالانکہ علامہ اقبالؔ نے کہا تھا کہ''احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات''یعنی آلات خود کوئی اثر نہیں لیتے،دوسروں کے احساس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔''

''علامہ اقبالؔ نے یہ بات خاص طور پر الیکٹرانک آلات کے لیے تو نہیں کہی تھی۔''ہم نے ان کے ادبی ذوق کو چیلنج کیا''وہ تو ایک عمومی فتویٰ تھا۔''

''یہ فتویٰ اپنے پاس سنبھال کر رکھیں''اب وہ پوری طرح برقا چکی تھیں''تمہاری ہر منطق کی قلعی کھل گئی ہے۔آج میں نے محلے کے چند گھروں میں جا کر خود دیکھا ہے۔سب کے ٹی وی ٹھیک ٹھاک کام کر رہے ہیں۔نہ ان پر موسم کا اثر ہے نہ آلودگی کا۔ساری آلودگی تمہارے اپنے ذہن میں ہے جسے تم کاغذ پر منتقل کر کے خود کو ہلکا اور ماحول کو بوجھل کر دیتے ہو۔''

زمین ہمارے قدموں تلے سے کھسکتی جا رہی تھی۔تاہم ہم نے خود کو سنبھالا اور لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے انہیں مخاطب کیا

''''یہ تو ماڈل اور سیٹ کی عمر پر منحصر ہے خاتون!ہمارا ٹی وی خاصا پرانا ہو گیا ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے۔''

''یہ مسئلہ نہیں''اب انہوں نے منطق کا سہارا لیا''یہ تو مسئلے کا حل ہے۔''

ہم نے اس خود تر دیدی نظریے کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا''کیسی بچکانہ باتیں کرتی ہو۔بھلا مسئلہ خود کبھی حل بنا ہے؟''

کیوں نہیں''انہوں نے توجیہہ پیش کی''چونکہ پرانا ٹی وی نا قابل مرمت ہے اس لیے اس کا حل یہ ہے کہ اسے نئے سیٹ سے بدل دیا جائے اور یہ کام کل تک ہو جانا چاہیے۔''

اب ہماری حالت یہ تھی کہ بقول شاعر''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا''۔ہم نے مفاہمتی پالیسی اختیار کرتے ہوئے انہیں یقین دلایا''چلو ٹھیک ہے،کل تک اس سیٹ کی مرمت ہو جائے گی۔تم فکر نہ کرو۔''

''ہرگز نہیں''انہوں نے دوٹوک لہجے میں متنبہ کیا''اس موسم زدہ اور آلودگی کے مارے ٹی وی کی مرمت نہیں ہو سکتی۔مجھے نیا ٹی وی چاہیے اور وہ بھی کل تک۔''انہوں نے''طاہر شاہی''انداز میں الٹی میٹم دیا۔ہم نے انہیں اپنی مجبوری بتائی''مہینے کے آخری دنوں میں نیا

ٹی وی کیسے آ سکتا ہے؟ یہ آپ کی عمر ہے ضد اور بے جا فرمائش کرنے کی؟''

بس جناب، عمر کی یاد دہانی پر تو وہ پھٹ پڑیں۔ پہلے ہم پر ذہنی اذیت پہنچانے کا الزام دھرا۔ بعد ازاں دوپٹہ سر کے گرد کس کے باندھا، اس کے ایک پلو کو ہاتھ میں تھاما، دو سسکیاں لیں اور پھر تو حال یہ ہو گیا کہ ''اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔''

اس نہر میں ہماری ساری جمع پونجی بہہ گئی۔ نیا ٹی وی دوسرے دن ہی آ گیا۔ شاہکار تو کیا تخلیق ہوتا، یہ ٹوٹا پھوٹا مضمون لکھتے وقت بھی وہی ٹی وی ہمیں ''ڈسٹرب'' کر رہا ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ میڈیکل کالجوں میں یورولوجی کی طرح ''ٹیئر ولوجی'' بھی پڑھائی جائے تا کہ عورتوں کی اس ''فنِ حقیقہ'' پر سے اجارہ داری کا خاتمہ ہو سکے اور مرد بھی سینہ تان کے کہہ سکیں۔

مری آنکھوں میں یارو اشک ایسا موج مارے ہے کہ جیسے ساغرِ سیمیں میں صبا موج مارے ہے
(سوداؔ)

◆◆◆

تخلیقی عمل ـــــ تخلیق کائنات کے حوالے سے

(ڈاکٹر وزیر آغا)

''ایم سٹرانگ تھیوری ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری یہ کائنات تین برین کے اندر ہونے کی وجہ سے تین مکانی ابعاد پر مشتمل ہے۔ لیکن دیگر برین (Branes) میں ابعاد کی تعداد مختلف ہے۔ ایک برین سے لے کر دس برین تک ہر برین اپنے اندر کے ابعاد کے حوالے سے ایک مختلف وضع کی کائنات کو وجود میں لاتا ہے۔ چونکہ مکانی ابعاد کی کل تعداد دس ہے (گیارہواں ''بُعد'' وقت کا ہے) اس لیے مختلف وضع کی دس کائناتوں کا امکان بہر حال واضح ہے۔ سائنس نے اس سارے منظر نامے کو ملٹی ورس (Multiverse) کا نام دیا ہے۔

اب (تخلیقِ کائنات) کی تصور کچھ یوں بنتی ہے کہ کالی شکتی (Dark Energy) کے متلاطم سمندر سے ہمہ وقت مختلف ابعاد کے حامل برین، غباروں کی طرح پھولتے ہیں اور اپنی اپنی کائنات کو وجود میں لاتے ہیں۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہر کائنات (مدّ ور) Cyclic ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک معیّن عرصے کے بعد اس مقام پر لوٹ آتی ہے جہاں سے اس نے پھولنا شروع کیا تھا۔ مگر اس دوران میں مزید کائناتیں غباروں یا بلبلوں کی طرح پھول رہی ہوتی ہیں..... گویا ''ملٹی ورس'' کے اندر تو کائناتیں پھولتی اور سکڑتی رہتی ہیں یعنی ان میں سے ہر کائنات کی ازل بھی ہے ابد بھی..... مگر پورے ملٹی ورس کی کوئی ازل یا ابد نہیں۔ یعنی ملٹی ورس ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم Ultra Microscopic Level کو ملٹی ورس کی آخری حد قرار دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سائنس دان تیقّن سے کچھ نہیں کہہ سکتے تاہم بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آخری حد کو ہم ''سب کچھ'' کہہ رہے ہیں وہ ''اصل حقیقت کا محض ایک پرت ہو۔ ایسی صورت میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ طبیعیات، مابعد الطبیعیات میں ضم ہو کر اس عظیم ترین حقیقت کا اقرار کرنے لگی ہے جو تمام قوتوں اور تمام تر اجزا کو اپنی بے نہایت کشش کے ہالے میں سمیٹے ہوئے ہے اور جو تخلیقی عمل کا منبع اور مصدر ہے۔''

(مئی 2009ء۔ تخلیق عمل، ص 181، مجلس ترقیِ ادب، لاہور)

جائزے

دیکھنا تقریر کی لذت
(گوپی چند نارنگ کے ادبی مکالمات)

محمد متین ندوی (انڈیا)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بارے میں کچھ لکھنا مجھ جیسے طالب علم کے لئے ایک بڑا امتحان ہے، میں اپنے چند تاثرات مشتاق صدف کی مرتّب کردہ کتاب ''دیکھنا تقریر کی لذّت'' کی روشنی میں پیش کرتا ہوں۔ گوپی چند نارنگ صاحب کی تحریریں تو اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہی ہیں ان کی تقریر، ان کا انداز تکلم بھی اپنی مثال آپ ہے، ان کی تحریروں کی طرح ان کی تقریروں اور ان کے مکالمات میں بھی وہ تاثیر ہوتی ہے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں، دل سے کہتے ہیں۔ نارنگ صاحب کی تقریر اور طرز گفتگو کے سلسلہ میں چند نامور ادیبوں کی رائے پیش ہے:

''ڈاکٹر نارنگ لسانیات ہی کے نہیں لسّانیات کے بھی ماہر ہیں۔ تقریر ایسی کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ دو تین سال پہلے پاکستان ٹیلی ویژن سے ان کا ایک طویل انٹرویو دیکھا اور سنا۔ نارنگ صاحب جب گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نارنگ نہیں بول رہے ہیں علم بول رہا ہے.....!'' (مشفق خواجہ)

''نارنگ صاحب کو قدرت نے خطابت کا جوہر بھی فیاضی سے ودیعت کیا ہے۔ یہ جوہر ادیبوں میں تو خال خال ہی پایا جاتا ہے۔'' (انتظار حسین)

گوپی چند نارنگ کے ادبی مکالمات ''دیکھنا تقریر کی لذت'' کے نام سے جب کتابی شکل میں پڑھنے کا موقع ملا تو بہت سی ایسی باتیں سامنے آئیں جو عام طور پر مضامین کے مطالعہ سے نہیں معلوم ہوسکتیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے پڑھنے سے اردو زبان و ادب کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ عام تحریروں کے مقابلے میں مکالمات کے ذریعہ مکالمہ نگار کی شخصیت اور اس کی علمیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے کیونکہ مکالمے میں برجستہ جواب دینا پڑتا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ مکالمات کے ذریعہ بہت سی وہ باتیں بھی سامنے آجاتی ہیں جنھیں ایک ادیب، شاعر، محقق یا نقاد کسی بھی وجہ سے نہیں لکھنا چاہتا، لیکن انٹرویو کے درمیان کبھی کبھی ایسے سوالات بھی سامنے آتے ہیں کہ جن کا جواب دیتے ہوئے دل کی بات زبان پر آجاتی ہے، اس طرح سے مکالمہ نگار کی شخصیت کے تمام پہلو، اس کی سوچ اور فکر کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، بعض لحاظ سے مکالمات کو مضامین پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔ مکالمات کے سننے اور پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب کے ان مکالمات کو پڑھنے کے بعد میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ سیکڑوں کتابوں کا علم ان مکالمات میں موجود ہے، بس

بات یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے ظرف اور اپنے اپنے علم کے لحاظ سے ہی ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔لیکن بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کے یہ مکالمات پوری ادبی تاریخ، ادبی تحریکات کی نشو ونما، ان کے عروج اور زوال کی داستان اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ کلاسیکی تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سب پر نارنگ صاحب نے بڑے سلیقے سے علمی و ادبی انداز میں روشنی ڈالی ہے، انھوں نے پوری ادبی تحریکات کے حسن و قبح کا ذکر کیا ہے۔اور یہی ایک دانشور، محقق و نقاد کا طریقہ بھی ہے۔ان مکالمات میں ادب کی عظیم شخصیات کے ساتھ ساتھ ان اہم ادبی شخصیات کا ذکر بھی موجود ہے، جن سے آئندہ کی امیدیں وابستہ ہیں، دور حاضر کے اہم ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور نقادوں کے نام بھی موجود ہیں۔اور ان کے کاموں کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نارنگ صاحب کے مکالمات کو پڑھنے سے صرف ہندوستان یا پاکستان کی ادبی صورتِ حال کا ہی علم نہیں ہوتا، بلکہ جہاں جہاں اردو زبان بولی اور لکھی جاتی ہے وہاں کے ادبی ماحول اور ادبی صورت حال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ادب کی کسی ایک صنف پر ہی نہیں بلکہ جملہ اصناف پر نارنگ صاحب نے اظہار خیال کیا ہے، گوپی چند نارنگ کے چند مکالمات دیکھئے:

شاہد پرویز: ''تقسیم کے بعد کیا اردو میں کوئی ایسا شاہکار ناول تخلیق ہوا ہے جسے ہم عالمی ادب میں رکھ سکیں؟''

گوپی چند نارنگ: ''جی ہاں۔اس بارے میں صرف تین ناولوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' اور راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی۔''

نند کشور وکرم: ''کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کی تحریک نے ادیبوں کو بھٹکایا تھا جیسا کہ بہت سے ادیبوں نے بعد ازاں اس کا اعتراف کیا ہے اور اس کے لئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے، جن کے رسالے 'شب خون' کو جدیدیت کا ترجمان کہا جاتا ہے۔''

گوپی چند نارنگ: ''جدیدیت بھی اپنے زمانے میں وقت کی آواز تھی۔ادب اور سیاست میں رشتہ ہے لیکن ادب یکسر سیاست کے تابع بھی نہیں۔جب ذہنی آزادی پر قدغن لگائی جانے لگی اور ادب میں کلیت پسندی، نعرے بازی اور پروپیگنڈہ کی لے بہت بڑھ گئی یا ادب کی ادبیت پر اصرار کرنے والوں کو رجعت پسند یا ظلمت شعار کہہ کر ان کا بائیکاٹ کیا جانے لگا تو ادیب کی ذہنی آزادی اور ادب کی ادبیت کا تحفظ وقت کی ضرورت بن گیا۔سیاسی آمریت اور کلیت پسندی کے خلاف آواز اٹھانا بھی ادب کا بنیادی کردار ہے۔بالکل جس طرح بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانا ادب کا کردار ہے۔تحریکیں جب انتہا پسندی کا شکار ہو جاتی ہیں، تو خود اپنے ہی ہتھیاروں سے خودکشی کرتی ہیں۔'شب خون' نے تاریخی کردار ادا کیا لیکن اشکال پسندی، لایعنیت، ہیئت پر ضرورت سے زیادہ اصرار یا سماجی ثقافتی آئیڈیالوجیکل سروکار سے یکسر بے تعلّقی اختیار کرنے کی وجہ سے بعد میں جدیدیت کے خلاف بھی ردِعمل ہوا، جس کا عکس آپ کے سوال میں ہے۔ادب میں عمل در عمل و عمل ردِعمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے علمی و تحقیقی اکتسابات غیر معمولی ہیں لیکن وہ انتہا پسندی اور حکم ناموں کو جاری کرنے کا شکار نہ ہوئے ہوں ایسا بھی نہیں ہے۔''

سعادت حسین: ''آپ کے خیال میں تنقید نویسی کے کیا کیا تقاضے ہیں؟''

گوپی چند نارنگ: ''نقاد کے لئے فن پارے سے انصاف کرنا ضروری ہے اور فنکار اور فن پارے کے زمانے اور عصر کو سمجھنا بھی۔ نقاد کی نظروں سے فن کار کی شخصیت بھی اوجھل نہیں ہونی چاہئے۔ وہ تحسین شناسی، ادب کی افہام و تفہیم اور قدر شناسی کا حق ادا کرے، ملفوظی اور معنیاتی نظام دونوں کے بارے میں ڈوب کر لکھئے، سخن فہمی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ بے جا فقرے بازی اور ذاتی جملوں، طنز و استہزا سے گریز کرے۔ سنجیدہ علمی روایات سے اپنا رابطہ استوار رکھے۔''

نارنگ صاحب کے مکالمات میں ساختیات، پس ساختیات، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ہندوستان میں اردو زبان اور ادب کی صورت حال، پاکستان میں اردو زبان اور ادبی صورتِ حال، مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اسی کے ساتھ ساتھ تمام ادبی اصناف کی عظیم اور قابلِ ذکر ادبی شخصیات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ نارنگ صاحب کی شخصیت اور ان کے ادبی سفر کی داستان بھی ان مکالمات میں موجود ہے، نارنگ صاحب کا اردو سے تعلق کسی ضرورت کے پیش نظر نہیں بلکہ اردو سے ان کے عشق کا سبب ہے انھوں نے اپنے ادبی سفر میں سود و زیاں سے نہیں بلکہ ہمیشہ تہذیبی قدروں سے سروکار رکھا ہے۔

یہاں پر یہ بات کہیں جا سکتی ہے کہ نارنگ صاحب ہی ہیں جنھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اور انھیں اپنی صلاحیت کی بنا پر آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم کئے۔ جب ہم ساہتیہ اکیڈمی کے شرکاء پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان میں صرف انھیں ادیبوں اور شاعروں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، جو ادب میں یا تو اپنے کاموں کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں، یا وہ ابھی اس مقام پر تو نہیں پہنچے لیکن ان کی ادبی رفتار ایسی ہے کہ ان سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہے۔ وہ رسمی سیمینار نہیں کراتے، بلکہ ہمیشہ وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ جن کی ادب میں ضرورت ہوتی ہے، دوسری طرف وہ ایسی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں، جن پر کم توجہ دی گئی ہو یا پھر توجہ تو دی گئی ہو لیکن ان کے اصل کام پر توجہ نہ دی گئی ہو تو اس خصوصیت کی طرف لکھنے والوں کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے سیمنار کرواتے ہیں۔ کبھی کبھی ان اصناف پر بھی سیمینار کرواتے ہیں، جن پر ضرورت ہونے کے باوجود توجہ کم ہوتی ہے، تاکہ ان پر توجہ دی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت پر سیمینار، آزادی کے بعد اردو شاعری پر سیمینار، آزادی کے بعد اردو فکشن، آزادی کے بعد اردو تنقید جیسے موضوعات پر سیمینار کرانا یہ نارنگ صاحب کا ہی کارنامہ ہے۔ سیمینار بھی ایسے کامیاب کہ ان میں شریک ہونے والے آج بھی ان سیمناروں کو یاد کرتے ہیں، ان سیمیناروں کا اثر بھی تمام ادبی دنیا پر ہوا، جس کے اثرات دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ نارنگ صاحب نے کافی عرصہ پہلے یہ بات کہی تھی کہ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہوگی، صرف زبانی کہہ کر ہی الگ نہیں ہو گئے بلکہ اس کے لئے انھوں نے بساط بھر کوشش بھی کی، یہی وجہ ہے کہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اکیسویں صدی یقیناً فکشن کی صدی ہوگی۔

◆◆◆

پلٹ کر جا چکی ہیں ساری لہریں　　سمندر اب اکیلا رہ گیا ہے

.....

کچھ لوگ لے گئے ہیں خدائی سمیٹ کر　　ہم کو تو ڈھونڈنے سے خدا تک نہ مل سکا

(اظہر جاوید)

''سورج کے آس پاس'' میری نظر میں

حسن عسکری کاظمی

بابری مسجد کی شہادت سے پہلے بھارت میں ایک مشاعرہ ہوا جو شام بہار ٹرسٹ کے تحت مسٹر ملہوترا نے منعقد کرایا تھا۔ اس میں ایک نوجوان شاعر نے بھارت کے متعصب سر پھرے افرادِ انسانی سے خطاب کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا۔ مشاعرے میں یہ شعر بار بار سنا گیا۔

رستے الگ الگ سہی منزل تو ایک ہے　　یہ مسجدیں گئیں تو شوالے بھی جائیں گے

مگر ہوا وہی کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ دراصل بھارت میں سیکولر نظام رائج ہے لیکن صدیوں پرانے قضیے سر اٹھاتے ہیں اور بھارتی حکومت کو لرزہ بر اندام کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شعر و ادب سے گہرا شغف رکھنے والے افراد سادہ دل بھی ہیں اور احترام آدمیت میں یقین بھی رکھتے ہیں چنانچہ ان کے ہاں ہر عہدے بے تعبیر میں وہی بات دہرائی جاتی ہے کہ ہم سب فرزندان آدم ہیں۔ عقائد میں اختلاف اپنی جگہ لیکن ہر مکتب فکر میں اشتراک فکر و عمل کا درس ملتا ہے، سب کی تعلیم اتحاد و اتفاق پر موقوف ہے، چنانچہ عصر حاضر کے نوجوان فکر شاعر مراق مرزا کی شاعری کے مجموعے ''سورج کے آس پاس'' میں جس شعر نے چونکا دیا ہے وہ اسی خیر عمل کا اظہار ہے۔

ان کے میناروں سے آتی ہے اجالوں کی صدا　　ہیں یہ مسجد یہ کلیسے، یہ شوالے سورج

اسی مشاعرے میں ایک جواں سال شاعرہ جو بینائی سے محروم تھی، نے جو غزل ترنم سے پیش کی، اس میں حسرت و یاس کا ایسا منظر نامہ دیکھا کہ سامعین کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، اس کے ہاں بھی سورج نے عجب رنگ بکھیرے تھے۔

میں نے کوئی سورج کوئی تارہ نہیں دیکھا　　کس رنگ کا ہوتا ہے اجالا نہیں دیکھا

اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ سورج سے آدمی کا رشتہ اور زمین پر آباد افراد انسانی کی اجتماعی زندگی کا انحصار اسی چشمۂ نور پر ہے جسے آفتاب عالم تاب یا سورج کہا جاتا ہے، مراق مرزا نے اسے التزاماً غزل کے ہر شعر کا استعارہ بنایا ہے۔ ضمیر کاظمی کا یہ کہنا درست ہے کہ ''یک موضوعی غزلوں کے اس مجموعہ میں سورج کو انہوں نے سینکڑوں زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جو ان کا ایک اہم کارنامہ ہے''، غزل میں رسیلا پن اس کی وہ خوبی ہے جو قاری کے دل کو لبھاتی ہے۔ ''سورج کے آس پاس'' کی غزلوں کو پرکھا جائے تو مراق مرزا کی غزلیں اس وصفِ خاص سے عاری دکھائی دیتی ہیں مگر اس کے باوجود ان کا اجتہادِ فن غزل کے آفاق کو وسیع کرنے کے امکانات سے مزّین ہے، یہ شعوری کاوش کہ ہر شعر میں سورج کو موضوعِ سخن بنا کر پیش کیا گیا ہے ایک ایسا معنوی تجربہ ہے کہ اس کی بہت سی جہتیں ابھر کر سامنے آ گئی ہیں، اسے ہم فکری تنوّع اور جدّت طرازی بھی کہہ سکتے ہیں۔

مراق مرزا کا تخلیقی سفر فلم انڈسٹری میں کہانی کار یا مکالمہ نگار کی حیثیت سے ہوا مگر انہیں قدرت نے ایک سخن ور بنا کر نیا راستہ اور نئی منزل سے آشنا کر دیا۔ وہ قاری سے مکالمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''تخلیقی سفر کے آغاز کے لئے فکر کی نگاہ میں شعری ادب کا انتخاب کیا۔ یہ سوچ کر کہ مستقبل میں اگر میری کہی ہوئی کسی غزل کا کوئی شعر یا نظم کا کوئی حصہ کسی ایک قاری کو بھی فکری طور پر متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائے اور وہ قاری اپنی آنکھوں میں کوئی بڑا خواب سجانے پر آمادہ ہو جائے تو بحیثیت قلمکار یہ میری اہم اور اطمینان بخش Achievement ہوگی کیونکہ فلموں کے ذریعے کوئی Inspirational بات کہنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اسی خیال کے زیرِ تحریک میری شاعری کے سفر کی ابتدا ہوئی''

اس میں شک نہیں کہ شاعری ماورائی قوتِ تخلیق کا استعارہ ہے، یہ کارِ ہنر کسی کی ذاتی کوشش و کاوش سے انجام نہیں پاتا بلکہ وجدانی ترفع کا ایسا معجزہ ہے جس کی شرح کرنا بھی ممکن نہیں البتہ فنی اجتہاد شاعر کی ذاتی ریاضت کا حاصل ہے، مراق مرزا نے اپنی پوری شاعری میں محض ایک ہی موضوع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قاری سے یہ توقع رکھی ہے کہ وہ اس فکری حادثے کو قبول کر لے کہ اس میں ایک ہی خیال کو دہرانا ان کی مجبوری بن گئی ہے۔ اور ہاں وہ میزان ذات کے حوالے سے پتے کی بات کر گئے ہیں کہ ایک طرح سے آدمی کے اندر کا میزان ہی اس کے سفرِ حیات میں موقع بہ موقع اس کی رہنمائی کرتا ہے'' اس رہنمائی کے نتیجے میں انہیں غزل کا انتخاب کرنا اور واحد استعارہ سورج برتنا بھلا معلوم ہوا، یہ ''سورج'' ان کے ہاں تکرار سے آنے کے باوجود معنوی سطح پر قاری کو نئے امکانات سے روشناس کراتا ہے۔

بند آنکھوں سے اجالوں کا تصور کیجیے وادیٔ شب میں بھی مل جائے گا گھر سورج کا

.....

کوئی تو ہے، پسِ منظر ہے کرشمہ جس کا کر رہا ہے یہ سفر کس کے سہارے سورج

مراق مرزا نے عصری صداقتوں کی ترسیل کو شعری لباس میں ذوقِ جمال کی تسکین کی خاطر پیش کرتے ہوئے کمالِ مہارت سے کام لیا مثلاً:

تپتے صحرا کی طرف موڑ دو دریا کوئی کسی تاریک دریچے پہ سجاؤ سورج
فرض یہ بھی تو ہے دنیا میں تمہارا کہ مراق رہگذر سے کسی مفلس کے ہٹاؤ سورج

مراق نے غزل میں غیر شعوری طور پر ہندی الفاظ برتے جو کہیں بھلے اور کہیں نامانوس یا مغائرت سے مملو ہیں مثلاً چمتکار، امبر، بن دکھے، آکاش، دھرتی اور اس نوع کے دوسرے ہندی الفاظ برتنے کا سبب یہ ہے کہ بھارت میں پیدا ہونے والی نئی نسل کے لوگ اپنے ملک کی عام بول چال میں بھی ہندی الفاظ برتنے لگے ہیں، مرزا مراق نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ تکرار یا اعادہ نقص ہے مگر اسے گوارا کر لیجئے۔ اور یوں ''سورج کے آس پاس'' میں مراق مرزا کی تخلیقی قوتِ اظہار میں ہر قسم کی کہکشائیں دکھائی دیتی ہیں مگر تغزل یا رسیلا پن کسی درماندہ ستارے کی طرح نظر آتا ہے۔ شاید وہ بکھری ہوئی معنوی پرتوں میں یہ اظہار کسی اور جگہ کر چکے ہوں۔

افکار کے صحرا کو بنانا جو ہو گلشن گھرا پنا بناؤ کہیں سورج کی زمین پر

◆◆◆

''اظہر جاوید کی نظموں کا بنیادی نکتہ محبت ہے۔ پاکیزگی کے ساتھ۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا)

تخلیق، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اور شام

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

یہ درد بھی بڑی ظالم چیز ہے جب ہوتا ہے تو ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر اس دردِ دل نے تو آنسوؤں سے ایسا رشتہ گانٹھ لیا ہے کہ کوئی لاکھ روکے مگر آنسو ہیں کہ اُمنڈے چلے آتے ہیں۔ پاس ناموسِ عشق کی وجہ سے انسان انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ آنکھ کے کوزے میں ہی بند رہیں مگر یہ بھی پلکوں تک آن ٹپکنے کی ضد کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنسو اگر ٹپک پڑیں تو نجانے کیوں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے حالانکہ شاید درد کی وجہ وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ تاہم اس درد آشنائی کے بغیر بھی تو زندگی کے اسرار و رموز کہیں کھلنے نہیں پاتے۔ درد کی لذّت سے جو ناواقف رہا اس نے بھلا زندگی کو کیسے سمجھا۔ درد بھری شب ختم ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ نظروں سے اوجھل ہوتی ہے تو روشنی کی کرنیں طلوعِ صبح کی نوید سناتی ہیں۔ مگر وقت کے پہیے نے تو چلتے ہی رہنا ہوتا ہے۔ دن بھر کی روشنی کے بعد آخر شام آ کے ہی رہتی ہے۔ پھر نجانے کیوں یہ شام ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی آنکھوں میں آ کے ٹھہر جاتی ہے۔

شام کے وقت سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتے ہیں۔ شام کے اس منظر میں روحانیت کی چاشنی بھی گھل مل جاتی ہے۔ اداسی گھیرا ڈالنا شروع کر دیتی ہے۔ کوئی اہلِ دل اور اہلِ درد اس اثر سے بچ نہیں پاتا اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی روح میں تو شام ایسے رچ بس گئی ہے کہ وہ ان کے اشعار میں جا بجا در آئی ہے۔ جیسے وہ کہتی ہیں :

مرے آنگن میں جب بھی شام کے سائے اترتے ہیں　　مجھے شاہیں محبت کا ہی سایہ یاد آتا ہے

یا وہ جیون کی شام کے حوالے سے فرماتی ہیں :

جیون میں دائمی سی کوئی شام کر گیا　　وہ رت جگے ابد کے مرے نام کر گیا

یوں لگتا ہے شام کا منظر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظر سے اتر کر ان کی ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے اور پھر ان کی روح میں سرایت کر گیا ہے تبھی تو اسی شام کے نام اپنی غزل میں لکھتی ہیں :

میری پلکوں کی چلمن میں جو خواب تھے　　وہ تو سب جل گئے اس بجھی شام میں
ہر طرف اشک اور سسکیاں ہجر کی　　درد ہی درد ہے ہر گھڑی شام میں

جب روشنی شام میں گم ہونے لگتی ہے تو درد کی شدت بھی بڑھنے لگتی ہے تب وہ پکار اٹھتی ہیں۔

درد کی شدت اور بڑھی تھی شہرِ وفا کی شاموں میں　　اور ویرانی بیٹھ گئی تھی ان آنکھوں کے پانی میں

اور جب شام ہوتے ہی آنکھوں کے پانی میں ویرانی قدم جمانے لگتی ہے تو وہ کہہ اٹھتی ہیں۔

شام کی دہلیز پر لیں درد نے انگڑائیاں جاگ اٹھے ہیں غم سبھی اور رو پڑیں تنہائیاں
بے بسی کی شام پر سسکی ہے پہروں زندگی خواب کی خواہش میں ہم تو کھو چکے بینائیاں

وفا کی تلاش میں بھٹکتی شاہین سمجھتی ہے کہ اس دورِ جبر میں جینا بہت محال ہے تبھی تو وہ وفا ہی کو مخاطب ہو کر کہتی ہیں۔

رستے میں شام ہوگئی اب تو ذرا ٹھہر کتنا ہمیں تو اور تھکائے گی اے وفا
کب تک رہے گی منتظر شام وصال کی کب تک فریب دوستی کھائے گی اے وفا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی ہم سب کی طرح زندگی کے راز کو پانے اور اس گتھی کو سلجھانے میں مگن نظر آتی ہی۔ کی جاناں میں کون؟ کی تلاش ہی انسان کو درد سے آگاہی اور زندگی کے اسرار و رموز کی جانکاری کے رشتے کی طرف لے جاتی ہے۔

وہ اس دکھ سے بھی آگاہ ہیں جو شام ہوتے ہی ناداروں کے سینے میں اتر آتا ہے۔

کیسے کٹتی ہے اداسی میں ہر ایک شامِ فراق دو گھڑی تم بھی گزارو کبھی نادار کے ساتھ

زندگی میں کہاں کسی لمحے کو دوام ملا ہے گو ایسے لمحے لوٹ کے نہیں آتے مگر وہ منظر دائمی طور پر ہمارے اندر رچ بس جاتے ہیں۔ ہم تمنا تو کرتے ہیں کہ وہ پیار بھرے لمحے لوٹ آئیں مگر یہ کہاں ممکن ہو سکا ہے۔

جب ان لمحات کو کوئی ڈھونڈ کر واپس نہیں لاتا، کلام نہیں کرتا دوام نہیں بخشتا تو کہہ اٹھتی ہیں۔

نہ دن نکلتا ہے اس کا، نہ شام ہوتی ہے اب اس طرح سے بھی کوئی جہاں میں رہتا ہے
میں اس طرح سے ہوں آزاد اپنی دنیا میں کہ جیسے کوئی پرند آشیاں میں رہتا ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اور تخلیق کے عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلا عمل تو وہ تھا جب خدا تعالیٰ نے نہایت خوبصورتی اور فرصت کے لمحوں میں انہیں تخلیق کیا۔ پھر انہوں نے آسمان پہ رہنے والے خالق اور زمین پہ پیدا کرنے والی پیاری ماں سے محبت کر کے ان کی شکر گزار ہوئیں تو رب کریم نے انہیں ایسے شعبہ میں داخل کر دیا کہ جہاں پہلے انہوں نے تخلیق کے عمل کو پڑھا، سمجھا اور دیکھا بھی اور پھر اس کے خاص کرم سے ماں بننے کے عمل سے بھی گزریں اور میڈیکل کے ایسے نسوانی شعبے سے وابستہ ہوئیں جہاں قدرت کے اس تخلیقی عمل میں بطور ماہر امراض نسواں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ تاہم بات یہیں پہ ختم نہیں ہوئی کہ اس تخلیقی عمل نے ان کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ دماغ میں دوڑتی گنجلیں اپنی جگہ مگر یہ دل ایسے مچلا کہ اس میں بسے سب خیالات شاعری کی صورت میں صفحہ قرطاس پہ آن بکھرے اور پھر ان لفظوں کی خوشبو کی مہک سارے جہاں میں پھیل گئی۔ فی الحال تو یہ مہک تیسرے شعری مجموعہ ''اور شام ٹھہر گئی'' تک آن پہنچی ہے۔ اس سے پہلے وہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کی تلاش میں رہی ہیں۔ پھر انہیں خوشبو کہیں پھرتی پھراتی مل گئی تو اس کے احساس کو روح میں اتارتے ہوئے کہنے لگیں ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' پھر جو پلکیں وا ہوئیں تو دیکھا کہ ''اور شام ٹھہر گئی'' ہو جیسے.....ابھی رتجگوں کی داستانیں باقی ہیں۔ ابھی امید سحر باقی ہے لیکن اپنے تخلیق کئے جانے کے مقصد کی تلاش میں وہ ادب اور انسانیت کی خدمت کیے جا رہی ہیں۔ سچّے اور سُچّے من سے تلاش جاری رہی تو بھلا وہ ایک سندر سی منزل کیونکہ نہ پالیں گی جہاں وہ ادب اور انسانیت دونوں میدانوں میں سرخرو ٹھہریں گی۔ ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گی۔

◆◆◆

پُر آشوب شہر گرہن

دل نواز دل

فخر زمان کے تازہ ترین مجموعہ غزلیات ''شہر گرہن'' میں غزل کی وحشت کو دیدۂ عبرت اور حیرت کی زنجیر کو عدل سے باندھ کر اس کو احسان کے شعری حلقوں سے جوڑا گیا ہے۔ اس طرح اس زنجیرِ زر کی جھنکار دور دور تک سنائی دینے والی ہے۔ شرط ہے تو صرف گوشِ نصیحت نیوش کی جس کی وجہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہونا چاہیے کہ مجموعہ آنکھوں کے سامنے ہے اور یہ دل سے پڑھے جانے کا حقدار ہے۔

شہر آشوب وہ نظم ہے جو کسی شہر کی بربادی اور تباہ حالی پر منظوم کی جائے۔ اس کے آشوب میں جہاں نظر کی خرابی ہے وہاں دل کی براندازی کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ نظر کی تیزی اور دل کی فتنہ انگیزی کا سبب ہوتا ہے۔ جس میں شہر کے سب لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کے ہونے اور نہ ہونے کا المیہ ہے۔ یعنی لوگوں کے ہوتے ہوئے اور نہ ہوتے ہوئے بھی تباہی کا بیانیہ شہر آشوب ہوتا ہے۔

فخر زمان کا ''شہر گرہن'' اس گھمبیر اور گہرے سایے کی بات کرتا ہے جس نے شہر میں بسنے والے تمام لوگوں کی سوچوں کو گہنا دیا ہے اور دلوں پر ایسا سایہ ڈالا ہے جس نے نظروں سے دیکھنے کی قوت سلب کر دی ہے۔ اور یوں ہر کسی کو بغیر کچھ جانے، پہچانے اور مانے قتل و غارت کے بھیانک سایوں کی طرف دھکیل دیا ہے۔

گرہن لگنا، زمین کا چاند سورج پر پڑتا ہوا سایہ ہے۔ یا پھر سورج پر چاند کی، یا چاند کی سورج پر پڑتی چھایا ہے۔ مطلب لگنے اور پڑنے کا صرف اور صرف وہ اندھیرا ہے جو زمین، چاند اور سورج کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیتا ہے۔ اور یوں یہ سیاہی، وقتی طور پر ہی سہی دنیا کی روشنی کو کم کر دیتی ہے۔ فخر زمان نے شہر کے ساتھ گرہن کو جوڑ کے ہم سب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے جس طرف تاریکی کے سایے ہیں اور یہ اب پھیلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ خدا کرے یہ وقتی ہی ہوں۔ کہ ان کا توڑ کرنا وقت کی اشد ترین ضرورت ہے۔

شہر گاؤں سے متمیز وہ جگہ ہے۔ جہاں بڑا کاروبار، بڑے مکانات، بڑی سڑکیں اور پارک وغیرہ ہوں۔ جہاں زندگی کی گہما گہمی اور رونقیں عروج پر ہوں۔ اور جہاں گاؤں کے اندھیروں کی بجائے روشنیاں ہی روشنیاں ہوں۔ فخر زمان کے مجموعہ غزلیات کا پہلا شعر ہے:

سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے، لوگ ہیں سارے سہمے سہمے　　روشنیوں کے شہر کو جانے کس نے لگایا شہر گرہن

اس شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باطنی طور پر یہ شعر روشنیوں کے شہر کراچی کے حوالے سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ اور آج، کل کے اس روشنیوں کے شہر کو دیکھ کر لگتا ہے، کہ تاریکی میں پڑے اس شہر کی لوحِ تربت پر کتبے کی صورت میں یہ شعر لکھا جانا چاہیے۔ یہ شعر اگر سنگِ مرمر پر لکھ کر تربت کے سرہانے لگایا جائے تو گذرے روشن دنوں کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ یہ بات میں نے کراچی کے شہر کے لئے مفروضے کے طور پر کہی ہے۔ حالانکہ یہ شعر اب پاکستان کے ہر شہر پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔

چاند کو زمین، سورج کو چاند اور سورج کو زمین جب گہناتی ہے تب ہماری دنیا کو یعنی ہمیں ان کا سایہ زمین سے نظر آتا ہے۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد یہ گہن، یہ سایہ چھٹ جاتا ہے اس سایے سے جو بھی تباہی آتی ہے وہ بظاہر ہم پر کوئی بُرا اثر نہیں چھوڑتی۔ یہ سایہ زمین، چاند اور سورج کے محیط کا کیا دھرا ہوتا ہے جو گردشِ دوراں کی وجہ ہے۔ یہ سایہ ہم سب کا احاطہ کرتے ہوئے بھی ہمیں ظاہری طور پر اپنے اثر میں نہیں لیتا۔ ہاں باطنی طور پر چند پیدائشوں اور کچھ آفرینشوں کے قبول میں بگاڑ ضرور پیدا کر جاتا ہے۔ جس سے عام زندگی متاثر نہیں ہوتی۔ لیکن شہر گرہن کی بات اور ہے۔ اس کی وجہ سے شہر کے لوگ، یہاں کا کاروبار زندگی، روزمرہ کے حالات، یہاں کے محلات، مکانات، بازار اور دکانیں، لوگوں کے ذہن، آنکھیں اور دل اور روز روز کی نت نئی آنے جانے والی تخریب کاریاں، دہشت گردیاں اور خودکش حملے جہاں وحشت کا سبب بنتے ہیں وہاں حیرت کو بھی جنم دیتے ہیں جو فخر زمان کے مجموعے میں لکھی فرد فرد غزل اور شعروں سے صاف ظاہر ہے۔ ہر شعر اور ہر غزل شہر گرہن کے سایے کے باطن کا کھل کر پتہ دیتی ہے۔ جیسے فخر کی پہلی غزل کا شعر ہے۔

اب حکمرانی راکھ کی ہوگی ہمارے بعد ہم آخری ہی روٹی ہیں بجھتے تنور کی

یہ غزل مختصر ہے مگر متن میں مکمل ہے۔ فخر کا شہرِ خموشاں میں یہ کہا گیا اکیلا شعر ایک پوری غزل ہے۔

اپنوں سے باتیں کرتے ہیں راتوں کو اٹھ اٹھ کے ہم قبرستاں کے ہمسایے میں ہم نے بنایا گھر اپنا

.....

واقف تھے لوگ پہلے کبھی میرے نام سے اب لوگ مجھ کو جانتے ہیں میرے کام سے

فوٹو فنش تھی ساری میری زندگی کی ریس دو انچ فاصلہ ہی ہدف کا تھا گام سے

یہ غزل دیکھیں جس کا مطلع ہے:

کیسی بہار آئی ہے اب رنگ و بو نہیں مرجھائیں کیوں نہ پھول کہ تو دو بدو نہیں

یہاں ''دوبدو'' کہ ''روبہ رو'' سے بدل کر دیکھیں تو تقاضا پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ غیر روایتی غزل کا ایک بھرپور شعر ہے:

لگائیں سارے ہی مل کر محبتوں کے سٹال سجا ہے امن کا بازار جنگ بند کرو

اور اس تنہا شعر کا اجتماعی خیال کیا خوب ہے:

ہم زیست کی کتاب کا ہیں مرکزی خیال فٹ نوٹس میں کٹی ہے ہماری تمام عمر

اس طرح کے کئی اکا دکا شعر اور ایسی کتنی ہی غزلیں جو ''شہر گرہن'' کا حصہ ہیں، سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا باطن ہر طرح سے شفاف ہے اور یہ شفافیت اس مجموعے کے نئے انداز اور نئی آواز کی خصوصی دین ہے، جو ایسے ہی دان نہیں ہوتی۔ اس کے لئے شاعر کو اپنی فکر کی بھٹی میں جل کر ایک نئے، انوکھے اور نرالے ذکر کی بنیاد رکھنا ہوتی ہے۔ جس کے رکھنے میں فخر زمان ہر طریقے اور ہر سلیقے سے بہرہ مند ہوتے نظر آتے ہیں۔ مجموعے میں تمام مختصر غزلیں مکمل ہیں اور تنہا اشعار پوری غزل کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ عشوہ و غمزہ کی وہ باتیں ہیں جو ''شہر گرہن'' کو پورا پڑھنے سے نظر آئیں۔ یوں لکھتے وقت دل میں تیرِ نظر بن کر تر از و ہوتی چلی گئیں۔

معاملات حُسن و عشق کے بغیر شاعری کرنا ممکن نہیں۔ ایسا سمجھا جاتا رہا ہے۔ گو حُسنِ حقیقی اور عشقِ مجازی میں فرق ہے مگر یہ کہیں بھی اور کسی صورت میں نظر آ جاتے ہیں۔ عورت جس کے وجود سے کُل کائنات میں تمام رنگ ہیں کسی شکل میں یکجا اور کسی صورت میں

بکھرے نظر آ سکتے ہیں۔ جب تک انسان میں دل ہے وہ قدرت اور فطرت کو آنکھ بھر کے دیکھتا رہے گا۔ خدا کی ذات نے کائنات میں ایسی ایسی حیرتیں بھر دی ہیں جس سے انسان کی نگاہ آئینہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دل کے معاملے میں' نظر خدا کے واسطے سے اس کی تخلیق کردہ ہر شے میں حُسن دیکھتی اور دل سے عشق کرتی رہے گی۔ اور اس کی نظر کی خوب سے خوب تر کی تلاش ازل سے ابد تک رہے گی۔ یہ نظر کہیں ٹھہرے گی نہیں کہ خلق اور خالق اسے کہیں ٹھہرنے ہی نہیں دے گا۔ فخر نے تبدیلی کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ دیکھئے۔

کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہیں اپنے حال سے شک پڑ گیا ہے آج مجھے ان کی چال سے

واضح رہے کہ جہاں گردشِ دوراں کا ذکر ہوگا وہاں گردشِ جاناں کا تذکرہ ہونا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ غمِ دوراں کو غمِ جاناں سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہاں کہنے کا اسلوب جدا ہو سکتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ اسی سے ایک شاعر کی دوسرے شاعر سے اپنی وکھری پہچان ہوتی ہے۔

فخر کے مندرجہ ذیل دو اشعار دیکھیں۔

میں نے تیری ستر پوشی اپنی چادر ہی سے کی تو نے تو ننگا نچایا ہے مجھے بازار میں

.....

ترے وجود سے ہیں معطّر یہ سارے کھیت فصلِ خریف بھی ہے تو فصلِ ربیع بھی تو

ان اشعار میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کو ایسے ہم آہنگ کیا گیا ہے کہ ان کا علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا۔

ہمارے ہر شہر کا اب یہی حال ہے۔ ہمارے ملک کے سب شہروں پہ پھیلے آسمان اور ان کے نیچے سمٹی زمین کی وحشت اور دہشت گردی نے ہمیں دنیائے دنی میں ذلیل و خوار اور بدنام و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سب کچھ اپنا کیا دھرا ہے۔ دوسروں کو کوسنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ دن رات کے بے معنی اور لایعنی تبصرے اور تجزیے بے سود اور بے مقصد ہیں۔ ان عالموں اور دانشوروں کا مطلب کچھ نہیں مگر ان کی طلب بہت ہے۔ جو روز بروز کم نہیں ہوگی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے گی۔ اسی لئے اس شعر کا سہارا لیتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

یا فلک میں لگ چلا ہے چاند کی صورت گہن یا زحل کے مثل کالا ہو چلا ہے آسماں

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2014ء

منصفین نے ''تخلیق ایوارڈ 2014ء'' کے لیے اُردو کی ممتاز ناول و افسانہ نگار **محترمہ بانو قدسیہ** کو نامزد کیا ہے۔ اس اعلان کی ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ **محترمہ بانو قدسیہ** کی خدمت میں یہ ایوارڈ اظہر جاوید کی تیسری برسی پر فروری 2015ء میں پیش کیا جائے گا۔ (انشاءاللہ)

ساقی ہو تیری خیر ترے مے کدے کی خیر

حُسین احمد شیرازی

کسی سیانے نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اس عارضی زندگی کے خاتمے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ یا تو پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھے یا لکھے جانے کے قابل کام کرے۔ ہماری خوش قسمتی دیکھئے کہ ہم کرشن لال نارنگ ساقی کی صورت میں ان دونوں خوبیوں سے متصف انسان کو جانتے ہیں۔ نارنگ ساقی سے ہمارا رابطہ کوئی ایک سال پرانا اور ملاقات کوئی آٹھ ماہ پرانی ہے لیکن اس مختصر تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ ہم سوچتے ہیں ؎

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

ان سے پہلی ملاقات 2013ء میں ہوئی جب ہم ان کی دعوت پر اپنی کتاب ''بابونگر'' کی تقریب پذیرائی کے سلسلے میں نئی دہلی گئے تھے۔ وہاں یہ ہمیں اپنا ڈرائیور اور گاڑی اس طرح عنایت کرتے تھے جیسے ہم سے ادھار مانگ رہے ہوں یعنی ؎

حکم کرنا بھی اک سخاوت ہے کوئی خدمت ہمیں بتایا کرو

مناسب قیادت کے بغیر زرعی معاشرے سے نیم صنعتی سماج ہیجان خیز سفر نے ہماری سوسائٹی میں مار دھاڑ، نفسانفسی اور افراتفری کی ریل پیل کر دی ہے اور یہاں اکثر نام نہاد اچھے کام کرنے والوں کی اصل حقیقت اس واقعہ سے عیاں ہوتی ہے جب ایک شخص نے بکری چوری کی اور پھر اس کا سارا گوشت غریبوں میں بانٹ دیا۔ کسی نے اعتراض کیا: ''تمہیں اس سے کیا ملا؟''

بکری چور: ''میں نے بکری چوری کی، گناہ ہوا؟''

معترض: ''ہاں''

بکری چور: ''میں نے بکری کا سارا گوشت غریبوں میں بانٹ دیا، مجھے ثواب ہوا؟''

معترض: ''ہاں!''

بکری چور: ''گناہ ثواب برابر ہو گئے اور بکری کی کھال اور سری پائے مفت میں مل گئے۔''

چنانچہ اس ماحول میں کم ظرف لوگوں کا تو اخلاص اور ایثار کے بارے میں یہ روّیہ ہوتا ہے ؎

ساقیا میرا ایک کام کر دے سارا مے خانہ میرے نام کر دے

لیکن اہلِ دل اسے ادھار نہیں، جان مانگنے سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ کئی صورتوں میں جان دے کر بھی ان کی روح کو احسان ناسپاسی کا احساس ستاتا رہتا ہے۔

جبر کے اختیار پر مت جا عجز کا بھی غرور ہوتا ہے

طمع اور لالچ کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے حسد اور بغض سے بھی اٹ گئے ہیں۔ بھوکے کو کوئی کھلاتا نہیں اور شکم سیر کسی کو بھاتا نہیں یعنی

کیا تکلف کریں یہ کہتے ہیں جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں

منفی خیالات اور رجحانات کے اس اندھیرے میں نارنگ ساقی جیسے بے غرض لوگ اس شمع کی مانند ہیں جو خود تو جلتی رہتی ہے لیکن اندھیروں میں سفر کرنے والے لوگوں کے تاریک راستے منور کر دیتی ہے۔ ان کے انسان دوست رویئے کو دیکھ کر بے اختیار رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم یاد آ گئی۔ ٹیگور نے لکھا ہے کہ ڈوبتے ہوئے سورج نے جب اپنے چاروں طرف اندھیرا پھیلتا دیکھا تو وہ دکھی ہو گیا اور اس نے غم ناک لہجے میں کہا: میرے بعد اجالے کی حفاظت کون کرے گا۔ ہر طرف سناٹا تھا..... پھر ایک چھوٹے سے دیے نے آگے بڑھ کر کہا: ''میں حتی المقدور کوشش کروں گا۔''

نارنگ ساقی کا دسترخوان بڑا وسیع ہے اور انہیں دعوتیں کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ سنا ہے کہ بھارت میں جو اردو لکھنے والا نارنگ ساقی کی مہمان نوازی سے محروم ہے وہ مکمل طور پر ادیب یا شاعر ہی نہیں ہے۔ لیجئے یہ بات لکھ کر ہم اپنے خلاف خود ہی سلطانی گواہ بن گئے ہیں کیونکہ ہمارے دہلی میں قیام کے دوران ان کے روزوں کی مدت چل رہی تھی!

تہی دستانِ قسمت را چہ فیض از رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

(کم نصیب لوگوں کو کامل رہبر سے بھی فیض حاصل نہیں ہو سکتا کہ خضر آبِ حیات کے چشمے سے سکندر کو پیاسا واپس لے آئے تھے۔)

ملّا نصیر الدین کو کسی نے کہا کہ تمہارے ہمسائے نے کھیر پکائی ہے۔ ملّا بولا: ''مجھے کیا؟'' اس شخص نے پھر کہا کہ ہمسائے نے ایک پلیٹ تمہارے گھر بھی بھجوائی ہے تو ملّا نے جواب دیا ''تجھے کیا!''

نارنگ ساقی بے لوث دوستی اور تعلّقات نبھانے کی مشرقی روایات کا جیتا جاگتا نمونہ اور قابلِ تقلید مثال ہیں۔ انہیں کنور مہندر سنگھ بیدی مرحوم اور قتیل شفائی مرحوم سے عقیدت تھی نہیں بلکہ ہے کہ ان کی کئی کتابوں کا انتساب ان مرحومین کے نام ہے۔ اس حرص اور لالچ کے مارے دور میں اس دنیا سے چلے جانے کے نام وہی کرشن لال اس طرح یاد رکھ سکتا ہے جس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز وفا کے تخلص سے کیا ہو۔

اردو کرشن لال نارنگ ساقی کی مادری زبان نہیں ہے لیکن وہ بھارت میں اس کی بقاء کی جنگ لڑنے والے ہراول دستے میں

شامل ہیں بلکہ اردو کی تبلیغی جماعت کے اہم لیڈر ہیں۔اردو کے بارے میں ان خیالات دیکھئے:

''صحیح معنوں میں ہندوستان کی جنگِ آزادی اردو زبان میں ہی لڑی گئی اور خاص طور پر پنجاب کے اردو اخبارات اسی سلسلہ میں پیش پیش رہے۔ بھگت سنگھ سے لے کر سینکڑوں شہیدانِ آزادی نے اسی زبان کو گلے سے لگایا اور اردو صحیح معنوں میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن کر ملک میں نمودار ہوئی۔''

نئی دہلی میں ہماری کتاب کی تقریب کے دوران کسی نے یہ شعر پڑھے تھے۔

غموں کی دھوپ میں دارالامان جیسا ہے تیرا خیال بھی اک سائبان جیسا ہے
وطن میں رہتے ہوئے بے وطن سا لگتا ہوں کہ میرا حال بھی اردو زبان جیسا ہے

بھارت میں اردو زبان کی زبوں حالی کا نوحہ سنئے اور ان کا ایک تجربہ ان ہی کے الفاظ میں دیکھئے:۔

''نارنگ ساقی نے لطائف اکٹھا کرنے کے سلسلے میں متعدد ادباء، شعراء اور دیگر احباب کو خطوط لکھے اور ان سے درخواست کی کہ ان کے علم میں جو بھی ادبی لطائف ہوں وہ انہیں بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔ان کا خط جب اردو کی ایک شاعرہ کو ملا (جن کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے تھے) تو محترمہ نے انہیں فون کر کے پوچھا کہ آپ نے اردو میں کیا خط لکھا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔

نارنگ ساقی نے جواباً عرض کیا ''آپ تو ماشاءاللہ صاحبِ دیوان ہیں اور آپ کو تو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔'' تو انہوں نے بڑی انکساری سے جواب دیا ''میں تو بس یوں ہی تھوڑی بہت شاعری کر لیتی ہوں۔اردو تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

ہم بھارت میں امرتسر، دہلی، جے پور، اجمیر شریف اور آگرہ گئے اور وہاں سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔غلط یا صحیح..... اردو پر مسلمانوں کی زبان ہونے کا ٹھپہ لگنے سے اردو زبان آہستہ آہستہ پس منظر میں دھکیلی جا رہی ہے۔ان حالات میں نارنگ ساقی کا اردو پرچم کی سربلندی کے لئے اپنی ذات کا وقف کر دینا ان کے کردار کی عظمت کی گواہی ہے۔کسی انسان کی شخصیت کو جانچنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوگا کہ وہ منجدھار میں طوفان کے تھپیڑے کھاتی شکستہ ناؤ کو کنارے تک لانے کی تگ و دو کرتا رہے۔نامساعد حالات میں دنیوی طور پر غیر مقبول مشن کے لئے لڑتے رہنا ہی انسانیت کا اصل امتحان ہے۔بقول غالب۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دیگر کتابوں کے علاوہ نارنگ ساقی اہلِ قلم کے لطیفوں اور خوش کلامیوں کے مصنف و مولف ہیں۔آپ اتفاق کریں گے کہ ہماری اصل زندگی تو وہی چار پل ہیں جن میں ہم مطمئن اور مسرور ہیں ورنہ باقی عرصہ تو موت کا انتظار ہی ہے۔شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ جسے ہنسنا نہیں آتا، اسے جینا نہیں آتا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

میر تقی میر نے اپنے دیوان کو اشعار کی بجائے درد و غم کا مجموعہ قرار دیا ہے جبکہ اقبال کے یاروں نے انہیں غزل خوانوں میں شمار کرنے کا گلہ کیا ہے۔ نارنگ ساقی کی کتابیں لطیفوں کا مجموعہ نہیں کیونکہ ان میں ایک عہد، ایک زمانے اور ایک دور کے جیتے جاگتے افراد چلتے پھرتے، بولتے سنتے، ہنستے روتے ہوئے زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتابیں ہماری ادبی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ نارنگ ساقی کے لکھے ہوئے واقعات سچ پر مبنی ہیں اور کہتے ہیں کہ سچائی فکشن سے زیادہ دلچسپ اور پُر لطف ہوتی ہے۔ اس خوبی سے ان کی کتابوں کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ساقی ہو تیری خیر ترے مے کدے کی خیر ایسی پلا کہ جس کا نشہ عمر بھر رہے

◆◆◆

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال

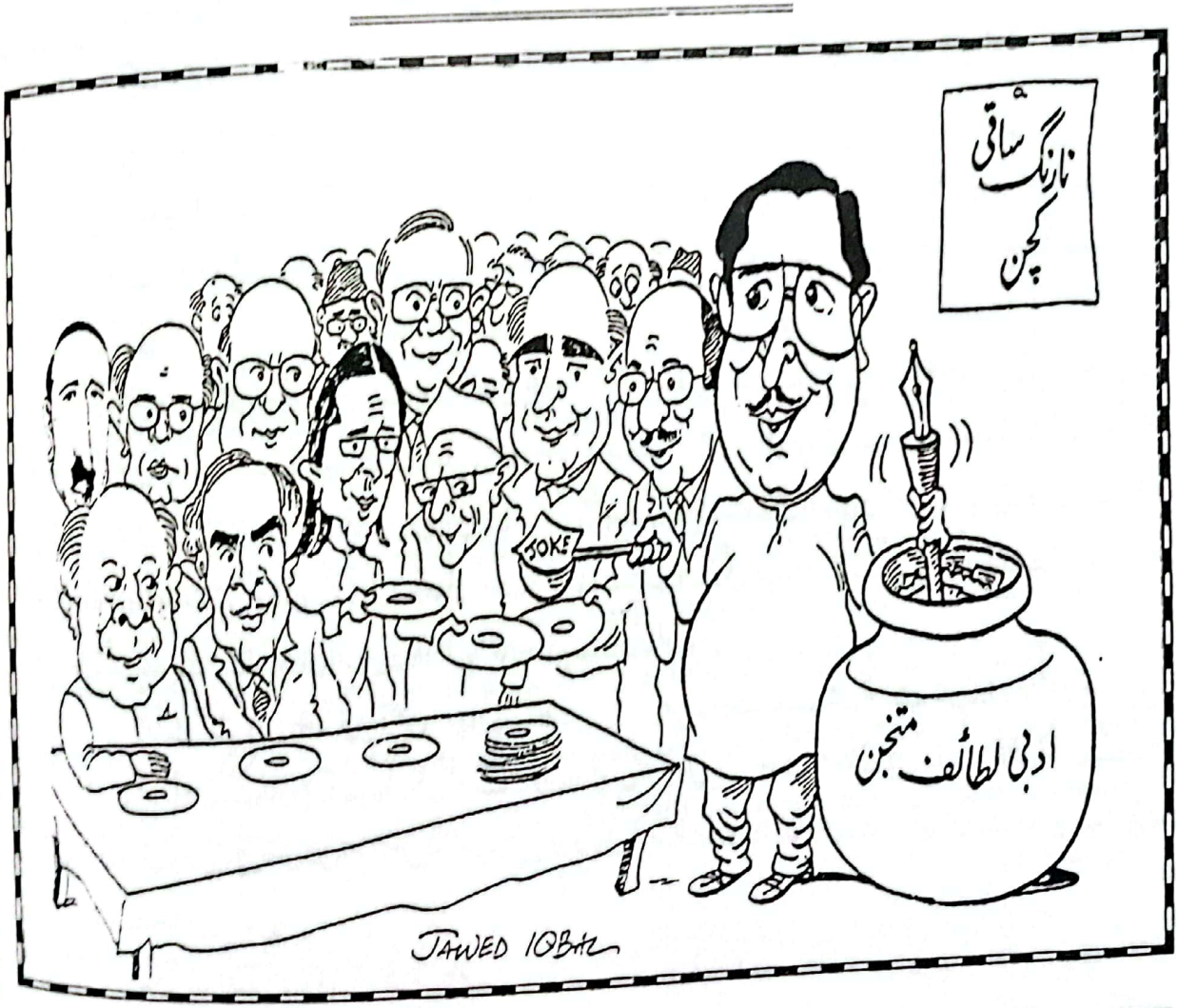

تنہائی کا ناول نگار.....گیبریل گارسیا مارکیز

محمد ساجد

دنیا کے عظیم ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز 17 اپریل 2014 کو داغِ مفارقت دے گئے۔ مگر وہ اپنے قارئین کو دل' یاد اور تنہائی سے روشناس کر گئے۔ گیبریل گارسیا مارکیز نے 9 مارچ 1927ء کو کولمبیا کے ساحلی شہر اراکاتا میں جنم لیا۔ زندگی کے ابتدائی ماہ و سال ننھیال میں گزارے۔ اس کے نانا اور نانی نے اس کو گھٹی میں کہانی ڈال دی۔ وہ مارکیز کو سسپنس اور ایڈونچر سے بھرپور کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ نانا کی وفات کے بعد وہ اپنے والدین کے پاس بارنکیلا (کولمبیا کا ایک شہر) میں آ کر رہنے لگا۔ بارنکیلا میں اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاء کالج بارنکیلا میں داخلہ لیا۔

جس زمانے میں مارکیز قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس دوران ایک برل راہ نما ''ہوسے گیتا'' کا کسی نے خون کر دیا۔ جس کی وجہ سے شہر میں پرتشدد کاروائیوں کا آغاز ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں پھیل گیا۔ اس پُرتشدد ماحول نے مارکیز کو تنہائی فراہم کی۔ شہر کی اداسی نے دل کو ویران کیا اور کافکا کی کہانیوں نے اس زمانے کی یاد دلائی جب وہ اپنے نانا سے داستانیں سنا کرتا تھا۔

چنانچہ مارکیز نے گھر کو چھوڑا اور ایک ہوٹل کا کمرہ کرایہ پر لے کر تنہا رہنے لگا۔ وہ بارنکیلا کے حلقہ ''ادب اور آرٹ'' سے وابستہ ہو گیا۔ اس گروپ میں وہ نوجوان شامل تھے۔ جو ادب اور آرٹ کے دلدادہ تھے۔ اس حلقہ یاراں میں اس کو دنیا ادب کے عظیم ادیب جیمس وائس' ولیم فاکنز اور ورجینا وولف کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ ان کہانیوں نے مارکیز کے اندر ایک ایسے ادیب کو بیدار کیا جو ناول نگاری میں دنیا کا مشہور ادیب ٹھہرا۔

اس نے پہلا ناول ''پتوں کا طوفان'' کے عنوان کے تحت لکھا۔ جس کو کوئی خاص پذیرائی نہ ملی۔ البتہ بطور رائٹر اس کو پہچان مل گئی۔ پھر اس نے صحافت میں قدم رکھا۔ مگر بے باک اندازِ صحافت کی وجہ سے وہ معاشی طور پر مفلوج ہو گیا۔ مارکیز کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کے پیسے بھی نہیں تھے۔ تو اس نے اپنے ناول کا مسودہ ہوٹل مینجر کے پاس گروی رکھ دیا تھا۔ ہوٹل کا مینجر بھی ان کاغذوں کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ ان معاشی مسائل کے دوران مارکیز نے اپنی محبوبہ ''مدسیدس'' سے شادی کر لی۔ مگر گردشِ روزگار نے اس کی مصیبت کو کم نہ کیا۔ معاشی مسائل اور ان کا المیہ مارکیز کے دوسرے ناول ''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا'' میں ملتا ہے۔ اس کا تیسرا ناول ''منحوس وقت'' بھی ان ایام کی سرگزشت ہے۔ مارکیز ہر چیز سے مایوس ہو چکا تھا۔ تنہائی اور ویران دنیا کا اس کا بنیادی تھیم تھا۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ مارکیز نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا۔ اور ایک ناول لکھنے لگا۔ وہ پندرہ ماہ مسلسل لکھتا رہا۔ اس کی بیوی مدسیدس لوگوں سے ادھار مانگ کر گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ یہ زمانہ اس کے شاہکار ناول ''تنہائی کے سو سال'' کی تکمیل کا سبب بنا۔

اس ناول کا مرکزی کردار کرنل ارلیانو جب مرا تو مارکیز صدمے سے بستر پر گر پڑا اور مسلسل دو گھنٹے تک روتا رہا۔ اس کی کرداروں سے وابستگی جنون کی حد تک بڑھ گئی تھی۔

مارکیز کا یہ ناول اس کو شہرت کی بلندیاں تک لے گیا۔ جہاں تک پہنچنے کے لئے بڑے بڑے ادیب خواب دیکھتے ہیں۔ 1982ء میں ناول ''تنہائی کے سو سال'' کو نوبل انعام ملا۔ اب تک اس ناول کی تین کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ جو اس ناول کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے دیگر ناولوں میں ''سردار کا زوال'' ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' ''وبا کے دنوں میں محبت'' ''بڑی ماما کا جنازہ'' اور ''میری سوگوار بیواؤں کی یاد میں'' شامل ہے۔ ''میری سوگوار بیواؤں کی یاد میں'' ان کا آخری ناول ہے۔

مارکیز نے ''سردار کا زوال'' کو اپنا بہترین ناول قرار دیا۔ حالانکہ ان کو عالمی شہرت ''تنہائی کے سو سال'' سے ملی۔ مارکیز کے بقول ''ایک دوست کو یہ ثابت کرنے کے لئے قلم اٹھایا تھا کہ اس کے عہد میں بھی عظیم رائٹر پیدا ہو سکتے ہیں۔''

◆◆◆

ماہنامہ ''تخلیق'' پر ممتاز شاعر اور دانشور ناصر بشیر کا تبصرہ

شمارہ جون 2014ء

کچھ عرصہ پہلے ''تخلیق'' کے مدیر گرامی اظہر جاوید کا انتقال ہوا تو میرا خیال تھا کہ یہ دراصل ''تخلیق'' کی موت ہے اور ''تخلیق'' کی موت کے ساتھ ہی پرانی انارکلی لاہور کی بھگوان سٹریٹ سنسان ہو جائے گی۔ لیکن اظہر جاوید کے بیٹے سونان اظہر نے اپنی مستقل مزاجی اور ادب دوستی سے یہ ثابت کر دکھایا کہ تخلیق کبھی نہیں مرتی۔ یہ تو اپنے خالق کو بھی زندہ رکھتی ہے۔ آج رسالہ ''تخلیق'' چھپ رہا ہے۔ اظہر جاوید کا نام بھی زندہ ہے لیکن پرانی انارکلی کی بھگوان سٹریٹ میں اب ادیب اور شاعر دکھائی نہیں دیتے کیونکہ سونان ''تخلیق'' کے دفتر کو وہاں لے گئے ہیں جہاں اسے وہ آسانی سے ہر ماہ چھاپ سکتے ہیں۔

جون 2014ء کا شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کے مشمولات و مندرجات دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ اظہر جاوید ہی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ رسالے کا معیار اور رنگ ڈھنگ وہی ہے جو ان کی زندگی میں تھا۔ اظہر جاوید کی روح سے معذرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ ''تخلیق'' پہلے سے کچھ بہتر ہو گیا ہے۔ یوں تو اس شمارے میں بہت کچھ پڑھنے کے لائق ہے لیکن بابا عرفان الحق کے بارے میں ڈاکٹر ابدال بیلا کا لکھا ہوا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ بابا عرفان الحق نے مذہب، تصوف، دانش اور طب کو رلا ملا کر ایک نیا مرکب تیار کیا ہے جو بہت سوں کو شفا دے رہا ہے۔ سونان اظہر نے اداریے میں اس بات پر اظہار تشکر کیا ہے کہ اظہر جاوید مرحوم کی تصویر پاک ٹی ہاؤس میں آویزاں کر دی گئی ہے اب وہ ذرا صحافیانہ حس استعمال کرتے ہوئے اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کریں کہ اس سے پہلے مرحوم کی تصویر وہاں کیوں نہیں لگائی گئی تھی۔

(بہ شکریہ : روزنامہ ''پاکستان'' زندگی میگزین، 6 تا 12 جولائی 2014ء)

پنجاب رنگ

احسانؔ رانا

پنجابی غزل

راہی دُھوڑاں پھک رہیا اے
اپنا بُھلیا چک رہیا اے
کاں بنیرے اُتّے بیٹھا!!
شکرے وانگوں تک رہیا اے
اکھوں اوہلے ہو نہ جاواں
کردا گل اوہ جھک رہیا اے
مرناں کدھرے لکھیا نہیں سی
پانی وچ ای نک رہیا اے
گھر دی ڈیکوریشن ویکھو
بُلھاں اُتے سَک رہیا اے
مِٹی دا اوہ بجھدا دِیوا
سورج نوں کیوں ڈک رہیا اے
پھاٹک بند اوہ خالی ڈبّے
انجن کردا چھک چھک رہیا اے
گھوڑا، کھوتہ، اک برابر
توڑی، دانہ، پھک رہیا اے
ساڈی مِٹی وچ وی رانؔا
کوئی لاوا پک رہیا اے

OOO

منزہ شاہد

مسافر! گل سُن

تُوں لنگھ جاویں گا پار، ناں جپ سوہنے دا
مَتے پھس جاویں وچکار، ناں جپ سوہنے دا

بھاویں لکھ طوفاناں دے وچ گھریا ہوویں گا
تیری بیڑی دین کے تار، ناں جپ سوہنے دا

تیری مشکل نوں او آپے آن کے ٹالن گے
میرے آکھے سدتے مار، ناں جپ سوہنے دا

ایہ دُنیا کھوبا چِکڑ بھرنا، چھڈ اڑیا
میری گل دا کر اتبار، ناں جپ سوہنے دا

پاءنفس دے گل وچ سنگلی بنھ کے رکھ اینہوں
ایہ پاگل کتا مار، ناں جپ سوہنے دا

تُوں، میں، دے جھگڑے سارے ای مُک جاون گے
ذرا اندر جھاتی مار، ناں جپ سوہنے دا

جس سوہنے تیرے میرے میل کرائے نیں
ہو اوہدا شکر گزار، ناں جپ سوہنے دا

سُن بیبا! گل منزّہ دی بنھ پلّے توں
ایہ دنیا تے دن چار، ناں جپ سوہنے دا

OOO

جاوید احسن

مٹی میڈی ذات

مِٹی ۔ بانو بان دی مٹی
کچی پکی چکٹی مٹی
بیٹ، دمان، پہاڑ دی مٹی
سندھ بلوچستان دی مٹی
خیبر کوہستان دی مٹی
نیلی بار، پنجاب دی مٹی
مٹی بھل ملتانی مٹی
روہی، تھل چترانگ دی مٹی
ساڈے ملک ملھیر دی مٹی
خوشبودار خمیری مٹی
میں ہاں ایں مٹی دا جایا
ایہ مٹی ہے میڈی مایا
ایندے نال وجود ہے مہنڈا
ایندے نال حیات!
مٹی میڈی ذات!!

OOO

گلفام نقوی

نی اڑیے

گل سُن نال دھیان

نی اڑیے
دل دی رمز پچھان
دل دی رمز پچھان نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

سدا نہ حُسن، جوانی، ماپے
تینوں کاہدا مان نی اڑیے
دِل دی رمز پچھان

اپنے پیر زمین تے رکھیں
لاگے نہیں آسمان نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

اوکھا عشق دی سولی چڑھنا
ساہواں داوٹ وان، نی اڑیے
دِل دی رمز پچھان

سونہاں لیندے ہوت سمے دے
اج نہ لمیاں تان، نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

سوچ فکر دی چھلنی لے کے
سچ دا آٹا چھان، نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

کت کے داج بنا، ماں جیوے
واہ واہ کرے جہان نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

پیکا گھر تے سدا پرایا
توں کجھ دن مہمان نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

گڈی ٹیشن آ لگنی ایں
لاگے رکھ سامان، نی اڑیے
دل دی رمز پچھان

گل جے ڈھولا راضی ہووے
نئیں کسے دی کان، نی اڑیے

دل دی رمز پچھان
دل دی رمز پچھان، نی اڑیے
دِل دی رمز پچھان

OOO

تبصرے

انور سدید کے تبصرے

چند سپیاں سمندروں سے..... پروین شیر (کینیڈا)

پروین شیر اُردو تہذیب کے گہوارے میں پیدا ہوئی تھیں لیکن اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی مادری زبان کے ماحول سے نکل کر انگریزی زبان کے وسیع و عریض خطّے کینیڈا میں جا کر آباد ہو گئیں۔ ان کی تعلیم و تربیت مغرب کی یونیورسٹیوں میں ہوئی لیکن انہوں نے اپنے باطن میں اپنی زبان کو نہ صرف آباد رکھا بلکہ اپنی مادری زبان میں شاعری بھی کی۔ فطرت نے ان کی انگلیوں کو منظر کشی کا جوہر عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فن کا جادو مصوّری میں بھی جگایا۔ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ''کرچیاں'' چھپی تو اہلِ فن نے حیرت سے دیکھا کہ انہوں نے اپنی شاعری کو خود مصوّر کیا تھا۔ ان کے ذوقِ لطیف کی نمو موسیقی میں ہوئی تو انہوں نے ستار نوازی میں اپنے جذبات کا لرزیدہ اظہار کیا اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے شاعری، مصوری اور موسیقی کی تین مملکتوں میں اپنے فن سے حکمرانی کی جس کا اعتراف مشرق اور مغرب کے ممالک میں یکساں طور پر کیا گیا۔ چنانچہ بھارت کے ممتاز نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے لکھا کہ پروین شیر نے جذباتی حِسّی تجربوں کو نغمہ بنا دیا ہے۔ پاکستان کے نامور نقاد صبا اکرام نے شہادت دی کہ پروین شیر کی نظمیں تنہائی کی بولتی تصویریں ہیں۔ کینیڈا کے ڈاکٹر وارین گیریو کی رائے میں پروین شیر کے بیانیے ایک نوع کے جمالیاتی ربط و ضبط کے بھی مظہر ہیں.....اور ایک شاعر کی حیثیت سے وہ ایک پختہ فن کار ہیں۔''

ان آراء کی چاندنی میں پروین شیر اپنی نئی کتاب میں ایک سفر نامہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان کی کتاب ''چند سپیاں سمندروں سے'' جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ کا ایسا سفر نامہ ہے جو پہلے اُردو کے کسی سیّاح نے نہیں لکھا۔ پروین شیر نے ان دور افتادہ علاقوں کو ایک ایسی عورت کے روپ میں دیکھا جس کے دل میں انسانی ہمدردی کے شعلے فروزاں تھے اور جو محض عورت نہیں تھی، ایک ماں بھی تھی جس کی گود میں پوری دنیا پرورش پا رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سیّاحت پروین شیر کا شوق ہے لیکن وہ مجھے اس کتاب میں ہر جگہ ایک ''نان پروفیشنل ٹریولر'' نظر آئیں جو حال کے تناظر میں ماضی کی بازیافت کر رہی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

''میرے لیے سیّاحت کا مقصد کسی ملک، کسی شہر کی آن، بان اور شان اور کا سمیٹک دیکھنے کا شوق کبھی نہیں رہا بلکہ غازے میں نہاں اصل چہرے دیکھنے کا ہے۔''

چنانچہ انہوں نے ''سیاہ روشنی'' اور ''طلسمی جہان'' میں ہمیں حقیقی افریقہ اور حقیقی جنوبی امریکہ دکھانے کی سعی کی ہے۔ فطرت نے ان علاقوں کو اپنی جلوہ آرائیوں سے سرافراز کیا ہے لیکن انسانوں نے ان جلوہ سامانیوں کو اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق استعمال کیا اور امارت کی بوالعجبی میں پسماندگی اور غربت کو آنسو بہاتے ہوئے بھی دکھایا۔ پروین شیر نے ان سفرناموں کی تصویریں اپنے کیمرے سے نہیں اُتاریں بلکہ یہ سب تصویریں آئینہ احساس سے منعکس ہو رہی ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے درست لکھا ہے کہ پروین شیر کے اسلوب میں ایک ایسی جامعیت ہے جو کسی مخصوص شخص یا مخصوص علاقے کی محدود اذیت کو اور قدروں کے بحران کو آفاقیت اور ہمہ گیری میں تبدیل کر دیتی ہے۔''

اس سفرنامے میں مصنّفہ نے ''تھرڈ پرسن'' (صیغہ واحد غائب) کا روپ دھارا ہے اور ہر منظر کو دور سے دیکھ کر اپنا داخلی تاثر رقم کر دیا ہے۔ ممتاز مفتی، احمد بشیر، گیان سنگھ شاطر اور حمید نسیم نے اپنی خودنوشت سوانح عمریاں اس اسلوب میں ہی پیش کی ہیں لیکن پروین شیر نے شاید سفرنامہ پہلی مرتبہ واحد غائب میں لکھا ہے۔ انگریزی اور اردو میں یہ کتاب پیشکش کے اعتبار سے بھی خوبصورت ترین مصوّر کی کتاب ہے۔ جس کی تصویریں مصنّفہ نے خود بنائی ہیں۔ قیمت -/2,000 روپے۔ ملنے کا پتہ: آل انڈیا اردو مشن۔ فلیٹ ایف۔4، فرسٹ فلور، پارک ویو اپارٹمنٹ یکمپ روڈ، بنگلور (انڈیا)۔

.....

آبشارِ ادب..... بی، ڈی، کالیہ، ہمدم (انڈیا)

سفرنامہ کرۂ ارض کے کسی مخصوص خطّے میں عصری حالات کے مشاہدے اور ماضی کی تاریخ کی بازیافت کا عنوان ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سفر کرنے والے پر منظر اپنی کیفیّت اس کے ذوق و ظرف کے مطابق ہی منکشف کرتا ہے۔ اس نقطے سے ڈاکٹر وزیر آغا نے سیّاح اور مسافر کا مابہ الامتیاز بیان کیا کہ مسافر مقصد کی ڈوری میں بندھا ہوتا ہے اور گردوپیش کی خوش نظری اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتی جبکہ مقصد میں کامیابی سفر کی غایت پر غالب رہتی ہے۔ دوسری طرف سیّاح مقصد سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ کسی سرکاری کانفرنس کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے ذوق کی آب یاری کرتا ہے اور اپنے بودوباش کے علاقے سے نکل کر نئی سرزمینوں کی حقیقتوں کو دریافت کرتا ہے۔ دونوں کے پاؤں میں گردش موجود ہے لیکن ایک مسافر کی گردش معیّنہ ایجنڈے کے مطابق حرکت کرتی ہے جبکہ سیّاح کا پاؤں آزاد ہے اور جہاں کسی منظر نے جمالیاتی زاویے سے متوجہ کیا، اس کے حُسن میں کھو گیا اور پھر مطالعۂ فطرت کرنے لگا جو مسافر کے مقدّر میں نہیں تھا۔

یہ چند باتیں مجھے ہریانہ کے ملک الشعرا جناب بی ڈی کالیہ ہمدم کا امریکہ اور انگلستان کا سفرنامہ ''آبشارِ ادب'' پڑھنے کے بعد سوجھی ہیں۔ جملۂ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ ہماری ادب نواز، ادب پرست حکومتوں نے دونوں ملکوں میں کتب و رسائل کی محکمہ ڈاک کے ذریعے ترسیل اتنی مہنگی کر دی ہے کہ اب کتب و رسائل کا تبادلہ تحفے کے طور پر بھی ممکن نہیں رہا۔ میں بھارت کے اُردو نواز اور ادیب دوست نارنگ ساقی اور مشتاق اعظمی کا شکرگزار ہوں کہ وہ مجھے اعلیٰ معیار کی کم قیمت کی کتب اور رسائل بھی گراں شرح ڈاک ادا کر کے عطا فرماتے رہتے ہیں۔ ''آبشارِ ادب'' رسالہ ''تخلیق'' کے مدیرِ اعلیٰ سونان اظہر کو موصول ہوئی تھی کیوں کہ بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدم سونان کے والدِ محترم اظہر جاوید مرحوم کے قریبی دوست تھے اور ہمدم صاحب کی تہذیبی شخصیّت نے دوستی کے اس تعلق کو اظہر جاوید کی وفات کے بعد لحد میں نہیں اتارا۔ بلکہ زندہ رکھا اور ''آبشارِ ادب'' سونان صاحب کو بھجوادی۔ میں نے یہ دلچسپ سفرنامہ سونان اظہر جاوید سے مستعار لے کر پڑھا اور اس پر اپنا

تاثر لکھنے کے بعد انہیں واپس کر دوں گا کہ ان کی لائبریری کی زینت بنی رہے اور دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

میری نظر میں شاعر ہمدم کے باطن میں ایک سیّاح چھپا ہوا ہے۔ وہ سرکاری افسروں کی طرح ٹیکس گزاروں کے پیسے پر کانفرنسوں میں شریک نہیں ہوتے۔ اور نہ واپس آ کر سفر نامے میں اپنے میزبانوں کی بیگمات کے کھانوں کی تعریفیں لکھتے ہیں جو بالعموم ہوٹل سے منگوائے جاتے ہیں۔ یہ تعریف دراصل اگر سفر کے لیے ویزے کا طلب نامہ ہوتا ہے جس سے میزبان انکار نہیں کرتا۔ ہمدم صاحب نے امریکہ اور برطانیہ کا سفر اپنے بیٹے کی دعوت پر ستر برس کی عمر میں اپنے خرچ پر کیا اور جانے سے پہلے صدر امریکہ بارک اوباما کی سیاہ فامی کی پروانہ کرتے ہوئے خط لکھ دیا کہ اگر بھارت کے اس ملک الشعرا کو ملنا چاہو تو اسے وائٹ ہاؤس میں بلا لو۔ ہمدم صاحب کے خط کی اوباما کے وائٹ ہاؤس میں پہنچنے کی رسید تو ملتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارک اوباما ذوق شعر سے عاری ہے۔ اگر اسے شعر کا ذوق ہوتا تو کالیہ ہمدم صاحب کا استقبال ایئر پورٹ پر کرتا۔ ان کے اعزاز میں وائٹ ہاؤس میں مشاعرہ کرتا جس میں سابق صدر کلنٹن کو ضرور بلاتا کہ وہ عشق کی آگ میں ہاتھ تاپتا رہا تھا۔

اس سفر نامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جناب ہمدم کالیہ نے امریکہ اور برطانیہ کو بھارت کی آنکھ سے دیکھا۔ ہر جگہ مشاعرے میں غزلیں پڑھیں اور داد سمیٹی۔ حسنِ بے پروا کی دل کھول کر داد دی لیکن اپنے جمیل یوسف کی طرح لنگوٹ کو کھلنے نہیں دیا۔ اور اخلاقیات کی مشرقی پوٹلی باندھے رکھی۔ جمیل یوسف جیسا حسن پرست امریکہ اور برطانیہ کا سفر کرتا تو اپنی جنسی فتوحات کا اور اس پر خرچ کا بیانیہ پیش کرتا۔ ہمدم کالیہ صاحب نے امریکہ اور برطانیہ میں ادب کی صورتِ حال سے باخبر کیا ہے اور ایک تہذیبی سفر نامہ لکھا ہے جسے ان کی بیٹیاں بھی پڑھ کر اپنے باپ پر فخر کر سکتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہر محفل میں ان کے ساتھ موجود تھا اور اب اس سفر نامے میں بھی کالیہ صاحب نے میری انگلی پکڑ رکھی ہے۔ ایسے سفر نامے اردو میں کم کم لکھے گئے ہیں اور میں کالیہ صاحب کو ہپ ہپ ہرّا کر کے داد دیتا ہوں۔

ملنے کا پتہ: ہریانہ وقف بورڈ، انبالہ چھاؤنی، پنجاب (بھارت)۔ قیمت درج نہیں۔ ایک خط لکھ کر منگوا لیجئے۔ پتہ بی ڈی کالیہ، سیکٹر 12، ہچکولہ 134112) ہریانہ، بھارت۔

.....

منٹو ــــ غالب کا پرستار ..... پرویز انجم (فیصل آباد)

جناب پرویز انجم لکھتے ہیں :

''غالبؔ نے کہا تھا کہ داستان طرازی من جملہ فنونِ فن ہے۔ دوسری طرف نظم طباطبائی کی رائے میں شاعری کی معراج یہ ہے کہ افسانہ بن جائے۔''

اُردو شاعری میں مرزا غالبؔ کا نام اور اُردو افسانے میں سعادت حسن منٹو کا فن امتیازی شان رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کا ارشاد ہے کہ ''غالبؔ کی شوخیِ تحریر سے ایک دنیا نقشِ فریادی ہے'' دوسری طرف سعادت حسن منٹو نے معاشرے کے فریادی نقوش سے افسانے تراشے تھے'' دونوں نے اپنے عہد کو ہی نہیں مستقبل کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ زمانی لحاظ سے ان دو عظیم فنکاروں میں ایک صدی کا فاصلہ ہے لیکن زیرِ نظر کتاب ''منٹو ــــ غالب کا پرستار'' کے مصنّف پرویز انجم کی رائے میں ..... ''مزاج کے اعتبار سے دونوں میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔

دونوں غیر معمولی ذہانت، فلسفیانہ غور وفکر، منفرد اندازِ نظر اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فن کار تھے'' ...... غالبؔ انیسویں صدی کے شاعر تھے۔ سعادت حسن منٹو نے ان کا مطالعہ بیسویں صدی میں کیا تو اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے تخلیقی عمل میں مستقل موضوع کی حیثیت دے دی۔ جناب پرویز انجم کی انفرادیت یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کے جشنِ صد سالہ کے ہنگام میں انہوں نے اپنی پوری توجہ غالبؔ اور منٹو کی طرف کر دی تو کئی کتابیں لکھنے کا منصوبہ بنالیا۔ متذکرہ بالا کتاب کو بارش کا پہلا قطرہ سمجھئے۔ تاہم اس کی داد وتحسین اس لیے ضروری ہے کہ منٹو کی غالب پسندی پر اس سے پہلے بہت کم کام ہوا ہے اور پرویز انجم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو لکھنے کا حق ادا کر دیا۔

کتاب ''منٹو ـــ غالب کا پرستار'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں موضوع مرزا غالبؔ ہے لیکن مضامین کے قلم کار سعادت حسن منٹو ہیں اور انہوں نے بالعموم غالبؔ کی زندگی کے ایسے گوشوں پر نظر ڈالی ہے جن کی معلومات عام لوگوں تک کثرت سے نہیں پہنچیں۔ لیکن ان میں عوامی دلچسپی کے عناصر بہت زیادہ ہیں۔ چند عنوانات یہ ہیں :

''آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی'' ......''غالب اور چودھویں'' ......''غالب اور سرکاری ملازمت'' ''......' قرض کی پیتے تھے مے......'' ''غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت'' ...... یہ مضامین بکھرے ہوئے تھے۔ پرویز انجم نے یہ نوادرات ایک کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ کتاب کا ایک اہم مضمون ''منٹو ـــ غالب کا پرستار'' جو غالبؔ کی زندگی اور شاعری کے عمیق مطالعے کے بعد لکھا ہے اور دو نابغہ شخصیتوں کو متوازی رکھ کر دونوں کی مماثلتیں تلاش کی گئی ہے۔ مصنّف کی نکتہ آرائی اس مختصر اقتباس سے عیاں ہے :

> ''منٹو کو شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس اعتراف کے باوجود غالبؔ کی شخصیت اور شاعری منٹو کے لیے ہمیشہ جاذبِ نظر رہی۔ بے شک دونوں کی ادبی سمتیں الگ الگ تھیں لیکن غالب کی نثر میں پہلوداری، نکتہ رسی اور مزاج کی رنگا رنگی سے منٹو نے بہت استفادہ کیا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کرنے کا ہنر بھی منٹو نے غالبؔ ہی سے سیکھا۔''

کتاب کے دوسرے حصّے میں فلم مرزا غالبؔ کا پورا اسکرپٹ پیش کیا گیا ہے اور اس سے قبل ایک باب میں پرویز انجم نے اس پس منظر کو بازیافت کیا ہے جس میں منٹو فلم کا سکرین پلے لکھنے کے لیے غور وخوض کر رہے تھے اور مرزا غالبؔ کی زندگی کے بھاگتے ہوئے لمحوں کو اپنی تخلیقی گرفت میں لے کر منٹو انہیں حرارت اور روشنی عطا کر رہے تھے۔ کتاب کے دیباچہ نگار ڈاکٹر طارق ہاشمی کی رائے میں ''پرویز انجم نے یہ کتاب لکھ کر ایک فرض بہ اسلوبِ احسن نبھایا ہے اور ایک قرض۔ وقت، محنت اور نقد کے بہت سے دام دان کر کے چکایا ہے۔'' آخر میں ماخذات کی تفصیل بھی پیش کر دی گئی ہے۔ 192 صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب 300 روپے میں ''مثال کتاب گھر، صابر یہ پلازا، گلی نمبر 5، منشی محلّہ، امین پورہ، فیصل آباد سے دستیاب ہے۔ فون نمبر:0300-7980300۔

....

سرِ بازاری می رقصم ......صابر ظفر (کراچی)

علاّمہ طالب جوہری کی رائے میں :

> ''صابر ظفر کی شاعری کے بین السطور میں حالاتِ حاضرہ کی سماجی نفسیات اور ان کی پیچیدگیوں کا بھرپور اظہار موجود ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں فطرت کے عادت سے تصادم سے بخوبی آگاہ ہیں اور انہیں جمالیاتی سانچوں میں ڈھال کر غزل بنانے کا فن جانتے ہیں۔''

صابر ظفر تخلیقی ابالِ فراواں کے شاعر ہیں، ان پر اشعار مفرد صورت میں نہیں اترتے بلکہ تخلیقی وفور میں ان پر اشعار کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ غزلیں جو ردیف کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے قوافی بدل کر تخلیق کی گئی ہیں۔ ان کی غزلوں کے 31 مجموعے چھپ کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں اور اب بتیسواں مجموعہ ''سرِ بازاری رقصم'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے تو یہ قریباً چار سو اشعار پر مشتمل ایک ہی غزل ہے جو شیخ عثمان مروندی المعروف لال شہباز قلندر سے منسوب فارسی غزل کی طرح پر لکھی گئی ہے۔ شیخ عثمان مروندی کی غزل کا مطلع یہ ہے :

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم　　مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیشِ یارِ می رقصم

اس غزل میں داخلی طور پر موسیقی کی ایک ایسی لہر موجود ہے کہ شعر پڑھتے ہی قاری پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وہ آمادہ بہ رقص (جسے دھمال بھی کہا جا سکتا ہے) ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صابر ظفر کو بھی شیخ عثمان مروندی کی موسیقی نے ہی متاثر کیا اور وہ چونکہ فطری شاعر ہیں، اس لیے شاعری میں ''دھمال'' ڈالنے لگے۔ اور اشعار جن میں ان کے اپنے دنیاوی تجربے شامل تھے، ان پر اترنے لگے۔ قریباً چار سو اشعار کی یہ غزل.....اس صنف کی روایتی لخت لخت کیفیّت کی ہی آئینہ دار نہیں بلکہ صابر ظفر کے مفاہیم کی بھی ترجمان ہے اور اس جمالیات کی عکاسی بھی کرتی ہے جس کا جادو جگانے میں صابر ظفر کی فعالیت نمایاں ہوتی اور ان کی قادرالکلامی نئے نئے پیکر تراشتی ہے۔ چند اشعار جو ردیف کے واحد متکلم کی متنوّع کیفیات کے ترجمانی کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے :

جو پیہم دار پر رقصاں رہے مری گواہی دیں　　مثالِ قطرۂ شبنم، سرِ پرخار می رقصم
مری وحشت تو میرے پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتی　　سرِ خانہ، سرِ محفل، سرِ بازار می رقصم
زمیں ہے او رمیں رقصاں، برنگِ گردشِ کوزہ　　فلک ہے اور مثالِ گردشِ سیّار، می رقصم
مجھے اس نے بتایا تھا، کہ رقص اس کا عقیدہ ہے　　میں تھا آغاز میں منکر، مآلِ کار می رقصم

کتاب کا پیش لفظ اُردو کے بالغ نظر نقاد ڈاکٹر ناصر عبّاس نیّر نے لکھا ہے۔ ان کی رائے میں :

''صابر ظفر کی قادرالکلامی میں داد طلب نہیں۔ ایک نئی قسم کی شعری جمالیات کی تشکیل کا عمل بھی توّجہ طلب ہے اور یہ اشعار اُردو کی ابتدائی شاعری کی ریختہ نویسی کی طرف دھیان ضرور منتقل کرتے ہیں۔''

اس پیش لفظ کا اہم نکتہ یہ ہے کہ :

''شیخ عثمان اوّل صوفی اور بعد میں شاعر ہیں، ان کی شاعری ان کی صوفیانہ واردات کا اظہار ہے۔ گویا شاعری خود مقصود نہیں، ایک مقصودِ اصلی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ جب کہ صابر ظفر اوّل شاعر ہیں، انہیں تصوّف سے یقیناً دلچسپی ہے۔ ''سرِ بازاری رقصم'' کے مطالعے سے نہیں لگتا کہ تمام اشعار داخلی صوفیانہ واردات کا اظہار ہوں۔''

میرا خیال ہے کہ اس نکتے کو عام آدمی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا بلکہ یہ کتاب پڑھتے ہوئے صابر ظفر کے ساتھ خود بھی رقص کرنے لگتا ہے اور شاعری کی انوکھی واردات میں کھو جاتا ہے.....اس کتاب میں صابر ظفر ایک بالکل نئے غزل نگار کی صورت میں سامنے آئے ہیں اور وہ جدید کا پیوند قدیم ریختہ سے لگانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ اسے غزل کا ایک نیا تجرباتی پیکر بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ معنی خیز اور لطافت انگیز ورقص بیز کتاب 96 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت 150 روپے۔ مصنّف کا فون نمبر: 0300-2101223، ملنے کا پتہ: سٹی بک پوائنٹ، نوید اسکوائر، اُردو بازار، نزد مقدس مسجد، کراچی۔ ◆◆◆

چند ادبی رسائل انور سدید کی نظر میں

سہ ماہی ''انتساب''.....مدیر: سیفی سرونجی (انڈیا)

سہ ماہی ''انتساب'' بھارت میں اُردو کی ایک دُور افتادہ بستی سرونج سے جناب سیفی سرونجی گزشتہ 31 سال سے خدمتِ اردو کے خالص جذبے سے شائع کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر اس کا 92 واں شمارہ ہے جو اکتوبر تا دسمبر 2013ء کے تین ماہ کی اشاعت شمار ہوتا ہے اور اپنے معمول کی ضخامت 200 صفحات پر مشتمل ہے۔ سیفی سرونجی ''انتساب'' کو اُردو کا عالمی رسالہ شمار کرتے ہیں اور اس کے ادبی نمائندے کینیڈا (اطہر رضوی)، امریکہ (کامران ندیم)، انگلستان (گلشن کھنہ)، پاکستان (سیّد معراج جامی)، ابوظہبی (یعقوب تصوّر) اور جرمنی (سرور ظہیر) میں موجود ہیں اور اب یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ اُردو زبان جہاں بولی، پڑھی اور لکھی جا رہی ہے وہاں سہ ماہی ''انتساب'' بھی موجود ہے۔

ادبی رسالے کے اداریے کے بارے میں ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور کے جلیل القدر ادیب مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا کہ اداریے کا صفحہ مدیر کا صفحہ ہوتا ہے جس پر مدیر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ پرچے کی ادبی پالیسی کا تذکرہ کرتا ہے۔ عصری تحریکوں کے زیر و بم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں سے باتیں کرتا ہے۔'' اس روایت کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے رسالہ ''اوراق'' میں ''پہلا ورق'' کے عنوان سے اور اظہر جاوید نے اپنے رسالہ ''تخلیق'' میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے جاری رکھا۔ رسالہ ''صریر'' میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کسی ادبی مسئلے کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے تھے اور اس بحث کو کئی شماروں پر پھیلا دیتے تھے۔ صہبا لکھنوی مرحوم نے ''افکار'' میں مہمان اداریے کو فروغ دیا جو ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر حنیف فوق لکھا کرتے تھے۔ جناب سیفی سرونجی کے اختراعی ذہن نے اداریے کو مقالے کا مقام دے کر اسے تسلسل عطا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب زیرِ نظر پرچے میں ''اکیسویں صدی اور اردو ناول'' زیرِ بحث ہے۔ اس موضوع کی پانچویں قسط میں انہوں نے بھارت کے ممتاز افسانہ نگار آنند لہر کے ناول ''یہی سچ ہے'' پر بحث کی ہے اور داخلی طور پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناول نگار کی اپنی سوچ اور فکر ناول کے بیانیے میں شامل ہوتی ہے جو قاری کی سوچ کا زاویہ بدلنے کی سعی بھی کرتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ نکتہ ناول کی مقصدیت سے وابستہ ہے لیکن سیفی سرونجی صاحب نے اس پر بالواسطہ انداز میں بحث کی ہے اور رشوت خوری اور بے ایمانی کو انسانی ذہنوں میں سرایت دکھا کر اجتماعی سوچ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس اداریے کو پڑھ کر شاید آپ یہ کہنا مناسب سمجھیں کہ سیفی سرونجی ہمیں اپنی نئی کتاب کے کچھ حصّے اپنے رسالے کے اداراتی صفحات کا موقعہ عطا کر رہے ہیں اور کتاب کی تکمیل میں اشتیاق بڑھا رہے ہیں۔

رسالے کا آغاز ڈاکٹر اشرف آثاری کی حمد سے ہوتا ہے جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے۔ یہ حمد سری نگر سے طلوع ہوئی ہے۔

خدا نے ذکرِ نبیؐ کو دوام بخشا ہے رہے گا ذکرِ نبیؐ سے ہر اک زماں روشن

''انتساب'' میں سیفی سرونجی صاحب نے ادبا و شعرائے عصر کی تحسین کا انداز گزشتہ کئی شماروں سے اختیار کر رکھا ہے۔ زیرِ نظر پرچے میں علیم صبا نویدی نے خلیل مامون کی نظم گوئی کا ـــــ سعید رحمانی نے ''ارشد مینا نگری کی غزلوں کا ـــــ علی احمد فاطمی نے وسیم بریلوی کی مترنم اور متکلم شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ رفیق شاہین نے دہلی کی ادب اور ادیب نواز شخصیت نارنگ ساقی کو میخانۂ اُردو کا پیر مغاں قرار دے کر ان کی کتابوں پر طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس طرح نارنگ ساقی کا سراپا بھی ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ افسانے کے باب میں نور شاہ، اختر کاظمی، سراج فاروقی، رونق جمال، اشفاق برادر اور حنیف سیّد موجود ہیں جو نئے نام ہیں لیکن معاشرے کے مدوجزر کو گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ شاعری کے حصّے میں اتنے نام ہیں کہ سب گنوائے نہیں جاتے۔ رؤف خیر، مناظر عاشق ہرگانوی، علی احمد فاطمی، سوہن راہی، شاہد عزیز کے خطوط ذاتی ہونے کے باوجود غیر ذاتی اور ادبی بھی ہیں اور پر لطف مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ''انتساب'' ایسا پرچہ ہے جو اُردو کے ہر قاری کو باقاعدہ پڑھنا چاہیے۔ اس کا مطالعہ عصری ادب سے وابستہ رکھتا ہے۔ اس شمارے کی قیمت 60 روپے۔ سالانہ 240 روپے۔ ملنے کا پتہ: رسالہ ''انتساب''، سیفی لائبریری، سرونج (ایم۔ پی) (464228)، بھارت (انڈیا)

.....

ماہنامہ ''شاداب'' لاہور..... مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز.....معاون اعزازی : نسرین انجم بھٹی

اظہر جاوید کے دوست کنول فیروز سرگودھا سے نکلے تو اُردو کے معروف شاعر الطاف مشہدی (شاعر شباب) نے فرمایا :

''سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا''

اور واقعی کنول فیروز لاہور پہنچے تو اس شہرِ بے مثال میں ''شاداب'' نکال کر اپنی خوشبو ہر طرف بکھیرنے لگے۔ ''شاداب'' بظاہر ایک فرقے کا ترجمان ہے لیکن اس پر ادب کی مہر پختہ لگی ہوئی ہے۔ ہمارے پیشِ نظر جون 2014ء کا پرچہ ہے۔ جس کا آغاز غالبؔ کے لامعاصر شاعر ظفر اقبال کی اس غزل سے ہوتا ہے :

دل کی تختی سے مٹایا ہوا تو یاد آتا ہے بھلایا ہوا تو

''شاداب'' کا شاعری کا حصّہ بے حد وقیع ہے اور یہاں ہماری ملاقات ناصر زیدی، کوثر ایمن، ملک علی رضا، شبیر ناقد، ارشد منظور، رضا زیدی، کرامت بخاری، یونس صابر، زبیدہ حیدر زیبی، محمد ممتاز راشد اور کنول فیروز کی غزلوں سے ہوتی ہے جو تازہ افکار سے مرصّع ہیں۔ کنول فیروز نے شاداب تنقید کے لیے خطوط کو وسیلہ بنایا ہے۔ یہاں ہر شخص کو اپنی بات ادبی اسلوب میں کھل کر لکھنے کی اجازت ہے۔ یہ خطوط ''برداشت'' کے کلچر کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہاں ناصر زیدی میرِ مجلس قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ دیگر خطوط نگاروں میں محمد ممتاز راشد، یونس صابر، عارف چودھری، خالد جاوید جان، کرامت بخاری، عاشق علی، شری مرلی چند اور وجے پونم وغیرہ شامل ہیں اور ہر ایک نے ادب کا کوئی نیا نکتہ اٹھایا ہے۔ ''شاداب'' ادب کا سادہ لیکن دل رُبا اور خوشبودار پرچہ ہے۔ ملنے کا پتہ: 477۔ جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

◆◆◆

آفتاب خان کے تبصرے

کچھ دیکھے کچھ سُنے .....نند کشور وکرم (انڈیا)

ناشر : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، ایف 4/21 (ڈی) کرشن نگر، دہلی صفحات :256 قیمت : 250 روپے

نند کشور وکرم اردو ادب کی جانی پہچانی اور معروف شخصیت ہیں اس حوالے سے ان کے تعلقات کئی نامور شخصیات سے قائم رہے ہیں۔ ان شخصیات کی دوستی اور قربت بھی انہیں حاصل رہی جبکہ کچھ ایسی ادبی شخصیات بھی تھیں جن سے ان کی براہ راست ملاقات نہ رہی لیکن یہ ان کے فن سے متاثر ہوئے اس لئے زیر تبصرہ کتاب میں انہیں یادگار ادبی لوگوں کے قصے ہیں جو نند کشور وکرم کے حلقۂ احباب میں شامل تھے یا جنہیں یہ پسند کرتے تھے۔ کتاب میں 23 نامور ادبی شخصیات کے بارے میں مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں چند ایک کے نام یہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، جگن ناتھ آزاد، استاد دامن، دیویندر اسر، دیویندر ستیارتھی، سردار جعفری، شباب للت، شورش کاشمیری، صابر دت، گوپی چند نارنگ، منیر نیازی، اسرار الحق اور نارنگ ساقی وغیرہ.....نند کشور وکرم کا اندازِ تحریر سادہ مگر پُر اثر ہے انہوں نے ہر مضمون میں مختصر طور پر فن اور شخصیت دونوں پر اظہار خیال فرمایا ہے اور اس طرح دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد طفیل (نقوش والے) کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے نقوش کے ان خاص نمبروں کی تفصیل بھی درج کر دی جو اب ایک حوالے کا کام دیتے ہیں۔ ان خاص نمبروں کی تعداد 46 بنتی ہے۔ وکرم صاحب نے ان کے صفحات کی تعداد اور سال اشاعت تک درج کر دیا ہے۔ دیگر ادبی شخصیات کے کام کے حوالے سے بھی انہوں نے اس قدر مختصر مگر جامع لکھ دیا ہے کہ جسے پڑھ کر اس شخصیت کا مکمل خاکہ سامنے آ جاتا ہے اور اس شاعر یا ادیب کے نظریات و خیالات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ نند کشور وکرم نے یہ مضامین یکجا کر کے نہ صرف ان شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ ایک تاریخ محفوظ کر دی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ یہ مضامین انہوں نے قلم سے نہیں دل سے لکھے ہیں۔

.....

خدا سب یاد رکھتا ہے.....آصفہ نشاط (امریکہ)

پبلشر : مکتبۂ فکر و دانش، اُردو بازار، لاہور صفحات : 240 قیمت : 300 روپے

آصفہ نشاط کی شاعری اور افسانے ایک عرصے سے پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ اس مجموعے کے کئی افسانے میں نے پہلے بھی پڑھ رکھے تھے مگر کتاب ملنے پر مکرر مطالعہ نے دوگنا لطف عطا کر دیا۔ خاص طور پر کتاب کا ٹائٹل افسانہ تو انتہائی کمال کا ہے اسے اگر تھوڑا سا

طویل کرلیا جائے تو ناولٹ کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے۔ بہرحال آصفہ نشاط ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے زبان و بیان،ثقافت،ماحول،رہن سہن،اندازِ بیان اور گفتگو کی نشست و برخاست کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں ہر وہ چیز شامل کی جو ہمارے معاشرے اور دنیا کا حصہ ہے۔انہوں نے بیشتر افسانے وطنِ عزیز کے ماحول اور کلچر کے حوالے سے تحریر کیے ہیں چند ایک مغربی کلچر کی عکاسی بھی کرتے ہیں مگر بات وہی ہے کہ انہوں نے ہر کردار کو اس کے ماحول کی زبان عطا کی ہے۔جس میں مصنوعی پن یا ملاوٹ نظر نہیں آتی سب کچھ اوریجنل دکھائی دیتا ہے۔ یہ 27 افسانے پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آصفہ نشاط ایک ماہر افسانہ نگار ہیں اور قاری کی نبض پر ہاتھ رکھ کر لکھتی ہیں۔ان میں سے بیشتر افسانوں کے عنوان بھی انتہائی منفرد اور حیرت انگیز ہیں مثلاً وظیفے کا پیالہ، لیری پارکر کو کال کرو، بون سائی، بھابی کی لیبارٹری، چھٹا کلمہ ردِ کفر، چھوٹی بریکٹ شروع بڑی بریکٹ بند وغیرہ وغیرہ۔آصفہ نشاط نے جس طرح کے افسانے اس مجموعے میں قاری کے پڑھنے کو دیئے ہیں۔امید ہے کہ وہ اس طرح کے مزید افسانوی مجموعے بھی اردو ادب کو عطا کریں گی جن میں حیرت،تجسس،واقعات،کہانی،ڈرامہ،تحیر اور سسپنس سبھی کچھ موجود ہو کیونکہ یہ سب کچھ ان کے افسانوں کے بنیادی ماخذ ہیں۔

....

شب تاب ...... حسن عسکری کاظمی (لاہور)

ناشر: الحمد پبلی کیشنز، لاہور   **صفحات** : 176   **قیمت** : 200 روپے

حسن عسکری کاظمی سینئر ادیب اور شاعر ہیں۔اُن کی متعدد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔نعتؐ، مرثیہ، سلام، منقبت کے علاوہ غزل اور نظم کے متعدد مجموعے شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔سفر نامے اور زندگی نامہ بھی کتابی شکل میں موجود ہے۔ بلاشبہ وہ ادب کا ایک درخشاں ستارا ہیں۔زیرِ تبصرہ کتاب غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔کاظمی صاحب کی شاعری کے موضوعات بھی وہی ہیں جو ہر دردِ دل رکھنے والے شاعر کے ہوتے ہیں۔زمانے کی بے ثباتی،لوگوں میں خلوص کی کمی، بے حسی کا عالم،ایک دوسرے کے دُکھ سے غافل ہونے کا المیہ اور اُس پر ہجر و فراق کے صدمے، یہ سب کچھ اُن کی شاعری میں سمایا ہوا ہے۔وہ سادگی اور ہنرمندی سے اپنی دل کی بات کر جاتے ہیں۔

کتاب میں شامل آزاد نظمیں اِس دور کا المیہ پیش کرنے کا سبب ہیں۔ہمارے اردگرد معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے نظموں کی صورت میں کاظمی صاحب نے خوبصورتی سے تصویر کیا ہے۔ان نظموں میں لوڈ شیڈنگ، کارِ دشوار، سرگورِ غریباں، بے چارگی، تحلیلِ نفسی، ہجرت اور لاحاصل کے عنوان سے لکھی گئیں نظمیں آج کے انسان کا نوحہ ہیں۔اُس انسان کا دردناک ماجرہ ہیں جو اپنا وجود برقرار رکھنے کی جدوجہد میں ریزہ ریزہ بکھرتا جا رہا ہے۔حسن عسکری کاظمی نے معاشرے نبّاض کی حیثیت سے خوب نشتر زنی کی ہے۔اس لیے اُن کی اس کتاب کو شہرِ آشوب کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے اور یہ ایک منفرد ادبی کام ہے۔

....

ورثہ دانش یونان ..... ظفر سپل (لاہور)

ناشر: بُک ہوم، لاہور صفحات : 128 قیمت : 300 روپے

فلسفے کا آغاز قدیم یونان سے ہوا اور یہاں پیدا ہونے والے فلسفی آج بھی دنیا کے سب سے بڑے فلسفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ظفر سپل نے فلسفہ کی اِسی تاریخ کو مرتب کرنے کا کارہائے نمایاں سرانجام دیا ہے۔انہوں نے اِس کتاب میں فلسفے کی ابتدا سے لے کر عروج و زوال تک کے تمام مراحل کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔فیثا غورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے علاوہ اس دور یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں پائے جانے والے فلسفیوں کے حالات ونظریات سے پردہ اُٹھایا ہے۔یوں تو اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس کتاب کی انفرادیت سہل ترین اندازِ تحریر، روانی اور فکشن کے طرز پر لکھا جانا ہی اِسے دوسری کتابوں سے الگ اور منفرد بناتا ہے۔ظفر سپل نے تاریخ فلسفہ کے آغاز سے لے کر انجام تک مختلف ابواب کی تمام تر کہانی بیان کی ہے جس میں ٹھہراؤ کے ساتھ تیز ٹیمپو سے بھی کام لیا گیا ہے اور اسے اِس انداز میں تحریر کیا ہے کہ فلسفے جیسا خشک موضوع پڑھنے والے کو بور نہ کرے بلکہ اِسے واقعاتی اعتبار سے نہایت دلچسپ بنا دیا گیا ہے جیسے قاری کوئی تاریخی ناول پڑھ رہا ہو۔کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہر فلسفی نے اپنا نظریہ پیش کر کے اُس وقت کے لوگوں کو ہمنوا اور ہم خیال بنایا اور کس طرح اُسی فلسفے کے خلاف اُٹھ کر کسی اور فلسفی نے عوام کو پہلے فلسفے سے متنفر کر کے اپنی دکانداری چمکائی اور پھر ان تمام فلسفیوں کے مختلف نظریات نے آنے والے زمانوں پر کیا اثرات مرتب کیے۔ اِن تمام باتوں کا احاطہ بخوبی کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب یونانی فلسفے اور دانش کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل اور رہ نما کتاب کا درجہ رکھتی ہے اور فلسفے کے طالب علموں کے لیے بھی اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔کتاب میں بعض مناظر اتنی خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے مثلاً سقراط کے آخری لمحات اِس طرح درج ہیں :

> ''سقراط نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں لیا تو بڑی سہولت اور نرمی برتی، نہ اُس کے چہرے پر خوف لہرایا اور نہ رنگ فق ہوا پھر وہ جیلر سے یوں مخاطب ہوا ''یہ بتاؤ کسی دیوتا کے نام پر تھوڑا سا زہر زمین پر گرایا جا سکتا ہے'' جیلر نے کہا ''سقراط! زہر تو اتنا ہی تیار کیا جاتا ہے جتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔سقراط نے کہا ''میں سمجھ گیا اور میری دُعا ہے کہ دیوتا اِسے قبول کریں'' پھر اُس نے پیالہ منہ سے لگا لیا اور بڑی سہولت اور اطمینان سے زہر پی لی۔''

بظاہر سقراط نے زہر پی لیا مگر لیاقت علی عاصم نے جب اس خیال کو شعر میں باندھا تو کمال کر دیا :

اُس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

یقیناً سقراط زندہ ہے کتابوں میں اور زندہ رہے گا۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ سونان اظہر جاوید صاحب!

آپ کی بہت مہربانی کہ جون 2014ء کا شمارہ مجھے عطا فرمایا۔ مَیں نے سارا پرچہ پڑھا ہے۔ مجھے خاص خوشی ہوئی کہ انور سدید صاحب نے میرے سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگار غلام عباس کے بارے میں مضمون لکھا ہے۔ باقی مندرجات بھی بہت خوب ہیں۔ آپ نے بہت ہُنر مندی سے اظہر جاوید مرحوم (اظہر جاوید جیسے اصحاب کو ''مرحوم'' لکھنا مناسب نہیں لگتا) کی عمر بھر کی کمائی کی لاج رکھی ہے۔ دُعا ہے کہ آپ اور ''تخلیق'' قائم ودائم رہیں۔

عبداللہ حسین (لاہور) .....

﴿2﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

پہلے تو ایک دلی معذرت کہ ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ چار سال پہلے ستمبر 2010 میں بہت سی اصولی وجوہ کی بنا پر میں نے ''جنگ'' گروپ سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اب میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ درست وقت پر درست اقدام تھا۔ بہر حال اس کے بعد بہت سے نشیب و فراز آتے رہے جن میں الجھنے کے باعث ''تخلیق'' سے ربط مستحکم نہیں رہا حالاں کہ آپ کی طرف سے محبت میں کمی نہیں آئی۔

''تخلیق'' ایک رسالہ نہیں ایک خاندان ہے، ایک حلقہ ہے، ایک انجمن ہے۔ اظہر جاوید کا لگایا ہوا ایک پیڑ ہے جس کی چھاؤں میں کتنی نسلیں پناہ لیتی آ رہی ہیں۔ ایک مشعل ہے جس کی لو کئی ملکوں کئی شہروں میں راستہ دکھاتی ہے۔ اظہر جاوید بہت جلدی چلے گئے ہم سب کو ویران کر گئے۔ وہ ایک مرکز تھے محور تھے۔ ہم بہت سے لکھنے والے ان کے ذریعے جڑے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کا درد جان لیتے تھے، بانٹ بھی لیتے تھے مگر اب یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے بڑی محنت، محبت، عقیدت اور تگ و دو سے اس خاندان، اس حلقے، اس انجمن کو برقرار رکھا ہے اس مشعل کو بجھنے نہیں دیا، بلکہ اس کی لو اور بڑھا دی ہے۔ ''تخلیق'' میں حسن دو چند ہو گیا ہے۔ رنگ فزوں اور مندرجات زیادہ متنوع ہو گئے ہیں۔ اس میں یقینی طور پر آپ کی اپنی ہمت، صلاحیت اور وژن کا بھی دخل ہے لیکن اس میں ان رتجگوں کا بھی سحر ہے جو اظہر جاوید نے آپ کے لئے کاٹے ہوں گے۔ ان سرگوشیوں کا بھی حصہ ہو گا جو انہوں نے لاہور کی گلیوں میں اس وقت کی ہوں گی جب آپ کی ننھی ننھی انگلیاں ہاتھوں میں تھامے وہ آپ کی آنکھوں سے آنے والے زمانوں کے ''تخلیق'' کے شمارے دیکھ رہے ہونگے۔ میں اپنے اکثر دوستوں کی آئندہ نسل کی کارکردگی پر کڑھتا ہوں اور تشویش میں مبتلا ہوتا ہوں کہ بڑے ادیبوں، شاعروں اور قائدین کی میراث ایسی

کیوں ہوتی ہے لیکن اظہر جاوید نے اس دنیا کے جانے کے بعد بھی ہمیں اداس نہیں کیا ہے۔ میں ''تخلیق'' با قاعدگی سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ اس کی ظاہری شکل بھی سنوری ہے اور باطنی بھی۔ یعنی صورت سیرت دونوں خوب سے خوب تر ہوئے ہیں۔ میرے دل سے آپ کے لئے تحسین کی آواز آ رہی ہے۔ آج آپ کو مخاطب کرنے کے قابل اس لئے ہوا ہوں کہ میں نے اپنا ایک منفرد ماہنامہ ''اطراف'' شروع کر دیا ہے اور ایک طمانیت اور تسکین محسوس کر رہا ہوں۔ خوش رہیں آباد رہیں۔ ''تخلیق'' ہی کائنات کا مقصد ہے۔ زندہ معاشرے تخلیق کے عمل اور صلاحیتوں سے ہی اپنا مقام حاصل کرتے ہیں، تازہ ''تخلیق'' میں سرورق، امین راحت چغتائی کی نعت، مشتاق اعظمی کا افسانہ، نثار ترابی کی غزل، ابدال بیلا کا سفرنامہ بہت اچھے لگے۔

محمود شام (کراچی) .....

﴿3﴾ محترمی سونان صاحب!

''تخلیق'' کا نیا شمارہ مل گیا ہے جو درحقیقت اظہر جاوید مرحوم سے ایک طویل ملاقات کے مترادف ہے اور وہ زندگی کے عمل میں ہمارے ساتھ شامل نظر آتے ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ ان کی وفات کے بعد ''تخلیق'' میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ اس کا آغاز اللہ کے پاک نام یعنی حمد سے ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی بارگاہِ رسالتؐ میں عقیدت کے پھول بھی چنے جانے لگے۔ جون کے پرچے میں نورین طعت عروبہ کی حمد نے عجیب سرشاری کی کیفیّت پیدا کی۔ نئے قوافی نے ردیف کے ساتھ مل کر عقیدت کی نئی چاندنی بکھیری۔ امین راحت چغتائی کی قادرالکلامی پر تو کسی کو شک نہیں لیکن جب وہ نعت کہتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حرمِ نبویؐ میں دوزانو ہو کر فکرِ شعر کر رہے ہیں اور ان کی آرزوئے زیارت پوری ہو رہی ہے۔ روئے جمالِ احمدؐ اشعار میں اتر رہا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! اس دور میں نعت کثرت سے لکھی جا رہی ہے لیکن میں معذرت سے عرض کروں گا کہ عقیدت کا اظہار بے حد روایتی انداز میں کیا جا رہا ہے۔ بھارت کے ایک رسالے نے تو اعلان کر دیا ہے کہ وہ روایتی نعتوں کی بجائے ان گلہائے عقیدت کو اشاعت کے لیے قبول کریں گے جن کی مہک سے زمانہ معطّر ہو جائے اور شاعر عقیدتِ نبویؐ میں ڈوبا ہوا نظر آئے۔ محض قافیہ پیمائی نعت کہنے کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف یہ حقیقت تسلیم کی جا چکی ہے کہ غزل کے ایک مصرعۂ تر کے لیے شاعر کے تن کا سیروں لہو صرف ہوتا ہے اور نعت تو روحانی عمل بھی ہے جسے لکھتے وقت حقیقی شاعر اپنے وجود سے ماورا کسی اور جہان میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ بات برسبیلِ تذکرہ قلم پر آ گئی کہ ان دنوں رسائل میں حمدوں اور نعتوں کی اشاعت افراط سے ہو رہی ہے لیکن بہت کم شعرائے کرام روح کے تاروں کو ہلانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تخلیق خوش قسمت ہے کہ اسے حمد و نعت کے چند اچھے شاعروں کا تعاون حاصل ہے۔ جناب امین راحت چغتائی اور نورین طلعت عروبہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ میرا مشورہ اگر قبول کرنے کے قابل ہو تو درخواست ہے کہ حمد و نعت کا انتخاب کڑا کر دیجئے۔ آپ کے اس اقدام سے اظہر جاوید عقبیٰ میں خوش ہوں گے۔

مسلم شمیم صاحب نے ''ادب اور معرکۂ خیر و شر'' کے عنوان سے فکر انگیز مقالہ لکھا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ قدیم ترین مسئلہ درحقیقت اخلاقیات سے تعلّق رکھتا ہے اور یہ انسان کی اس بنیادی جستجو کا مظہر ہے جو وہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے عمل میں لاتا ہے۔ مسلم شمیم صاحب نے بھی اس کی طرف واضح اشارہ کیا ہے تاہم اس مقالے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک مخصوص حوالے سے ادب کی عملی تنقید کو فوقیت دی گئی ہے اور ان کا یہ جملہ تو گراں قیمت ہے کہ:

''قلم کی روشنائی میں خیر کی روشنی شاملِ تابندگی ہے۔ خیر کے پرچم کی سراسر بلندی ادب کی سربلندی کا نشانِ راہ ہے اور شر سے نبرد آزما ہونے اور رہنے کی بوطیقا ہے۔''

افسانوں میں جناب مشتاق اعظمی کے افسانے ''ان کہی'' نے چونکا دیا۔ ابتدا میں یہ ایک عام سا روایتی رومانی افسانہ نظر آتا ہے جس کی صورتِ واقعہ ہر اس ہوٹل میں سامنے آ سکتی ہے جو سیّاحت کے دیدہ زیب مقامات پر سیّاحوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور پھر محبت کی وہ کہانی بھی سامنے آتی ہے جو درحقیقت سیّاح کے جنسی تقاضوں کی تکمیل پر منتج ہوتی ہے۔ ''ان کہی'' میں اکسائز انسپکٹر انیل بسواس بھی ایسا ہی سیّاح محسوس ہوتا ہے لیکن افسانہ نگار مشتاق اعظمی نے اس کے کردار کے کچھ انوکھے زاویے بھی تراشے ہیں۔ افسانے کی اصل حقیقت تو اختتام پر جا کر کلکتہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر دس پر کھلتی ہے۔ جب ادھیڑ عمر کا ایک آدمی چاقو کی نوک سے مردہ بچے کے پیٹ کے ٹانکے کاٹ دیتا ہے اور پولی تھن کی جھلّی میں لپٹے ہوئے افیون کے گولے میز پر نکال کر رکھنے لگتا ہے.....'' اسی وقت دور کھڑا انیل بسواس اسے مشتبہ نظر آتا ہے اور وہ سچترا سے کہہ رہا ہے۔

''تم نے مارک نہیں کیا پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا وہ نوجوان تمہیں کس طرح گھور رہا تھا۔ شاید وہ اکسائز کا آدمی تھی۔'' مشتاق اعظمی نے جرائم پیشہ معاشرے کی حقیقت کو اس افسانے میں بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے اور بالواسطہ طور پر ہمیں بھارتی سماج میں پلنے والے جرائم کی خبر سے بھی محروم نہیں رکھا۔ مشتاق اعظمی نے ساری کہانی سادگی اور پرکاری سے پیش کی ہے اور اختتام پر خوف کی فضا پیدا کرنے میں بھی وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ افسانہ اب تک میرے ذہن کے گرد منڈلاتا رہا اور شاید کبھی نہ بھولے۔ اسے 2014ء کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

طارق علی کا افسانہ ''لیڈی سیکرٹری'' جو ایک جوان اور پردے میں ملفوف لڑکی کا قصّہ ہے حقیقت کی ایسی قاش ہے جس کے تاثر کو مصنّف کے کہانی بیان کرنے کے اسلوب نے دوآتشہ بنا دیا ہے۔ عطیہ سیّد کا افسانہ پڑھ کر واقعی یقین آ جاتا ہے کہ محبت کبھی نہیں مرجھاتی۔'' اور کہانی کا یہ جملہ سرخ گلابوں کی کیفیت ہی بدل دیتا ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ محترمہ عطیہ سیّد گہرے مشاہدے کی افسانہ نگار ہیں اور وہ آج کی زندگی کو روند کر گزر جانے کی بجائے اس کے باطن سے کہانی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ''شام کا تارا'' اظہر جاوید کا افسانہ نہیں، ان کی اپنی زندگی کا ایک باب نظر آتا ہے جو پہلے پنجابی میں چھپا تھا اور اب محترم حنیف باوا نے اسے اُردو زبان میں منتقل کر کے جاوداں حیثیت دے دی ہے۔

''انشائیہ'' وسیع تر امکانات کی صنفِ ادب ہے، جس کی نمائندگی ''تخلیق'' میں سلیم آغا قزلباش نے اپنے انشائیہ..... ''بھول جانا'' سے کی ہے۔ انہوں نے اس عام موضوع کے خاص الخاص نکتے ابھارے ہیں جو ذہن کو جہت عطا کرتے ہیں۔ نیّر رانی شفق کے انشائیے ''رازداں کیسے کیسے؟'' میں قلب و نظر کے رشتوں کو رعنائیِ خیال سے دریافت کیا اور یہ نتیجہ بھی نکالا کہ اگر آنکھوں سے راز چھپانا مقصود ہو تو دل کو بھی رازدان نہیں بنانا چاہیے۔'' نیّر رانی شفق کے تخلیقی باطن میں انشائیہ کا جوہر موجود ہے۔ اور یہ جوہر زیادہ منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ یعنی انہیں بلا توقّف اپنی پسند کے موضوعات پر مزید انشائیے لکھنے چاہئیں۔ اظہر جاوید کا خاکہ ''میرے مرشد اشفاق احمد'' اور ابدال بیلا کا خاکہ..... ''بہتا دریا۔ بابا عرفان الحق'' دو ایسے انسانوں کے خاکے ہیں جن کے اوصاف زمینی کم اور ماورائی زیادہ تھے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا مضمون ''عاشقی صبر طلب'' ان کی قومی دردمندی کا مظہر ہے۔ اس مضمون میں امریکی دہشت گردی کا زاویہ معنی خیز اور حقیقت پر مبنی ہے۔

پاکستانی قوم ان دنوں اپنے حکمرانوں کے وسیلے سے اسی دہشت گردی کی زد میں ہے۔ان کا یہ نکتہ ثقہ جیالوں کو ضرور چونکا دے گا کہ

''بے نظیر بھٹو بھی باپ (ذوالفقار علی بھٹو) کی طرح مذہبی رجحانات رکھنے والی خاتون تھی۔انہوں نے طالبان کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔''

علی سفیان آفاقی نے فلم ساز منور ایچ قاسم کو جس عینک سے دیکھا ہے وہ عزیز میرٹھی کی عینک سے مختلف رنگ کی ہے۔اس لیے دونوں کے ایک ہی شخصیّت کے بارے میں مشاہدات ایک جیسے نہیں ہیں۔دونوں کے تاثرات جداگانہ ہیں۔ڈاکٹر ابدال بیلا صاحب لوازماتِ سفر مکمل کرنے کے بعد اب ہمیں اپنی سیّاحت کے ثمرات سے فیض یاب کرنے لگے ہیں۔سفرنامہ ''سورج کے رُخ پر'' کی چوتھی قسط کی دلچسپی قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے اور اگلی قسط کے انتظار پر آمادہ کرتی ہے۔اب ابدال بیلا صاحب اس سفرنامے کو پوری اکیسویں صدی میں بھی پھیلا دیں تو انہیں حق ہے۔اردو کے ضخیم ترین ناول کے مصنّف تو وہ تسلیم کیے جا چکے ہیں۔

طنز و مزاح کے باب میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا مزاح پارہ ''دیکھتے ہیں ہم کہ غالبؔ کون ہے؟'' اس شمارے کا لطافت آگیں مضمون ہے جو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹوں کو جنم دیتا ہے۔بظاہر اس میں تحقیق کا عنصر شامل ہے لیکن اس کی تخلیقی شان وہی ہے۔یہ افسانہ نما مزاح پارہ جناب معین قریشی پر اسی طرح اُترا ہے جس طرح غالب پر مضامین غیب سے آتے تھے اور صریرِ خامہ کو نوائے سروش بنا دیتے تھے۔اس مزاح پارے میں ''نوائے پاکستان'' سنی جا سکتی ہے۔بلاشبہ اس وقت ایس ایم معین قریشی صاحب بحران گزیدہ دکھی معاشرے میں بے دریغ مسکراہٹیں تقسیم کر رہے ہیں۔

''انجمن خیال'' میں اس مرتبہ سب سے زیادہ اربابِ نکتہ دان نے حصہ لیا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ ہر خط پر چہ پڑھنے کے بعد پیدا ہونے والے تاثر پر مشتمل ہے۔جناب امین راحت چغتائی، نسیم سحر، قیصر نجفی، سکندر حیات میکن، نجیب عمر، سیمیں کرن، پروفیسر زہیر کنجاہی، ایم ڈی ملک اور جمیل حیات صاحب کے خطوط کو عملی تنقید کا عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے اور تنقید کو دلیل سے روشن کیا گیا ہے اور لکھنے والوں کو ان خطوط سے روشنی بھی ملتی ہے۔

غزلوں کی تعداد اس مرتبہ بھی زیادہ ہے۔حسن عسکری کاظمی نے مکالماتی غزل کی تجدید کی ہے۔عدیم ہاشمی زندہ تھے تو دعویٰ کرتے تھے کہ وہ مکالماتی غزل کے بانی ہیں۔احمد ندیم قاسمی ان کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔چنانچہ دونوں کے تعلّقات کشیدہ ہو گئے اور پھر عدیم ہاشمی نے جو ''ناگفتنی'' اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں لکھی وہ بے حد افسوس ناک ہے۔شکر ہے کہ حسن عسکری کاظمی نے اپنی مکالماتی غزل کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا۔نظم کے حصّے میں ایوّب خاور کی نظم ''آخر کس دن'' نے بہت متاثر کیا۔شاہین کا ''عالی رنگ''، ابصار عبدالعلی کا گیت اور سیفی سرونجی اور نور زمان ناوک کے دوہوں میں ان کا زمینی تجربہ بول رہا ہے۔فوقیہ مشتاق نے کراچی میں قیام کے دوران ''ترویٰنی'' میں نام پیدا کیا تھا۔یاد پڑتا ہے کہ ترویٰنی کے بانی گلزار نے بھی فوقیہ مشتاق کی تعریف کی تھی۔اب اس صنف کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔خدا جانے کیوں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ جا کر ان پر ''مرے آنسو بھی ہجرت کر چکے ہیں'' جیسی نظمیں اترنے لگی ہیں۔میں ''تخلیق'' میں فوقیہ مشتاق کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

آپ نے ''تخلیق'' جون 2014ء کی ''پہلی بات'' نوکیلے اسلوب میں لکھی ہے۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ ادبی تقریبات میں اب ''موج میلے'' کا رنگ آ گیا ہے اور ادبی معاشرے میں بدعنوانی بھی در آئی ہے۔آپ نے اپنا احتجاج درج رجسٹر کرا دیا ہے۔گویا آپ

نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جناب انیس یعقوب نے جون کے شمارے کا سرورق خوبصورت بنایا ہے۔ رنگوں کا امتزاج جاذبِ نظر ہے اور پرندوں کی اڑان ''خوب تر'' کی طرف علامتی اشارہ ہے۔ آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ ''تخلیق'' لکھنے اور پڑھنے والوں کا محبوب رسالہ بنتا جا رہا ہے۔ میں اس کی مزید کامیابیوں کی دعا کرتا ہوں۔ میرے اور ہم سب کے دوست صابر لودھی صاحب ان دنوں بہت بیمار ہیں۔ اربابِ ادب ان کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

انور سدید (لاہور) .....

﴿4﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

تازہ ''تخلیق'' کے مطالعے سے روحانی خوشی ہوئی۔ کیوں نہ ہو اس سے اپنا پرانا تعلق جو ہوا۔ بھائی اظہر جاوید مرحوم کی نوازشیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ میں نے جیسا کچھ بھی لکھا انہوں نے اسے اہمیت دی اور حسبِ مقام جگہ دی۔ اٹھانے بٹھانے میں مرحوم کو سلیقہ حاصل تھا۔ رسالے پر آپ کا نوٹ دل کو لگا۔ آپ ''تخلیق'' کے ''پرانوں'' کو نظر میں رکھتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے باب میں آپس کی دوری نے مجھے ''تخلیق'' سے فاصلے پر کر دیا تھا ورنہ میں ''تخلیق'' کا سچا اور مخلص دعا گو ہوں۔ بڑھاپے نے ہاتھ کی جنبش اور آنکھوں کے دم کو ''معرضِ عجز'' میں ڈال دیا ہے۔

آصف ثاقب (بوئی۔ ہزارہ) .....

﴿5﴾ عزیزم سونان۔ دعائیں!

سب سے پہلے میں نام بنام ان تمام قلم دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جنہوں نے افسانہ ''گیسو'' پسند کیا۔ اور اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کیا اور سراہا..... جناب امین راحت چغتائی، جناب سلطان رشک، جناب پروفیسر زہیر کنجاہی، جناب شفیع ہمدم، جناب قیصر نجفی، محترمہ رومانہ رومی، محترمہ نجمہ عثمان، محترمہ سیمیں کرن، محترمہ دروانہ نوشین، جناب سکندر حیات میکن، جناب نجیب عمر، جناب جاوید احسن، جناب قمر علوی، جناب جمیل حیات اور جناب ایم ڈی ملک، عمروں کا تفاوت بیان کئے بغیر میں نے سب کو قلم دوست کہہ دیا ہے۔ کیونکہ ہم لوگ قلم کی ہم عصری سے وابستہ ہیں۔ سچی بات ہے سونان کسی بھی عمر میں جب کوئی سینئر یا جونیئر ہماری تحریر کی تعریف کرتا ہے تو سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ رائیگانی کا احساس نہیں ہوتا۔ فی زمانہ مخلصانہ انداز میں کسی کی تعریف کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ انہیں کا کام ہے، ہیں جن کے حوصلے زیاد!

حقیقت ہے کہ بندہ ساری عمر سیکھتا رہتا ہے۔ کبھی بڑوں سے کبھی چھوٹوں سے..... اب تم نے ہمیں سکھانا شروع کر دیا ہے۔ کہتے رہتے ہو۔ مختصر لکھو..... اوپر سے مجھے دھمکی بھی دیتے ہو کہ خطوں کے جواب میں کچھ کہیں..... اب اگر یہ خط طویل ہو گیا تو قصور تمہارا ہوگا۔ صاحب زادے! ہر کہانی اور افسانے کا اپنا ٹریٹ سنٹ ہوتا ہے۔ اور اسی حساب سے وہ طویل یا مختصر ہوتی ہے۔ یہ قمیض نہیں ہوتی کہ کاٹ کر چھوٹی کر لی جائے۔

دوسری بات یہ کہ..... اس دنیا میں جب تک نسلیں جوان ہوتی رہیں گی۔ محبت کی کہانی لکھی جاتی رہے گی۔ محبت کا موضوع کبھی

فرسودہ نہ ہوگا۔نہ فلموں کے لئے نہ ناولوں کے لئے.....البتہ اسلوب ان کو نیا آہنگ عطا کرتا رہے گا۔

اس روئے ارض پر تین کردار ایک ساتھ اتارے گئے تھے۔حوا، آدم اور ابلیس.....ساری کہانیاں انہی کے گرد گھومتی رہیں گی۔ کوئی بھی زمانہ ہو کوئی بھی ماحول ہو۔

جس قدر باریک بینی سے کوئی مصنف انسانی فطرت کی باریکیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔اتنی ہی محیر العقول کہانیاں لکھ سکتا ہے۔''خانۂ آزاد'' ہمارے کلاسیک ادب کا خزینہ ہے۔اس میں مافوق الفطرت کردار، محیر العقل واقعات اور ناقابل یقین واردات ہیں۔جنہیں تھل بعض اوقات تسلیم نہیں کرتی مگر افسانے کا افوں اسے تسلیم کرتا ہے۔

کسی زمانے میں، ایک فلمساز پاکستان آئے تھے۔میں ان دنوں فلمی دنیا پر ایک ناول لکھ رہی تھی۔بعض ٹیکنکل باتوں میں راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ان سے ملی تھی۔انہوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ Fiction میں Technicaliteis یا جزئیات کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ سب خیال آرائی کی ٹیکنیک ہوتی ہے۔''سٹار وار'' اور ''سائنس فکشن'' پر جو فلمیں بن رہی ہیں۔اور کروڑوں کا بزنس کر رہی ہیں۔ان کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔مگر تصوراتی دنیا کو مسحور کر لیتی ہوں۔افسانہ ریسرچ پیپر نہیں ہوتا۔نہ اخباری رپورٹ ہوتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کو علامتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔کچھ باتیں ان کہی چھوڑ دی جاتی ہیں۔جب قارئین اپنی ذہانت سے ان باتوں کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔تو کہانی یا افسانہ ان کے دل کو چھو لیتا ہے۔

پچھلی تین قسطوں میں جناب ڈاکٹر رشید امجد کی ''عاشقی صبر طلب'' نے مجھے ہلا کے رکھ دیا ہے۔کیا عمدہ تحریر ہے۔اور کیا ''تلخ حقائق ہیں جنہیں وہ اتنی جادوئی سے بیان کر رہے ہیں۔ہمیں ایسی تحریروں کی آج کل بہت ضرورت ہے۔وہ سلامت رہیں۔اور ایسی بولڈ تحریر شائع کرنے پر ماہنامہ تخلیق دلی مبارک باد کا مستحق ہے۔جناب علی سفیان آفاقی کا بھارت کا سفر نامہ بہت چشم کشا ہے۔ان کی تحریر میں سادگی اور ہر کاری ہے۔جی چاہتا ہے قسط ختم نہ ہو.....تمہیں یاد ہو.....کاش یہ تحریر ادھوری رہ جاتی۔

بہتا دریا..... بابا عرفان الحق ایسی تحریر ہے جو روشنائی سے نہیں بلکہ روشنی سے لکھی گئی ہے۔بابا عرفان الحق سے ملنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے۔.....وہ بندے کو سامنے بٹھا کر گم کر دیتے ہیں۔ان کو کون سمجھ سکے گا۔یہ اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ہیں۔اور اللہ کے بندوں کی راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ابدال بیلا کے پاس آگہی کی بوچھاڑ ہے۔اور الفاظ کی پھوہار ہے۔وہ جو بھی بات لکھتے ہیں سجا سنوار کر لکھتے ہیں۔کوئی چھوٹا سا بابا ان کے اندر بھی کہیں بیٹھا ہے۔پر کیا کریں کہ سفر کے دوران وہ اس بابے کو گھر چھوڑ جاتے ہیں۔اور ابدال بیلا کو گوپیوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔جزئیات نگاری ان کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

اس بار رسالے میں ہر چیز ایسی ہے، اس کی تعریف کی جائے۔''فرنٹ سیٹ کا سیاح'' ''بھول جانا'' ''میرے مرشد اشفاق احمد'' اور تمام افسانے.....لیکن میرا خیال ہے۔اب میں تبصرہ نگاری ختم کر دوں۔میرا خط بہت طویل ہو گیا۔ورنہ ہر تحریر پر لکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔

اچھا بھئی میں خود ہی فیصلہ کرتی ہوں۔میرا خط زیادہ جگہ لے لے تو پھر میرا افسانہ نہ شائع کرنا۔

بشریٰ رحمٰن (لاہور)

.....

﴿6﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

جون 2014ء کا گوناگوں خصوصیات کا حامل ''تخلیق'' نظر نواز ہوا۔ چند سطور میں اپنے تاثرات رقم کر رہا ہوں۔

''پہلی بات'' میں آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''ادب کے سنجیدہ جلسوں میں اب موج میلے کے عناصر شامل ہو گئے ہیں اور قومی سطح پر اردو کے بجائے انگریزی کو مسلّط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔'' آپ نے چار کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم اہل قلم میں ''حساب دوستاں در دل'' کے انداز میں تقسیم کرنے کا شکوہ بھی کیا اور منظور نظر لوگوں کو ان میلوں ٹھیلوں میں مدعو کرنے کا گلہ بھی۔ ساری باتیں درست، مگر ارباب حل وعقد کی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ بقول مومن خان مومنؔ ۔

کون سنتا ہے فغانِ درویش قہرِ درویش، بہ جانِ درویش

پس آپ لکھتے رہیے، انہیں سننا نہیں۔ غلام عباس پر ڈاکٹر انور سدید کا مضمون دلچسپ ہے۔ مضمون میں ایک جگہ انور سدید رقم طراز ہیں ''1929ء میں غلام عباس کا افسانہ ''محبت کا درخت'' چھپا تو حکیم یوسف حسن نے انہیں 20 روپے پیش کیے۔ اس معاوضے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ 20 روپے میں دو تولے سونا خریدا جا سکتا تھا۔'' اس اعتبار سے گویا غلام عباس صاحب کو (آج کی شرح کے مطابق) اپنے افسانے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہوگا لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ معاوضے یا سونے کی قیمت میں کہیں چوک ہوئی ہے۔ ''ادب اور معرکہ خیر و شر'' (مسلم شمیم) ایک وقیع تحریر ہے۔ اردو دنیا کی ایک صاحب طرز شاعرہ بسمل صابری پر بشریٰ رحمٰن صاحبہ نے مختصر لیکن جامع مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ انہوں نے درست لکھا ہے کہ ''بسمل صابری صاحبہ ایک خوش انداز اور خوش گلو شاعرہ ہیں۔'' اس میں خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش اطوار اور خوش افکار کا اضافہ کر لیجیے۔ مضمون میں اشعار کے حوالے برجستہ اور برمحل ہیں۔ سلیم آغا قزلباش صاحب کا انشائیہ ''بھول جانا'' لطف دے گیا۔ نیر رانی شفقؔ کا ''راز داں کیسے کیسے'' بھی اچھا ہے۔ ''بھارت سے پاکستان'' (علی سفیان آفاقی) حسب سابق متاثر کن ہے۔ آفاقی صاحب کا تحریر کردہ عزیز میرٹھی (مرحوم) کا خاکہ آفاقی صاحب کے قلم کا کمال ہے۔ انہوں نے مرحوم پر اعتراض کیا ہے کہ ''عزیز میرٹھی نے ان (منور ایچ قاسم) کا جو وحشیانہ اور عقل سے عاری انسان کا نقشہ کھینچا ہے وہ اس کے مستحق نہ تھے۔'' میری ناچیز رائے میں آفاقی صاحب نے عزیز میرٹھی (مرحوم) کا جو نقشہ کھینچا ہے شاید وہ بھی اس کے مستحق نہ تھے۔ بہر حال میں تو آفاقی صاحب کا نصف صدی پرانا قاری ہوں۔ عزیز میرٹھی (مرحوم) کی آخری تحریر ''تمہیں یاد ہو...'' ان کے گزشتہ مضامین کی طرح یادگار ہے۔ افسانے سارے ہی اچھے ہیں۔ ''ان کہی'' (مشتاق اعظمی) اور ''شام کا تارا'' (اظہر جاوید/ حنیف باوا) نے خاص طور پر متاثر کیا۔ شعری تخلیقات کا انتخاب بھی خوب ہے۔ سید مشکور حسین یادؔ، کنول فیروز، اکرام تبسم اور گلفام نقوی کے چند اشعار خاص طور پر بہت عمدہ تھے۔

''انجمن خیال'' میں ڈاکٹر انور سدید کا خط پڑھ کر دل پسیج گیا۔ ان جیسا بلند پایہ ادیب، شاعر، نقاد، محقق اور صحافی ''من آنم کہ من دانم'' لکھے تو ہم جیسے چُھٹ بھیّے کس شمار میں ہیں۔ ''تخلیق'' کے گزشتہ شمارے میں شائع شدہ میرے مضمون ''بھارتی پولیس کی غالبؔ شناسی'' آپ کے سات صاحب ذوق قارئین (محترم سلطان رشک، پروفیسر قیصر نجفی، جناب سکندر حیات میکن، جناب نجیب عمر، محترمہ سیمیں کرن،

جناب قمر علوی اور محترم ایم ڈی ملک) نے پسند کیا اور اسے توصیفی کلمات سے نوازا جس کے لیے میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ جاوید احسن صاحب نے میرے مطبوعہ خط کی ستائش کی ان کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ورنہ، وہی بات، من آنم کہ من دانم!

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی) .....

﴿7﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

بحمداللہ! تخلیق اس مقام و مرتبہ پر پہنچ گیا ہے کہ اب اس کے حوالے سے بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''عطر آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔'' آپ کی محنت رنگ لائی ہے اور یار جانی کے لمس سے جو پیدا ہوتی تھی، آج ''تخلیق'' کے اوراق سے وہی خوشبو پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے غلام عباس کے فن و شخصیت پر اپنے مضمون ''افسانہ نگار غلام عباس سے شناسائی'' میں ضرورتاً خامہ فرسائی کی ہے۔ دراصل اس مضمون کے محرک سید قاسم محمود مدیر رسالہ ''شاہکار'' کے درج ذیل دو جملے ہیں جن کا ڈاکٹر صاحب نے مضمون کے آغاز میں حوالہ دیا ہے۔

1۔ ''وہ اردو کے واحد ایسے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے خود کو کسی ادبی تحریک، رویے اور گروہ سے وابستہ نہیں کیا۔''

2۔ ''غالباً یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی تالیف ''اردو ادب کی تحریکیں'' (انجمن ترقی اردو) میں ان کا نام اشارۃً بھی شامل نہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ایک تو بطریق احسن غلام عباس کے بارے میں اپنے حوالے سے غلط فہمی کو دور کیا ہے دوسرے ان کی شخصیت کے ایسے گوشے سامنے لائے ہیں، جن سے بیشتر لوگ آگاہ نہیں تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے غلام عباس کی افسانہ نگاری کا فنی تجزیہ پیش کر کے ایک اہم ادبی فریضہ ادا کیا ہے۔ ان کی فنی تجزیہ نگاری سے غلام عباس کے فن کی تفہیم میں بہت سے اشکال دور ہو جائیں گے۔ ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں'' عطیہ سید کا ایک علامتی افسانہ ہے لیکن کہانی سے عاری نہیں۔ افسانے کا ہیرو کا مردوں کے اس طبقے سے تعلق ہے۔ جن کے عالم شباب میں بھی عورت کے لئے جذبات میں قیامت خیزی نہیں ہوتی۔ ان کے لئے عورت کا قرب بے کیف اور وصل بے مزا ہوتا ہے۔ عطیہ سید کی کہانی میں واقعات کا ارتباط، ارتقا اور انجام غرض تمام عناصر ترکیبی فطری ہیں، البتہ عنوان کہانی سے لگا نہیں کھاتا۔ سیکولرزم کے ممکن ہے کچھ منفی پہلو بھی ہوں۔ لیکن یہ طے ہے کہ یہ مکتب فکر بقائے انسانیت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ ''جیو اور جینے دو'' اس فلسفۂ حیات کا اساسی اصول ہے۔ مذہب و مسلک کے نام پر شاید انسانیت کا سب سے زیادہ خون بہایا گیا ہے۔ دیپک کنول نے ''شنکر پورہ کا بھگوان'' کے عنوان سے اسی مانوس موضوع پر کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ افسانہ نگار کو کہانی کے اختتام میں ماورائیت کی آمیزش کی کیونکر ضرورت پیش آئی۔

نجیب عمر کا افسانہ ''ایک اور زخم'' سر بسر ایک گھریلو کہانی ہے۔ یہ ایک سادہ بیانیہ ہے جسے نجیب عمر نے کسی لفظی بازیگری یا ڈرامائی جذباتیت کے بغیر سپرد قلم کیا ہے۔ افسانہ خانگی و خاندانی تلخ و شیریں واقعات کا آمیزہ ہے، اور دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کے اردو تراجم کی اشاعت کا سلسلہ ''تخلیق'' کے ادبی حسن کو فزوں سے فزوں تر کر رہا ہے۔ پنجابی بالخصوص اظہر جاوید کی پنجابی کا ایک اپنا مزاج ہے۔ جسے حنیف باوا نے ترجمے میں برقرار رکھ کر یقیناً بحد کمال ترجمہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے اظہر جاوید کی روح حنیف باوا کے شریر میں حلول کر گئی ہے..... رانجھا رانجھا کر دے میں تے آپے رانجھا ہوئی۔

علی سفیان آفاقی کو دیکھ، پڑھ اور سن کر یہی احساس ہوتا ہے عمر میں ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں آفاقی صاحب ایک وضع دار انسان ہیں اور لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں۔انہوں نے عزیز میرٹھی کے ایک فلم ساز منور ایچ قاسم کے کردار کے بعض پہلوؤں پر اظہار رائے کو محل نظر ٹھہرایا ہے۔لیکن میرٹھی صاحب کے فن و شخصیت کے مثبت پہلوؤں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ڈاکٹر ابدال بیلا کے قلم سے نکلے ہوئے روشن الفاظ نے یوں تو کئی بار ہمارے دل و دماغ میں اجالے بکھیرے ہیں لیکن بابا عرفان الحق کے خاکے نے روح کو منور کر دیا ہے۔ہم ابدال بیلا کو ابدال قلمکار سمجھتے ہیں۔ابھی ہم ان کے درج ذیل رشحات قلم کی معنیاتی پرتیں کھولنے نہیں پائے تھے کہ انہوں نے بابا عرفان الحق کی عرفیات کی پراسرار دنیا میں لا کھڑا کیا۔

اجنبی سوالی کے چہرے پر اطمینان کا ایک ریلا آیا، پھر شک یک دراڑیں پڑ گئیں۔

بس اس احساس ذمہ داری نے مجھے وقت سے پہلے وقت کی ذمہ داری دے دی۔

انہوں نے اندر کی کھڑکی کھولی نہ باہر سے دستک دی۔

بیلا جی! آپ کے کہے کو اور کوئی مانے یا نہ مانے، ہم جیسے مداحوں کے لئے آپ کا قول فتوے کی حیثیت رکھتا ہے۔خط خاصا طویل ہو گیا ہے۔معذرت کہ بقیہ مشمولات پر اظہار نہیں کر پائے۔گزشتہ خط میں کچھ جملے کمپوزنگ کا شکار ہو کر آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔خیر یہ پارٹ آف دی گیم ہے۔عزیزم سونان! براہ کرم ''اظہر جاوید نمبر'' کا ایک شمارہ مجھے وی پی کر دیجیے۔شکریہ! امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ ہماری بہو اور بچوں کو ڈھیروں دعائیں۔ (''اظہر جاوید نمبر'' کی صرف ماسٹر کاپی ریکارڈ میں موجود ہے۔معذرت! (ادارہ 'تخلیق')

قیصر نجفی (کراچی)

.....

﴿8﴾ برادرِ عزیز سونان اظہر جاوید صاحب!

اردو افسانے کی تاریخ میں غلام عباس ایک بڑا نام ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مضمون ''افسانہ نگار غلام عباس'' میں ان کے مختصر سوانحی حالات بھی قلم بند کیے ہیں اور ان کے فنِ افسانہ نگاری کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ایک عام قاری کو بھی غلام عباس (مرحوم) کے ادبی مقام کے بارے میں اندازہ ہو جاتا ہے۔اس نوع کے مضامین کا شائع ہونا بہت ضروری ہے تا کہ ہماری نوجوان نسل، مشاہیرِ ادب کے علمی و ادبی کارناموں سے آشنا ہو سکے۔تخلیق میں شامل سبھی خاکے بہت عمدہ ہیں اور مصنفین کے عمیق مشاہدے اور خوبصورت پیرایۂ اظہار کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔''یادنگاری'' کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کی تحریر ان کے جرأت مندانہ رویے کا ثبوت ہے۔انھوں نے اپنے دل کی بات کو بغیر کسی لگی لپٹی کے زبان کر دیا ہے۔بہ الفاظِ دیگر اصل حقائق کو کسی پس و پیش کے بغیر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔اس تحریر کو شائع کرنے پر ''ماہنامہ تخلیق'' کی جرات قابل دید ہے۔علی سفیان آفاقی کی آپ بیتی ''بھارت سے پاکستان تک'' کو پڑھتے ہوئے ہمیں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے اور اس دور کو دوبارہ سانس لیتے ہوئے محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے۔اسی طرح ''تخلیق'' میں بالاقساط شائع ہونے والا ڈاکٹر ابدال بیلا کا سفرنامہ ''سورج کے رخ پر'' قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔یہ سفرنامہ دلچسپ معلومات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار کے دلنشیں اسلوبِ نگارش کے باعث قاری کو ذہنی جہت بھی فراہم کرتا ہے۔''طنز و مزاح'' کے ضمن میں ڈاکٹر معین قریشی اور اعتبار ساجد نے حسبِ روایت محفل لوٹ لی ہے۔ڈاکٹر معین چشتی طنز و مزاح کے سپیشلسٹ بن چکے

ہیں۔موضوعات کی بوقلمونی اوراس پران کا اندازِ بیاں کیا کہنے!''جائزے'' کے عنوان کے تحت بانو قدسیہ،پروفیسر جمیل آذر اور سکندر حیات میکن کی تحریریں توجہ طلب ہیں۔تبصرۂ کتب کسی بھی ادبی مجلّے کا ایک اہم انگ ہوتا ہے۔تازہ کتب کا تعارف ایک عام قاری کو رفتارِ ادب سے بھی مطلع کرتا ہے۔''انجمنِ خیال'' احباب کی ایک ایسی محفل قرار دی جاسکتی ہے،جس میں مختلف الخیال شاعر وادیب گزشتہ شمارے میں شائع شدہ تحریروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ان کی آرا اور تاثرات پڑھ کر قارئین اور تخلیق کاروں کو بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔تخلیق کے تازہ شمارے کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

.....

﴿9﴾ برادرمحترم سونان اظہر صاحب!

'تخلیق' نظر نواز ہوا۔''پہلی بات'' کی خوبصورتی اور اثر پذیری سے آپ کی پرچے کے ساتھ محبت،ادب کے ساتھ یگانگت اور اظہر جاوید کے زندگی بھر کے اثاثے کو جاری رکھنے کا عزم اچھا لگا۔حمد ونعت میں نورین طلعت عروبہ کی حمد سے آغاز ہوا۔اُن کے والد گرامی انوار فیروز یاد آئے اللہ اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔منظومات اور غزلیات انتہائی پُرمغز،وقیع اور جامع،محترم مشکور یاد،محترم حسن عسکری کاظمی،ڈاکٹر کنول فیروز،برادرم گلزار بخاری،اکرام تبسم،نثار ترابی اور ابصار عبدالعلی کی تخلیقات نے متاثر کیا۔افسانے انشائیے،خاکے،یاد نگاری سب کچھ تخلیق کے وقار،اعتبار اور معیار کا باعث ہے۔

پنجاب رنگ میں بشریٰ رحمٰن،منزہ شاہد اور احسان رانا کی تخلیقات حسبِ روایت تصوّف میں رچی بسی اور اعلیٰ فکری توجیہات کی حامل ہیں۔ہمارے معین قریشی صاحب ہمیشہ اچھی اور صاف ستھری طنز لکھتے ہیں۔پروفیسر جمیل آذر کا جائزہ اور ظفر علی راجہ صاحب کا خطوط میں تذکرہ اچھا لگا۔تخلیق اپنی تخلیقی تحریک اور تخلیقی ورثے کو سمیٹے آگے بڑھ رہا ہے۔یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

کرامت بخاری (لاہور)

.....

﴿10﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

جون 2014ء کا 'تخلیق' موصول ہوا۔'عالی رنگ' کی اشاعت کا شکریہ۔آپ کے حرف ساز نے میرے مختصر خط کے آخری نثری جملے کو شعری ہیئت دے دی ہے۔شاید یہ میرا وہم ہے کہ پڑھنے والوں کو اس پر خارج از بحر شعر کا گمان ہوا ہوگا۔

محترم امین راحت چغتائی صاحب نے جس محبت سے میرا ذکر کیا ہے اس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔اگرچہ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوئی لیکن انہیں رسائل میں پڑھتے ہوئے میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔بڑی بات ہے کہ وہ آج بھی تازہ دم دکھائی دیتے ہیں۔خدا انہیں تادیر سلامت رکھے۔ڈاکٹر انور سدید میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ان سے میری کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔پہلی بار شاید جناب ذوالفقار احمد تابش کے دفتر میں،پھر محترمہ کشور ناہید کی ایک مجلس میں،ایک تفصیلی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کے دولت کدے پر ہوئی تھی جس میں جناب غلام الثقلین نقوی بھی موجود تھے،اُن سے میری آخری ملاقات پرانی دلّی کے ایک ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں اس نشست میں ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر وحید قریشی،اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسی شخصیتیں بھی شریکِ گفتگو تھیں۔'تخلیق' میں اپنے کرم فرماؤں کے نام دیکھ کر آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔

'پہلی بات' میں آپ نے ہمیشہ کی طرح اہم مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے ضروری اقدامات کی طرف اربابِ بست وکشاد کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ڈاکٹر کیول دھیر کے ادارے کی جانب سے ساحر لدھیانوی انعام کے لئے انتظار حسین، بانو قدسیہ، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، اور عبداللہ حسین کے انتخاب سے ان تمام قد آور ادیبوں کی پذیرائی ہوئی ہے۔اور 2014ء کے ''تخلیق ایوارڈ'' کے لئے محترمہ بانو قدسیہ کا انتخاب ڈاکٹر انور سدید اور شفیع عقیل مرحوم کے اسمائے گرامی سے شروع ہونے والے سلسلے کو مستحکم انداز میں آگے بڑھائے گا۔

ڈاکٹر انور سدید نے غلام عباس کے درونِ ذات کے نہاں خانوں سے شناسائی کرائی ہے جس کی طرف کم توجہ گئی ہے۔اگرچہ ان کے ذاتی مشاہدات پر مبنی افسانہ 'آنندی' غلام عباس کی واضح پہچان بن چکا ہے لیکن ان کی مکمل شناخت کی تشکیل میں شہزاد منظر کا رول نہایت اہم رہا ہے اور جس کی وضاحت ڈاکٹر انور سدید نے بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔وہ سچے ادیب تھے، ان پر کسی ادبی تحریک یا مسلک کا سایا نہیں تھا۔انہوں نے سب کچھ زندگی سے کشید کیا تھا۔انگریزی زبان کے ایک بڑے ناول نگار انتھونی برجیس (Anthony Burgess) نے، اگرچہ یہ بات ناول کے حوالے سے کی ہے مگر افسانوں پر بھی صادق آتی ہے، اپنے ایک معرکتہ الارا مضمون میں لکھا ہے کہ کمتر درجے کا ناول نگار پلاٹ کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہتا ہے جبکہ اعلیٰ درجے کا ناول نگار پیچ در پیچ انسانی شخصیت کی کشمکش پر مبنی خاص خاص تجربوں کے ہنرمندانہ انتخاب سے سروکار رکھتا ہے (مکمل مضمون کے لئے دیکھیے: The Treasury of the Encyclopedia Britannica)۔غلام عباس اس نکتے سے بخوبی واقف تھے۔

میں مسلم شمیم صاحب کے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آیا ہوں۔'ادب اور معرکہء خیر وشر' میں انہوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ ادب نے ہمیشہ خیر پر زور دیا ہے۔اس ضمن میں عرض ہے کہ اطالوی شاعر دانتے (Dante Alighieri) کی ''طربیۂ الٰہیہ'' (The Divine Comedy) میں، جسے عالمی ادب کا شاہکار قرار دیا گیا ہے، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نعوذ باللہ جہنم میں بدترین، ذلت آمیز سزائیں پاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ کس کا خیر ہے اور کس کا شر؟ مضمون میں ایسے معاملوں کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔(بحوالہ دانتے۔The Divine Comedy, Hell: Canto XXVIII)۔

ایک اور بات۔مسلم شمیم صاحب نے لکھا ہے کہ رامائن کے خالق کالی داس ہیں۔یہاں اُن سے سہو ہوا ہے۔رامائن کے اصل مصنف مہارشی والمیکی ہیں جو ایک ہزار سال قبل مسیح کے آس پاس پیدا ہوئے تھے اور اس مقدس کتاب کی زبان سنسکرت تھی۔البتہ سولہویں صدی عیسوی میں تلسی داس (1532-1623ء) نے اسے اَوَدھی زبان میں نیا روپ دیا۔چونکہ تلسی داس کی تصنیف کردہ یہ رامائن ایک زندہ مقامی زبان میں ہے اس لئے اس تخلیق کو جو رام چَرِت مانس (Ramcharitmanas) کے نام سے بھی جانی جاتی ہے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔

لکھنے کو بہت کچھ ہے لیکن میں اور آگے لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔البتہ مجھے ایک نام نے متوجہ کیا تھا اور میں محمد طارق علی کی کہانی 'لیڈی سیکرٹری' ایک نشست میں پڑھ گیا۔بیانیے نے مجھے آخر تک مسحور رکھا۔ابھی حال میں اسلام آباد سے ایک رسالہ آیا ''الاقرباء'' جس میں اسی نام کے ایک کرم فرمانے میرے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے (سہ ماہی الاقرباء، صدر نشین: سید منصور عاقل، سالنامہ 2014ء 'کینیڈا میں اردو' کے عنوان سے محمد طارق علی کا ترجمہ، ص 55 تا ص 64)۔اگر 'لیڈی سیکرٹری' کے خالق اور میرے مضمون کے مترجم دونوں ایک ہی شخص ہیں تو میں 'تخلیق' کی وساطت سے محمد طارق علی صاحب کا تہِ دل سے شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔

چند روز قبل آپ کسی اور کو فون کر رہے تھے۔ غلطی سے میرا نمبر لگ گیا۔ بہرنوع، اسی بہانے آپ سے کچھ باتیں ہو گئیں۔
اظہر جاوید مرحوم عالمِ بالا میں اس بات سے خوش ہونگے کہ آپ نے اُن کے سلسلہء جنوں میں کسی طور کمی نہیں آنے دی۔
عید مبارک۔ امید کہ آپ جملہ متعلقین سمیت بخیر ہونگے۔ خیر اندیش

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

.....

﴿11﴾ سونان اظہر جاوید! سلامت تا قیامت!

مجھے پروردگار کے ننانوے ناموں میں سے جو نام بچپن سے سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے ''لطیف'' اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے سب سے زیادہ مظاہر بھی اِسی حوالے سے نظر آتے ہیں۔ اب اظہر جاوید کا ویلنٹائن کے دن رخصت ہونا اور وہاں جا کر پرانی پرانی حوروں یا روحوں کو نئی کڑیئے کہہ کر مخاطب ہونا، پھر ایک تسلی بھری نظر ''تخلیق'' کے نئے دفتر پر ڈالنا اور آپ کو دیکھ کر اطمینان بھری سانس لینا، انور سدید سے چھیڑ خانیاں کرنا اور بہت دوسرے لوگوں کے علاوہ عزیز میرٹھی (مرحوم) سے گپ شپ لڑانا سب کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ پھر جناب محمود الحسن جعفری صاحب نے جو کچھ کہہ دیا اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک سرگوشی وہ بہت دبے لفظوں میں کرتے ہیں کہ میں نے دنیا چھوڑ کر کوئی نیا کام تو نہیں کیا۔ میرا تذکرہ کرنا ہے، مجھے خوش دیکھنا ہے تو میرے ''تخلیق'' کی سلامتی کا دھیان رکھنا، وہ تو تمہارے درمیان ہے اور ہاں۔ سب سے پہلے تو ''تخلیق'' کے مستقل اور نئے لکھنے والوں کو سلام۔ جو لوگ میری انتہائی معمولی نگارشات کو سراہتے ہیں ان کے لیے بے انتہا دعائیں۔ فوری طور پر جواب دینے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ستائش باہمی ہو رہی ہو۔ ایسے بے شمار افسانے یاد آ رہے ہیں جو بہت عمدہ مواد کے حامل تھے۔ پھر نئے نئے موضوعات اور اسلوب اور زندگی کی کروٹیں اور رشتوں کے بدلتے روپ بہروپ سب کچھ ہی تو نظر آ جاتا ہے۔ تاہم میری دعا ہے کہ کوئی بھی (خاص طور پر، خاتون افسانہ نگار) ایسا افسانہ نہ لکھے جس میں ایک نیک اور سچی لڑکی کو حرام موت مرتے ہوئے دکھایا جائے (میں خود ایسی غلطی کر چکی ہوں) جس طرح ہمارا معاشرہ بنا ہُوا ہے، اس میں معصوم سوچوں کی تو ویسے ہی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی۔ کہیں کوئی یہ تاثر قبول کر لے کہ وفا اور محبت کرنے والوں کو خودکشی کر لینا چاہیے تو مشکل ہوگی۔ افسانہ نگار بشریٰ آپا کے علاوہ ایک اور بشریٰ اعجاز بھی ہیں جو کافی عرصے سے ''تخلیق'' میں نظر نہیں آئیں۔ میں ان سے ملی نہیں مگر مجھے وہ اس قدر پسند ہیں کہ کیا بتاؤں۔ صغریٰ صدف کا افسانہ اچھا لگا۔ انہیں سلام کہنا ہے۔ آپ شاید اتفاق نہ کریں لیکن ''تخلیق'' کے جتنے پرانے لکھنے والے ہیں جیسے انور سدید صاحب، ڈاکٹر زکریا صاحب، زمان صاحب، ڈاکٹر ابدال بیلا صاحب اور سلمیٰ اعوان صاحبہ ان سب میں کوئی نہ کوئی بات اظہر جاوید والی ہے۔ شاید یہی اس طویل رفاقت کا سبب ہو مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔

ویسے تو کوئی ادارہ بھی دوستوں ہی کے سہارے چلتا ہے (پھر ایسے ماحول اور حالات میں ادبی رسالہ نکالنا میں آپ کے حوصلے کو داد دیتی ہوں)۔ مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ ایک آدھ صفحہ (یعنی کل دو غزلیں) ایسے شعرا کا کلام پڑھنے کو ملے جو بہت نیا، بہت تازہ اور بہت چونکا دینے والا ہو اور لاہور میں ایسا کلام لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ بھلے وہ لوگ اب تک ''تخلیق'' میں شامل نہ ہوں لیکن انہیں شامل تو کیا جا سکتا ہے۔ بس یونہی ایک خیال آپ سے Share کیا ہے۔

انشا اللہ ایک دن جلد آنے والا ہے جب ''تخلیق'' کے ماہنامہ ہونے کا اعلان ہوگا پھر تحریریں بھی بڑھ جائیں گی اور ساتھی بھی

(شاید اشتہار بھی)۔اس سے پہلے کہ خط ختم کروں ڈاکٹر معین قریشی کو داد دینا لازمی ہے۔ان کا مضمون پڑھ کر بہت اچھا لگا۔''بھارتی پولیس کی غالب شناسی'' کچھ نیا پڑھنے کو ملا اور اسی سلسلے کا دوسرا مضمون ''غالب کون ہے؟'' بھی اچھا ہے۔پنجاب رنگ میں منزہ شاہد کی ''فقیر دی موج'' پسند آئی۔ویسے جون کے شمارے میں رومانہ رومی کا خط پڑھ کر ایک خیال ضرور آیا کہ اب جبکہ میڈیا یعنی الیکٹرانک میڈیا کی پہنچ ہر شعبۂ زندگی کی باریک سے باریک تفصیل کو روشنی میں لے آئی ہے تو ادبی دنیا کے سچ ابھی تک کیوں پوشیدہ ہیں؟ کیا اسے روکھی پھیکی دنیا سمجھ کر نظر انداز کیا گیا، یا یہ وہم ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں بھلا کہاں ملیں گے۔سکینڈل، لطیفے، ادبی میرائیں اور دیگر تمام لوازمات۔آج کل کتنے شوز ایسے ہیں جن کو ''بھانڈ'' کا روپ دھارنے والے کامیاب بنا رہے ہیں مگر کوئی ایسا چینل اور شو نہیں جو ادبی ہو اور رپٹنگ والا ہو۔ادب میں تو سب کچھ ہے سیاست بھی مذہب بھی، حالاتِ حاضرہ بھی، سماج بھی اور ڈھیر ساری گپ شپ بھی۔مگر ابھی سب کچھ ملفوف اور نظروں سے اوجھل ہے۔ٹی وی والوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ایک ادیب 'اعزازی ادیب' بننے تک اور ایک شاعر مشاعروں میں مدعو کیے جانے تک کن مراحل سے گزرتا ہے یہ سب باتیں ہمارے معاشرے کی خوب عکاسی کرتی ہیں جبکہ دوسرے معاشروں میں ادیب کا کیا مقام ہے؟ بہرحال خیر جانے دیجئے۔احباب و متعلقین کو آداب سب کو بہت بہت عید مبارک۔میری درخواست ہے کہ اظہر جاوید کی ایک یادگار تصویر کسی بھی آئندہ شائع ہونے والے شمارے میں ضرور شامل کریں۔(مخلص)

آصفہ نشاط (کیلی فورنیا۔امریکا) .....

﴿12﴾ محترم ومکرم سونان اظہر جاوید صاحب

سلام مسنون۔تخلیق کا تازہ شمارہ (جون 2014) دیکھا اور پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔''تخلیق'' کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔جناب اظہر جاوید کے بعد سونان اظہر جاوید کی نگرانی میں بھی یہ اپنا ادبی سفر جاری وساری رکھے۔سونان اظہر اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ ان کو ایسے اہلِ قلم میسر آئے ہیں، جن کی بدولت ان کا یہ تخلیقی عمل پوری آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے۔پہلی بات میں اب کی بار آپ نے بڑے اہم اور سنجیدہ زاویے پر روشنی ڈالی ہے۔حقیقت تو یہی ہے کہ ملکِ عزیز میں اردو بدلی زبان بن کر رہ گئی ہے۔کچھ با اختیار قوتیں آج بھی اپنی دھونس جمائے ہوئے ہیں۔افسر شاہی تو آج بالکل اردو سے نالاں ہو چکا ہے۔ہماری قوم کو زبان کی یہ دورنگی لے کر ڈوب گئی ہے۔آج ملکِ عزیز میں وہ مخلص اردو داں بھی نظر نہیں آتے جو کبھی اردو کی شناخت کے لیے مر مٹنے کو تیار تھے۔جن کی کاوشوں سے بہرحال اردو کو ایک وقار ملا تھا۔مقامِ شکر ہے کہ کبھی کبھی ادبی رسائل وجرائد کے اداریوں میں اردو کے تشخص کی بات ہو جاتی ہے۔دوسری طرف یہ پورے تواتر سے شائع ہونے والی ادبی رسائل وجرائد بھی اردو کی خدمت میں پورے خلوص کے ساتھ کوشاں ہیں۔ستم یہ ہے کہ آج ان رسائل کا قاری خال خال نظر آتا ہے۔رہی سہی کمی مہنگائی کے جن نے پوری کر دی ہے۔

تخلیق ایوارڈ 2014ء کے ضمن میں محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ کا نام بھی اہم پیش رفت ہے۔اسی طرح ساحر لدھیانوی ایوارڈ کے لیے بھی آپ نے ڈاکٹر کیول صاحب کی بھرپور مدد کی کیونکہ ساحر ایوارڈ کے ساتھ جناب اظہر جاوید کی ایک خصوصی نسبت بھی ہے۔اس طرح ساحر ایوارڈ کے لیے جو چناؤ ہوا ہے وہ بھی شفافیت پر مبنی ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا مضمون غلام عباس کی افسانوی کائنات سے شناسائی کرواتا ہے۔انھوں نے غلام عباس کی فکری وفنی جہتوں کی طرف بھی قارئین کی توجہ مرکوز کی ہے۔انور سدید کا یہ مضمون غلام عباس کی شخصی اور

افسانوی تفہیم میں خصوصیت کا حامل ہے۔انور سدید کے بقول: ''غلام عباس کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی ایک چھوٹی سی قاش کو موضوع بنانے کی بجائے زندگی کے وسیع تر اجتماعی احساس کو افسانے میں سمونے کی کاوش کرتے ہیں۔''

مسلم شمیم نے ادب میں خیر و شر کے معرکے کی کشمکش کو بڑے دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے۔یہ ایک تخلیقی نوعیت کا مضمون ہے جس سے اسلوب کی پختگی واضح طور پر نمایاں ہے۔عطیہ سید کا افسانہ ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں'' جذباتیت سے لبریز نظر آیا جس کے اختتامیے میں مصنفہ نے بڑے خوبصورت انداز میں جذبہ محبت کی تازگی کو مزید تر و تازہ کر دیا ہے۔نظموں میں ایوب خاور کی ''آخر کس دن''، وصل کے پھول کے لمس کے منتظر نظر آئے تو دوسری جانب عبیرہ احمد نے بڑی خوب صورت تراکیب کے ذریعے اپنی نظم ''زلیخا پاک داماں تھی'' میں ظہور عشق سے پہلے زلیخا کی پاک دامنی کو منفرد انداز سے پیش کیا ہے۔حنیف باوا کی مہارت واضح جھلکتی ہے۔اظہر جاوید افسانے کی تخلیقی رمزوں سے بخوبی آگاہ تھے اور افسانوں میں انھوں نے ان صلاحیتوں کو استعمال بھی کیا ہے۔پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے اچھوتے انداز میں ''مکالماتی غزل'' میں کائنات کے حقائق کو بڑی سادگی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا استفہامی انداز بھی خوب ہے اور یہ شعر تو بہت ہی اچھا ہے۔

پیار کے کھیل میں میں اکیلا نہیں　　اپنا سب کچھ لٹا، کیا ہوا، کیا ہوا؟

یاسمین کی غزل کا مقطع بھی بہت عمدہ ہے:

ہم سہاروں کو ڈھونڈتے ہیں کنولؔ　　وقت جب مہرباں نہیں ہوتا

تخلیق نے ہمیشہ ادب کی مختلف جہتوں کو رسالے میں موضوع بنایا ہے۔انشائیے کے ضمن میں بھی تخلیق نے وسیع اور ادبی ظرف کا مظاہرہ کیا ہے۔''بھول جانا'' کے عنوان سے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے اس فطری امر کو شگفتگی سے پیش کیا ہے۔فطری طور پر سلیم آغا انشائیے کا مزاج رکھتے ہیں۔انھوں نے حاضر دماغی اور غیر دماغی کے جمالیاتی خط کو بھی پیش کیا ہے۔''راز داں کیسے کیسے'' نیر رانی شفق کا انشائیہ دل کی جاگیر میں مدفن مختلف رازوں کی اہمیت اور احساس کو اجاگر کرتا ہے۔آنکھوں اور دل کو رازداری میں خصوصی زاویے سے شناسا کروایا ہے۔علی سفیان آفاقی نے دل کے قلم سے اردو فلم کے شناوروں عزیز میرٹھی اور منور اینج۔قاسم کی فلمی دنیا سے متعلق معلومات پیش کی ہیں۔حیرت ہے کہ اس طرح کے تاثرات کو ''خاکے'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا کی انمول یادوں کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

''میرے مرشد اشفاق احمد'' جناب اظہر جاوید کا یہ مضمون ان کی دلی کیفیات اور جذباتی وابستگی کا ایک مرقع ہے جس میں ان کی عقیدت اور محبت پورے خلوص سے ٹپک رہی ہے۔کتب کے جائزے اور تبصرے خاصے کی چیز ہے۔بالخصوص ''تخلیق'' قارئین کو نئی کتب سے شناسا کروانے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ڈاکٹر معین قریشی حسبِ سابق اپنے نمکین اسلوب کے ذریعے چھائے ہوئے ہیں۔خطوط کی محفل بھی اب خوب جمنے لگی ہے۔تنقید و تنقیص کا سلسلہ دراز ہونا چاہیے لیکن ادبی دائرہ کار سے تجاوز معیوب ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کا حامی ناصر ہو اور آپ ''تخلیق'' کی تخلیق میں اسی طرح مخلص رہیں۔آمین۔

سکندر حیات میکن (سرگودھا)　　.....

﴿13﴾ محترم سونان اظہر!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔اس شمارے میں جاوید احسن کی حمد اور امین راحت چغتائی کی نعت اچھی لگیں۔انور سدید کا مضمون ''افسانہ نگار غلام عباس سے شناسائی'' اور مسلم شمیم کا مضمون ''ادب اور معرکہ خیر وشر'' خوبصورت تحریریں ہیں افسانے سبھی اچھے ہیں لیکن ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں'' عطیہ سید کا افسانہ دل کو چھو گیا۔نظم وغزل کا انتخاب آپ کے اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کرتا ہے۔تخلیق کی طرح انجمنِ خیال کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔

مظفر حسن منصور (جوہر آباد)

.....

﴿14﴾ مکری سونان اظہر جاوید صاحب!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ جون 2014ء اس وقت میرے ہاتھوں میں۔آپ نے اردو کو اس کا آئینی مقام دلانے کی جو بات کی ہے اور اس ضمن میں جس لیت ولعل سے کام لیا جا رہا ہے وہ ہم سب کا سانجھا دکھ ہے۔امین راحت چغتائی کی نعت کا یہ شعر دل میں گھر کر گیا ؎

درِ اقدس کا یہ بھی معجزہ ہے کہ دل کی بات کہہ دیتے ہیں آنسو

انور سدید صاحب کا بڑا کرم کے انہوں نے آنندی، اوورکوٹ، کتبہ، فینسی ہیر کٹنگ سیلون اور جوار بھاٹا کے خالق غلام عباس پر قلم اٹھایا۔ورنہ حقیقت ہے کہ اردو کے اس بڑے افسانہ نگار کو ان کا جائز مقام نہیں ملا۔انہیں جاننے والے بتاتے ہیں کہ وہ جتنا بڑا تخلیق کار تھا اتنا بڑا انسان بھی تھا۔ساری زندگی قلم کی مزدوری کرنے والے اس ادیب نے کبھی کسی صلہ کی تمنا نہیں کی۔عطیہ سید کا افسانہ ''محبت کبھی مرجھائی نہیں'' انسانی نفسیات بھی کیا معمہ ہے۔کبھی پُر جوش اور پُر زور محبت کو رد کر دیا جاتا ہے کہ اس میں توازن اور ٹھہراؤ کا فقدان ہے اور کبھی دھیمی دھیمی آنچ کے ساتھ لو دینے والی محبت کی بے قدری کی جاتی ہے کہ مطلوب برقِ تپاں، شعلہ اور بھڑکتا جذبہ ہوتا ہے۔ڈیبی، ڈینیئل میں بھی تلاش کرتی رہی۔اور سچی محبت کو پرکھ نہیں سکی۔دیپک کنول کا ''شنکر پورہ کا بھگوان'' کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا گیا افسانہ بین المذہب ہم آہنگی کا پیغام دیتا ہے لیکن سات لاکھ مسلمانوں کے قبرستان کو ہم کہاں لے جائیں۔آخر کشمیری حقِ رائے دہی تو مانگ رہے ہیں جو ان کا بنیادی حق ہے۔

مشتاق اعظمی کی ''ان کہی'' ایک دلچسپ افسانہ، معصوم سچترا ٹھکانہ ڈھونڈنے انیل بسواس کے پاس بھی آئی تھی لیکن پیٹ کی آگ اسے جرم کی راہ پر لے آئی۔انیل نہ اسے پہلے پہچان سکا اور نہ برسوں بعد افیم اسمگل کرتے۔جبکہ سچترا کا ساتھی انیل کو بھانپ گیا تھا۔محمد طارق علی کی ''لیڈی سیکرٹری'' ہمارے معاشرے میں اور ادب کی دنیا میں ایک ادیب کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے بہت خوبصورتی سے دکھایا اور لیڈی سیکرٹری میں بیوی تلاش کرنے والوں کا انجام بھی دکھا دیا۔حنیف باوا کے توسط سے اظہر جاوید کی خوب صورت تحریر ''شام کا تارا'' محبت کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔اس کے باسیوں کا اشارہ کھابہ بھی بڑا لطیف ہوتا ہے جسے نہ سمجھنے کا دُکھ ساری زندگی رہتا ہے ؎

گلدستۂ غزل میں بہ اشعار پسند آئے

اور زمانہ نکل گیا آگے ہم رہے عرضِ حال میں غلطاں

(مشکور حسین یاد)

بھول جانا تم مری ساری وفاؤں کو مگر　　یاد رکھنا تم فقط اپنے، ستم ڈھائے ہوئے

(شاہین زیدی)

وہ سخی ہے تو اس کی چوکھٹ پر　　دلبری کا سوال کر دیکھیں

(مسعود تنہاؔ)

ڈاکٹر ابدال بیلا کی طرزِ نگارش اور دنیا کے بڑے لوگوں، حقیقی معنوں میں بڑے لوگوں کی کتھا جو اپنا آپ کبھی ظاہر کرنا نہیں چاہتے لیکن انہونی ہو بھی جاتی ہے۔ میرے اور اظہر جاوید صاحب کے مرشد اشفاق احمد ہاں وہی آسانیاں بانٹنے والا بابا۔ اپنا ایک دیرینہ سوال لیے لوگوں کے پاس جاتے کہ ''انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے'' کہیں سے تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ پھر ایک بابے نے ایک جملے میں مسئلہ حل کر دیا۔ جواب تھا ''ہم خدا کو مانتے ہیں، خدا کی نہیں مانتے۔''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اگر غالبؔ کو صحافی ثابت کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ ان کا حُسنِ کرشمہ ساز جو نہ کرے کم ہے۔ وہ دیوانِ غالبؔ اس دلیل میں لا سکتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ ایک دلیل بھی خانہ پُری کی نہیں۔　　خلوص کیش

نجیب عمر (کراچی)

.....

﴿15﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ 'تخلیق' کا تازہ شمارہ جون 2014ء باصرہ نواز ہوا۔ 'تخلیق' کا آغاز ''پہلی بات'' سے ہوتا ہے جس میں آپ نے اُردو کے سلسلہ میں جو بات رجسٹر کروائی ہے وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ چار کروڑ سے زیادہ رقم کی بندر بانٹ پر مؤثر احتجاج آپ کے باخبر اور اہلِ حق ہونے کی دلیل ہے۔ مضامین میں انور سدید کا افسانہ نگار غلام عباس پر مضمون بھرپور تحریر ہے۔ انور سدید صاحب کی ہر تحریر بڑی معلوماتی اور دلکش پیرائے میں ہوتی ہے۔ افسانوں میں عطیہ سیّد کا ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں''، محمد طارق علی کا ''لیڈی سیکرٹری'' اور اظہر جاوید کا ''شام کا تارا'' اُردو افسانوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ بہت اچھا لگا۔ خاکے، یادنگاری، آپ بیتی، سفرنامہ، جائزے، تبصرے، انجمن خیال تک ایک دھنک ہے جو صرف ماہنامہ ''تخلیق'' کو میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توانائیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

ابراہیم عدیل (جھنگ)

.....

﴿16﴾ عزیزِ گرامی قدر جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

ماہنامہ تخلیق کا ماہِ جون 2014ء کا شمارہ جلو میں اپنی روائتی آب و تاب اور تخلیقی معیار لئے ملا۔ آپ جناب اظہر جاوید مرحوم کے 43 سال سے مشن کو لے کر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں جس کے لئے تحسین و مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس شمارے میں میرے نعتیہ شعری مجموعے فخرِ دو عالمؐ پر جناب آفتاب خان صاحب کے تبصرے کو شاملِ اشاعت کرنے پر آپ دونوں حضرات کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے آمین۔ ایک بات جو میری نظر میں تخلیق کو دوسرے

جرائد میں ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ آج کے نہایت اعلیٰ درجے کے تخلیق کاروں کے ہمراہ میرے ایسے دیرینہ معاونین کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مثلاً ماہِ دسمبر 2013ء کے شمارے میں میر احمد یہ سانیٹ (رب ذوالجلال) شائع ہونے پر مجھے 20 دسمبر 2013ء کے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں تخلیق کی اشاعت کی خبر اور تبصرہ دیکھنے کے لئے فون پر اطلاع دی۔

ایک زمانہ تھا جب متعدد جرائد سے مسلسل رابطہ رہتا تھا پھر کچھ عرصہ کے لئے روزمرہ کے نجی معاملات اور روزگار کے جھمیلوں میں الجھ کر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا جس کو رب العزت کے کرم اور عنایت سے شروع کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ ماہنامہ تخلیق کو دنیائے ادب میں ایک نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے اور اس کو سنوارنے اور بہتر سے بہتر بنانے کے لئے صفِ اول کے نامور شعراء اور ادباء شب و روز مخلصانہ کوششوں میں مصروف ہیں۔ تخلیق کی سب سے بڑی خوبی اس کی متنوع موضوعات ہیں جن کے ہر پہلو اور باب کو نہایت اعلیٰ مرتبے کی تخلیقات سے سجایا جاتا ہے۔ حصہ حمد و نعت کو ہی لے لیں نورین طلعت عروبہ کی اور جاوید احسن کی حمدِ باری تعالےٰ اور امین راحت چغتائی کی نعتیں متاثر کُن ہیں۔ نظم کے باب میں شاہین اور ابصار عبدالعلی قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ افسانوں میں جناب اظہر جاوید مرحوم کی پنجابی تحریر کا ترجمہ جو حنیف باوا نے اردو میں کیا ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ مشتاق اعظمی کا ''ان کہی'' اور محمد طارق علی کا ''لیڈی سیکرٹری'' بھی اچھے افسانے ہیں۔ غزلوں میں سید شکور حسین یاد کی غزل اور حسن عسکری کاظمی کی مکالماتی غزل دونوں بے مثال ہیں۔ اور آفتاب خان صاحب کے تبصرے اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

رشید آفریں (سیالکوٹ) .....

﴿17﴾ عزیز القدر سونان اظہر جاوید صاحب

جون 2014ء کا ''تخلیق'' مل گیا تھا جسے میں پڑھ بھی چکا ہوں تاثرات ارسال خدمت ہیں۔ آپ نے ہماری معاشرتی برائیوں کا ادبی معاشرے میں درآنا پہلی بات کا موضوع بنایا ہے یہ واقعتاً بری بات ہے اور قابل صد افسوس بھی صرف ادبی معاشرہ تا حال ان برائیوں سے پاک تھا لیکن اب وہ بھی پاکیزہ معاشرہ نہیں رہا۔ ہماری ادبی کانفرنسوں میں جو کچھ ہوتا ہے قومی دولت کو جس طرح نااہل لوگوں میں بانٹا جاتا ہے اور جس طرح سازشیں کی جاتی ہیں چوریاں کی جاتی ہیں یہ سب کچھ دیکھ کر سوائے افسوس صد افسوس۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ خدا کرے ہمارے اربابِ دست و کشاد اور سربانِ اقتدار اس خرابی کا نوٹس لیں۔ تخلیق کے اس شمارے میں گذشتہ شماروں سے بھی زیادہ حسن اور وقار نظر آیا ہے افسانے ہیں تو لاجواب شاعری ہے تو انتہا کی خوبصورت ایک بھی افسانہ اور کوئی بھی نظم یا غزل معارے گری ہوئی نظر نہیں آتی یوں لگتا ہے کہ سونان اظہر نے ہر چیز کو پڑھا ہے اور اپنے اہل علم و نظر دوستوں سے مشورہ کیا ہے پھر انہیں منتخب کیا ہے۔

میں امید رکھتا ہوں اور دعا بھی کرتا ہوں کہ اردو ادب کی خدمت کا جو جذبہ آپ کے دل میں موجود ہے اسی طرح برقرار رہے اور تخلیق اس وقت تمام ادبی پرچوں میں سب سے بہترین جا رہا ہے۔ مبارک باد قبول کریں۔

مشتاق احمد (لاہور)

◆◆◆

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ھونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ **ادبِ لطیف** لاہور چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم 0300-8479444	ماہنامہ **الحمرا** لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ **مسکراہٹ** لاہور چیف ایڈیٹر : طفیل اختر 0333-4261878
ماہنامہ **ادب دوست** لاہور مدیر اعلیٰ : خالد تاج 0300-8480057	ماہنامہ **سپوتنک** لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ **حکایت** لاہور مدیر : عارف محمود 0323-4329344
ماہنامہ **نیرنگ خیال** راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ **چہارسو** راولپنڈی مدیر مسؤل : گلزار جاوید 0300-5176062	ماہنامہ **صبحِ بہاراں** گوجرخان چیف ایڈیٹر: ذکاء اللہ شیخ 0333-7405332
سہ ماہی **مفاہیم** لاہور مدیر : یوسف چوہان 0301-6791402	سہ ماہی **نالۂ دل** بھیرہ مدیر : مرزا شبیر بھیروی 0333-4720573	سہ ماہی **بیلاگ** کراچی مدیر اعلیٰ : عزیز جبران انصاری 0300-9312919
ماہنامہ **روشنائی** کراچی مدیر : احمد زین الدین 0321-2011595	ماہنامہ **شاداب** لاہور مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر کنول فیروز 03014123707	ماہنامہ **کتاب** اسلام آباد مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر انعام الحق جاوید 0300-9500936
ماہنامہ **شاعر** بمبئی۔انڈیا مدیر : افتخار امام صدیقی 0091-9324515157	سہ ماہی **انتساب** انڈیا ایڈیٹر : سیفی سرونجی 0091-942564177	ماہنامہ **انشا** کلکتہ۔انڈیا مدیر : ف۔س۔اعجاز 0091-3322354616

◆◆◆